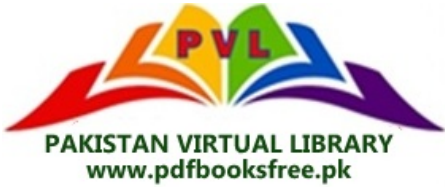


# روگ

[www.pdfbooksfree.pk](http://www.pdfbooksfree.pk)



فائزہ افتخار



آج ہی یہاں برقی قلمے سجائے گئے تھے۔  
سارا گھر جگر جگر کر رہا تھا۔

وہ رات کے اس پہر..... اس آخری پہر..... جب باقی سب تھک ہار کے جہاں جگہ ملی  
وہاں سوچکے تھے، اکیلی ٹیرس پہ کھڑی اپنے گھر کے چھوٹے سے لان میں جھانک رہی تھی۔  
آج ہی اسے مایوں بٹھایا گیا تھا۔ ان کے ہاں شادی سے ہفتہ بھر پہلے ہی مایوں بٹھا  
دینے کا رواج تھا۔ دن میں محفل میلاد تھی۔ تقریباً سب ہی عزیز واقارب موجود تھے۔  
شام کو جب اسے مایوں بٹھایا گیا تو کتنی رونق تھی یہاں۔ چھوٹا سالان بھرا پڑا تھا۔  
لڑکے والوں کے ہاں سے میلاد اور مایوں کی سادہ سی گھریلو تقریب میں شرکت کے لئے  
صرف چار خواتین آئی تھیں۔ لڑکے کی والدہ، چھوٹی بہن جو شادی شدہ تھی، ایک پھوپھی اور  
ایک خالہ، ان کے باقی رشتہ دار دوسرے شہروں میں رہتے تھے ان کی شمولیت بعد کے فنکشنز  
میں ہونا تھی۔

وہاں سے صرف چار عورتوں کے آنے کے باوجود رونق خوب لگی۔ اس کی بہنیں، اپنی  
نندوں، دیورانیوں اور جھانیوں سمیت موجود تھیں۔ خاندان کی چچیوں، ممانیوں، خالادوں  
کے ساتھ ساتھ درجن بھر کنواری اور آدھ درجن شادی شدہ کزنز بھی بال بچوں کے ساتھ موجود  
تھیں۔ خود اس کی دوستیاں بے حد محدود تھیں۔ امی نے تو کہا تھا کہ وہ اس موقع پر چھٹی  
دوستوں کو چاہے مدعو کر سکتی ہے لیکن وہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔

جان پہچان اور اچھی بات چیت تو کلاس کی سب ہی لڑکیوں سے تھی۔ مگر خاص دوستی  
بینش کے علاوہ کسی سے نہ ہو پائی تھی۔ اس میں بھی زیادہ ہاتھ بینش کا تھا۔ جب سے کالج  
چھوٹا تھا اس نے بہت سی کلاس فیلوز کے نمبرز موجود ہونے کے باوجود ان سے رابطہ کرنا

جیون ہوا اندھیرا

اماں بی.....

”سویلا! امی کی آواز نے اسے جھٹکا دیا۔

”اتنی گر خضد (ج سردی) میں ٹو یہاں کیوں کھڑی ہے اور وہ بھی اس وقت، سحری ہونے والی ہے اب تو۔ نہ کوئی سویر، نہ دریا میں، بھگی شال لے کر کھلے سڑک کھڑی ہے۔ کچھ عقل بھی ہے یا نہیں۔ سروسول کا تیل بھی لگا ہوا ہے سر میں۔ پتہ بھی ہے کہ رات کا تیل ہالوں میں لگا رہے تو جتنے زلہ ہو جاتا ہے۔ اب سروسول دھو سکتی تو اسے ڈھانپ کے توڑ کھٹکتی ہے۔“ اس نے گردن موز کے دیکھا۔ وہ سڑکی چادر بدلتے ہوئے ساتھ ساتھ اسے لپکھ دے رہی تھیں۔

”بھئی رہنے دیں بھئی۔ اسے کیا ہے؟“ وہ بے زاری سے بولی۔ شاید اسے اپنی تنہائی میں بے دخلت انہی نہیں لگتی تھی۔

”پتہ نہیں کس کے بدتر ہے بستر؟ بیٹہ کر کھا نا کھا رہے تھے۔ کل میں نے فنی کھور بچائی تھی کہ تیرے کمرے میں لوگوں کا آنا جانا لگا رہے گا اور یہ دیکھ سائن گرا دیا ہے کسی نے۔“ انہوں نے لپک جھپک دوسری گہرے رنگوں والی دھاری دار بیڈ شیٹ بچادی اور وہ بھگی گلابی اور سفید چادر گول مول کر کے بٹل میں دہالی۔ ان کے ہاتھوں میں اب ایک ڈرے تھی، جس میں سویرا کے کمرے میں ادھر آدھرا پیلے گلاس، کپ اور پٹیلیں رکھی تھیں۔

”گرنل بند کر کے اندر آ جا..... سارا رات آدھ (خضد) دیا ہے ٹو نے۔ نیچے ہال میں تو بیڑ تک لگا ہوا ہے اور ٹو ہے کہ رات کے ساڑھے تین بجے کھڑکیاں دروازے کھول کے بغیر گرم کپڑوں کے کھڑی ہے۔ خضد لگ گئی تو مصیبت..... شادی کے دن کتنے رہ گئے ہیں۔ دو دن بعد تیری بھندی ہے اور سب سے بڑی بات، مایوں کے بعد ویسے بھی بٹکے سر، کھلے آسمان کے نیچے آنے سے پرہیز کرنا چاہئے۔ ہوائی چیزوں کا سا یہ ہو جاتا ہے۔“

وہ اپنی عادت کے مطابق ڈھیروں کے حساب سے تھیں کھٹی رہیں اور وہ اپنی عادت کے مطابق سر ہلاتی رہی۔

”بیش کو میں نے کہا ہے، تیرے لئے جائے بنا رہی ہے۔ میں ساتھ میں کا جو، پتہ بھیجتی ہوں۔ تیرے سسرال والوں نے بڑے عمدہ سویرے بھیجے ہیں۔ سارے واہ واہ کر رہے ہیں۔“ جاتے جاتے انہوں نے مزید کہا۔

نندو سسرال والوں کے نام پہ سویرا کا رنگ گلابی ہوا، نندو دن بعد ہونے والی بھندی

ضروری نہ سمجھا تھا۔ یہ بیش ہی تھی جو دوسرے تیرے دن فون بھی کر لیا کرتی اور مینے میں ایک آدھ پکڑ بھی لگاتی، دور نہ ہوتی اور اس کا کرہ، مگر کے گئے چنے کام جو اس کے ذمے تھے، انہیں وہ خاموشی سے نشانائی اور کرہ بند کر کے رسالوں، ڈائجسٹوں کی دنیا میں گم ہو جاتی۔ بیش کی وجہ سے کبھی بکھارا سے اپنے خول سے باہر آنے کا موقع ملتا تھا۔ اسی لئے امی کو بیش کا آنا اچھا لگتا تھا۔ ابھی بھی اس کی شادی کی تاریخ ظہر سے ہی انہوں نے بیش سے بعد اصرار کہا تھا وہ شادی کے کچھ دن پہلے ہی ان کے ہال آ جائے۔ سو آج سے وہ اپنے کپڑے وغیرہ لے کر آ چکی تھی۔ ڈھوک کے بعد چائے پی کر بجائے تازہ دم ہونے کے سب سے لڑکیاں ادھر ادھر لڑکھ کر سوچتی تھیں۔ ایک دوسری بھی جو امی اور ہابی کے ساتھ پیلے واسیٹ رہی تھی۔ جھوٹے برتن، گھسن کی مٹائی، سیوے اور اجڑن کے تھاں..... خالی بوتلیں وغیرہ۔

اس کی نظریں اب لکان کے درختوں سے لپکتے اور پیر دینی دیوار اور گیٹ کے ساتھ ساتھ لگے خوبصورت رنگین برقی تقصوں پر بھی تھیں۔ اس کے باوجود اس کی آنکھوں میں نہ تو ان روشنیوں کا کوئی عکس تھا نہ ہی آنے والے دنوں کے حوالے سے کوئی حسین پتا۔

وہ اپنے وجود سے چھوٹے والی اجڑن اور بھندی کی نرالی آن چھوٹی مہک سے بھی بے نیاز تھی۔

خضد ہی پانی سے لپک لگائے وہ تیرس کے پار نہ جانے کیا ڈھوڑ رہی تھی۔

اماں بی، میری نیندیں بھاگیں

مجھ سے کوسوں دور

اماں بی میرے پٹے ٹو نے

چھوٹکی سینے پھانس

دل در با کے بچ

اماں بی، میری سنے نہ کوئی

ہاری کر کر کٹیں

اماں بی، میری شیشی ڈوبی

عین کنارے پاس

اماں بی، میرے اندر بادل

بارش رو کے کون

اماں بی، میں نے چاند چرایا

”ج“ کہہ رہی ہوں،“ آخنی کے خدشے بالکل درست ہیں۔ کسی کو کبھی شک ہو سکتا ہے۔ وہ تو آئینا ہی ہونے کے ناطے اور میں دوست ہونے کے ناطے تھیں اچھی طرح جانتے ہیں کہ آدم تو کچھ بھی کر سکتی ہو جی کہ کسی کو ٹوٹل بھی کر سکتی ہو مگر کسی سے محبت نامکن..... ورنہ یہ جو ساڑھے بارہ دھاری شکل پر بچے ہوئے ہیں کسی کو کبھی شک میں ڈال کئے ہیں۔“

”تو کیا کروں میں؟“ وہ یہ چارگی سے کہا بھی۔

”سویرا! انگلے سے خلعتِ ترین مزاج والی لڑکی کے خوابوں میں بھی ان دنوں بہار آجاتی ہے۔ کیا واقعی تمہارے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوتا؟“ وہ جراتی سے پوچھنے لگی۔

”یا پھر تم بنی ہو۔۔۔؟ یا۔۔۔ یا خواب دیکھنے سے کمر لاتی ہو، یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ کم آن سوچو۔۔۔ سوچو کیسا ہوگا وہ؟ کیا نظر آتا ہوگا۔ اس کی عادتیں کیسی ہوں گی؟“ بیشش نے اس کے اندر اشتیاق چمکاتا چاہا۔

”میرے سوچنے سے کیا ہوتا ہے، وہ جیسا ہے ویسا ہی ہوگا۔ جیسی عادتیں اللہ نے اس کی بنائی ہیں ویسی ہی ہوں گی۔“

”توبہ کتنی پرہیزگار ہے۔“ اس نے براسمانہ بنایا۔ ”یہی دوستوں میں تم پہلی ہو جس کی شادی ہو رہی ہے۔ مگر زامرہ نہیں آ رہا۔ نہ کوئی شوخی شرارت..... نہ کبھی شیشی بائیں۔ نہ کوئی تلگین خوابوں کا ذکر..... بڑی ہی ”بلک اینڈ وائٹ“ سوچ ہے تمہاری اور تو قصور پر یک دیکھنے سے انکار کر دیا۔ بھلا کیا جاتا دیکھنے میں..... وہ لوگ خود دے کر گمے تھے نا! آج کل تو شادی سے پہلے لڑائی کی باقاعدہ ملاقاتیں کر کر جاتی ہیں، چاہے شادی اربنچ ہی کیوں نہ ہو۔ ایک دوسرے کو شادی سے پہلے جان لینے میں اور ابھی طرح سمجھ لینے میں کوئی برائی نہیں۔“

”ضروری نہیں۔“ سوربانے اختلاف کیا۔

کے تذکرے نے اس کی دھڑکنیں تیز کیں۔ وہ یوں محسوس ہونے لگی تھی کہ اسے اپنے کمرے میں پیش کی شے کا موقع موجود کی ہے بھی! ابھرنے پر اسے ہلکا سا تھکاپہ پیش کی محبت اور غلطی پر اسے کوئی شبہ نہیں تھا۔ وہ اگرچہ حجازا جا اس سے مختلف تھی اور بے شک اس کی خوشیوں میں اس کا ساتھ نہ دے پاتی مگر بھی اس کی دلچسپ باتوں کو انجوائے ضرور کیا کرتی۔

آج وہ پیش کا تو کیا اپنا سہاویہ بھی برداشت نہیں کر پارہی تھی۔ وہ اکیلے رہنا چاہتی تھی۔ اتنی اکیلی کہ اس کی کوئی سوچ، کوئی یاد تک اس کے آس پاس نہ بیٹھے۔

”کہا سوچ رہے ہو دونوں کے مہمان؟“ پیش کی شوخ آواز نے اس کی آنکھ کا اعلان

کیا۔  
مگر وہ رخ بدلے دیوار کی جانب کروٹ لئے لیٹی رہی۔

”میرے خوابوں میں جو آئے  
آ کے مجھے بھٹ کر جانے  
اس سے کہو میری تین دنہ چمائے۔“

۱۹۷۰ء

پیش نہ جانے کے کپ پہ چھپ بچا کے اپنی شریر آواز میں گیت بھجھو اور سو کر اے بے  
زاری عروج پہ پہنچ گئی۔

”کیسا ہے، کون ہے وہ جانے کہاں ہے۔  
جس کے لئے میرے ہوتوں پہ ہاں ہے۔  
اپنا ہے یا بیگانہ ہے وہ۔  
سچ ہے یا کوئی افسانہ ہے وہ۔“  
”پیش پلین..... پلین خاموش ہو جاؤ۔“

اس کی آواز میں غصہ نہیں تھا۔ ایک عجیب طرح کی بے بسی تھی۔ جسے بیش نے محسوس کیا تو اس کے منگنا تے لب خاموش ہو گئے۔

”مسئلہ کیا ہے سوچو! تم صبح سے عجیب طرح سے روی ایکٹ کر رہی ہو۔ اس قدر چڑچڑی ہو رہی ہو کہ کسی سے بھی ڈھونک سے بات کر رہی ہو نہ ہی منہ کے ذواپے درست ہو رہی ہو۔ گھر میں انہوں نے بھرا پڑا ہے۔ تمہیں کچھ احساس ہے کہ تمہارا رویہ لوگوں کو کوسو باتیں بنانے کے لیے ہے۔ سکتا ہے۔ ابھی آئی بھی خبری خدشا پر کر رہی تھیں۔“

”امی تو بس غلط فہمی پر ہمارے سر ہمکا۔“ کوئی نہیں باتیں بناتا۔ سب مجھے عرصے سے

”گھر سے ایک ہی ہوں۔“

”کبھی کبھی پہلے سے کچھ جان لینا کسی کے حق میں برا بھی ثابت ہو سکتا ہے۔“

”کیا مطلب؟ میں بھی نہیں۔“

”ساری رات جاگنے کے بعد انسان کو کوئی بات دیر سے ہی سمجھ میں آتی ہے۔ سو جاؤ

اور مجھے بھی سوئے دو۔“

اس نے گفتگو سنیٹے ہوئے لینے کی تیاری کی اور اس سے پہلے کہ بیش کوئی اور سوال کرتی

اس نے کھل منہ تک تان لیا۔

☆=====☆

دوپہر کا ایک بیج رہا تھا۔

بھلے گھروں میں اس وقت یہاں کام کاج سے فارغ ہو کے بچوں کے لئے روٹیاں تو بے ڈال رہی ہوئی تھیں۔ جن کے سکولوں سے آنے کا وقت ہوتا ہے۔

لیکن یہ گھر، ان گھروں میں سے تھا جہاں تو کھانے پینے کے کوئی وقت اور اصول مقرر تھے، نہ صفائی ستھرائی کے۔

اس گھر کی سب سے بزرگ ہستی دادی تھیں جو جنم میں کبھی چارپائی پہ بیٹھی مگر یہاں

چوس رہی تھیں۔ نیچے اینٹوں کے فرش پہ چھوک کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ جن میں پیاز، لہسن اور آلو،

مٹر کے چھلکے بھی شامل تھے۔ چارپائی کے بڑے سے رنگین پائے کے نزدیک زمین پہ تانبے کا

بڑا سا گلاس لٹکا ہوا تھا۔ جس میں سے پانی بچی ہوئی کسی زمین میں جذب ضرور ہو گئی تھی لیکن

اتنی جگہ اور گلاس کے کناروں پہ پھیاں بچھنا رہی تھیں۔ کھلے انگن میں صرف یہی ایک

چارپائی نہیں تھی بلکہ تین چار دار چارپائیاں بھی تھیں۔ گرمی کا موسم تھا۔ لہذا وہ کھلے گھن میں

پڑا ہوا تین لگا کے چارپائیوں پہ سوئے ہوئے تھے۔ عموماً ذکیہ کے چہنچے چلانے پہ آٹھ نو بجے

تک حیرا برے برے نہ جاتی تھی اور بستر پہ کر کے چارپائیاں برآمدے میں کھڑی کر دیا

کرتی یا پھر سڑے ساڑھے دس بجے صفائی والی ماسی دیناں آکے یہ فریضہ انجام دیتی۔ مگر آج تو

ذکیہ گھر پہ تھی نہ ہی دیناں ابھی تک لوٹی تھیں اس لئے دوپہر ایک بجے تک چارپائیاں بھی پڑی

رہیں اور ان پہ بکھرے بستر بھی۔ ذکیہ نے جانے سے پہلے اپنی چارپائی پہ بیٹھ کے جو ناشتہ

کیا تھا اس کے برتن تک جوں کے توں پڑے تھے۔ کھپوں کا ایک غول ان پہ بھی دعوت اُڑا رہا

تھا۔ ذکیہ کو صبح مانگا منڈی جانا پڑا تھا۔ جہاں اس کی ایک قریبی سہیلی کی ساس کا چالیسواں

تھا۔ ایسی ننھی قریبی اور بچی سیلیاں تھیں ذکیہ کی جن سے اس کی ساس ناواقف تھیں۔ کچھ تو

بہنیں پور پور کی رہنے والی تھیں، ان کے ہاں بھی آنا جانا لگ رہتا۔ یا ان میں سے کوئی نہ کوئی

آئی رہتی۔ ایسا نہ ہوتا تو ذات برادری میں کوئی کم ملنا ملتا تو نہیں تھا ذکیہ کا، وہ گھونٹے بھر نے

کی خوشنمی تھی۔ سو گھر پہ تک کے اس سے بیٹھنا نہ جاتا۔ کیا سرال، کیا میکہ..... کیا محلے داری،

کیا دوستی..... ہر جگہ اس نے تعلقات بنائے رکھے تھے۔ دور پرے کے اور دوسرے شہروں

دیہاتوں کے رہنے والوں کی خوشنمی میں بھی لازماً شریک ہوئی۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کا

شوہر عابد چودھری کویت میں تھا۔ سات آٹھ سال ہو گئے تھے، اسے ملک سے باہر گئے

ہوئے۔ سب سے چھوٹی والی بیٹی ابھی گھر میں تھی جب عابد کا وزیر الگ۔ تب سے اب تک

کویت کے دینار دار ہے تھے۔ اس نے پلٹ کے پاکستان کی جانب نہیں دیکھا تھا۔ گھر میں بی

ٹی خوشحالی آئی تھی۔ مرد کی جانب سے پابندی نہ تھی۔ بچوں کی ذمہ داری بھی خاص نہ تھی،

یوڑھی ساس رکھوالی کے لئے موجود تھی۔ اس نے تنہائی سے فراور اور دل بھلائے رکھنے کا یہی

طریقہ اختیار کیا۔ ویسے بھی جب ایک جیسے آجائے تو اپنے سے کم حیثیت والے رشتے

داروں کے ہاں جا کر کھانے میں الگ ہی لطف آتا ہے۔ اپنے قیمتی لباس اور زیور دکھانے کا

لطف..... آؤ بھگت کروانے کا لطف..... ذکیہ میں غور یا لڑکھن تھی۔ ہاں وہ ذرا خوشامد پسند

اور دکھاوے والی ضرور تھی۔ اس نے غریب عزیزوں سے ملنا بھی ترک نہیں کیا تھا، بلکہ ان

کے ہاں جاتے ہوئے کبھی پھل، کبھی مٹھائی اور اپنے بچوں کی پرانی آئرن لے جاتا، یہ سب

اس کی لڑائی فطرت تو لیکن دیتا تھا۔

چار بچے تھے، تین بیٹیاں اور ایک بیٹا فرخ، جودن چڑے مو کر تب اٹھا تھا جب اس کی

ماں کو گھر سے نکلے آدھا گھنٹہ ہو چکا تھا۔ بازار سے طرہ پوری کا ناشتہ کر کے آنے کے بعد وہ

اس وقت چھت پہ چڑھا چنگ بازی کا شوق پورا کر رہا تھا۔ بہن بھائیوں میں اس کا نمبر دوسرا

تھا۔ پندرہ سال کا تھا مگر کالمی مضبوط اور اٹھان اچھی تھی۔ خوش خوراکی اور بے فکری نے اچھی

صحت عطا کی تھی۔ آس پاس کے رہنے والے اپنی عمر کے لڑکوں کے مقابلے میں وہ خاصا بڑا

لگتا تھا۔ مزاج کا تیز تھا۔ اٹکوتا ہونے کی وجہ سے ماں کا منہ چڑھا بھی تھا۔ جس عمر میں بچوں

کو ماں کے لاڈ کے ساتھ ساتھ باپ کی ننھی اور سر پرستی کی بھی ضرورت ہوتی ہے، اس عمر میں

باپ پیسے کمانے کے لئے اولاد کو ماں کے حوالے کر گیا اور ماں کو جب بھی سفارتی دوروں سے

فرصت ملتی، بے پناہ لاڈ پیار کے ذریعے سر پروری کرتی۔ اسی وجہ سے آٹھویں کے بعد جب

اس نے سکول جانے سے انکار کر دیا تو ماں ننھی نہ کر سکی۔ ویسے بھی آٹھویں میں اس نے تین

سال تو لگا ہی دیئے تھے۔ اب ایک سال سے وہ گھر میں آدھا دن ہو کر پانچنگ بازی کر کے

گزارتا اور باقی کا دن گھر سے باہر دوستوں کے ساتھ گھوم بھر کے۔

اس سے ڈیڑھ سال بڑی حیرا تھی۔ بڑی ہونے کے ناطے وہ بھی گھر کے ہر معاملے میں ذکیہ کی مشیر تھی۔ ماں کی طرح اسے بھی دوستیاں کا گھنٹے کا خاصا شوق تھا۔ ذکیہ کے گھر سے نکلنے کے بعد اس نے ناشتے کے چھوٹے برتن دھوئے یا گھنٹے میں جھاڑو لگائے، مہتروں کو تہہ لگانے والی کسی ہدایت پر عمل نہیں کیا جو ذکیہ جاتے ہوئے سرسری طور پر گئی تھی۔ فرخ ناشتہ کرنے جمورے طوائف کی دکان پہ چاچکا تھا، اسے بازاری کھانے کی چاٹ تھی۔ داوی کو اس نے ماں کے ساتھ ہی منٹا دیا تھا۔ منہ ہاتھ دھو کے اس نے رنگ گورا کرنے والی کریم اپنے سانولے چہرے، شبلی کی گردن اور نرم ہاتھوں پہ جی بھر کے تھوپی، پچھلی عید پہ سلوایا گیا چار جٹ کا میرون سوٹ پہنا۔ اسی بکری لپ اسٹک لگائی۔ غسل والے کاجل سے آنکھوں کو کھنکھارایا اور اونچی تھیل والی سینڈل پہن کر دیناں کے انتظار میں بیٹھ گئی۔ اسے گھر سے اکیلے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی لیکن اس نے اس واہجی یا پابندی کو کبھی اپنا درد نہیں بنایا تھا۔ وہ کام کرنے والی لڑکی دیناں کے ساتھ اپنی سہیلیوں کے ہاں چلی جاتی۔ اگر یونٹک رکستے کا پروگرام ہوتا تو دیناں چھوڑ کے وہیں آ جاتی۔ آج بھی حیرا کا زیتون کے ساتھ بازار جانے کا پروگرام بننا تھا اور دیناں اب تک نہ آئی تھی اس کے نہ آنے کی وجہ سے وہ پھر کے ایک بجے تک صفائی کا پانی کام دینا کا دیر پاڑا تھا۔

ہر جانب جھینٹائی تھیں، بکھرے ٹیکے، چار پائیوں کے نیچے چھوٹے کھیس اور مٹی چادریں، چھوٹے برتنوں کا ڈھیر۔۔۔ سب دیکھ دیکھ کے داوی کا دم الجھ رہا تھا۔ سب سے بڑھ کے بھوک بے تاب کر رہی تھی۔

”وے فرخا۔!“ داوی نے گردن اونچی کر کے اپنے پیچھے بڑوں کا پورا زور لگا کے پوتے کو آواز دینے کی کوشش کی لیکن اوپر بچے ”بوکانا“ کے ہلکا کار میں اس کی ناتواں آواز کہاں پہنچ سکتی تھی۔

”کھنکھ کنڈا نہیں پچتا اس گھر کا۔“ تنک ہار کے چیخ گئی کی۔

”پچھارے پروٹیس میں مزدور یا کر کے کرکے اپنا بھو، شینوں میں ڈال کے انہیں لمبی لمبی رتیں بھیجتا ہے اور ادھر نہ گھروالی کو قتر رہے نہ اولاد کو پرواہ، آوے گا آوا بگڑا ہوا ہے۔“ دن میں تین چار بار وہ اسی طرح دل کی بھڑاس نکال لیا کرتی تھی۔ چاہے کوئی سننے والا ہو یا نہ ہو۔

”ذکیہ نامراد کو تیر ساٹوں سے فرصت نہیں۔ حیرا کو بھی اسی کام پہ لگا دیا ہے۔ وہ تو گھر کے ہر کام میں ہوتی ہے، کچھ بھی کھانے کی رسی ہے۔ میری بیٹی ہے، ماں کے کہنے

پہ۔۔۔ اور بھائی کی محبت میں اس کی لڑکی مانگ بیٹھی ہے۔ جس کا نہ منہ نہ تھا۔۔۔ اور نہ کوئی گھر داری۔ نہ سلیقہ نہ کسی بچی کر کے سہیل پنا (دوستیاں) کرواؤں۔۔۔ جیسی ماں ویسی بیٹی۔ لڑکا ہے تو وہ اک گھر کا گھرا، (اڈیل) الف کا بچہ نہیں بڑھا۔ مزیں نا ہے، چلو نہیں کئے اور باپ کی کمائی اُجالانے کے علاوہ کوئی کام نہیں۔ ہزاروں روپیہ بھیجتا ہے اور ایسا بد نصیب گھر ہے جس کے چولہے ٹھنڈے پڑے رہتے ہیں۔ چلایا جلائے والے ہاتھوں کو اور ہتیرے کا کام دھندے ہیں۔ ماں کی ہر وقت سڑکے لئے ٹکٹ کئی رہتی ہے، بیٹی کے بازاروں کے چکر ختم نہیں ہوتے۔ بڑھی داوی بھوک پڑی ہے صبح کی۔۔۔ ہے کوئی روٹی پوچھنے والا۔“

اس نے دہائی دی۔ اسٹے میں دروازہ دھڑ سے کھلا اور حیرا اور بلی آگے پیچھے گھر میں داخل ہوئیں۔ یوٹھارم کی نیلی قمیص، سفید شلواریں وصول مٹی سے آئی تھیں۔ بھاری سکول بیک کر پلاوے ہوئے وہ ایک ہاتھ میں بمش اور دوسرے میں گولیاں، ٹافیاں داہے ہوئے تھیں۔ جتنی صبح وہ سکول کے لئے نکلتیں اس وقت کوئی بھی ناشتہ بنانے پہ تیار نہ ہوتا۔ نہ ذکیہ نہ ہی حیرا، اس لئے ان دونوں کو اچھا خاصا جیب خرچ ملتا تھا۔ سکول میں چاٹ، نان چنے یا سمو سے کھانے کے علاوہ چھٹی کے بعد بھی وہ کوئی نہ کوئی ایسی سیدھی چیز ساتھ لے آتیں۔ حیرا بارہ سال کی تھی، چھٹی میں پڑھتی تھی اور سب سے چھوٹی بلی تھری جماعت میں تھی اور نو سال کی تھی۔

”امی۔!“ داوی کو مارے بانہ سے سلام کرنے کے بعد اس نے برآمدے میں جھانکا۔

”حیرا! ماں آگے کبھی گھر میں ہوئی ہے جو آج ہوگی۔“ داوی نے چلے کئے انداز میں کہا۔

”داوی۔ بھوک۔۔۔“ بلی جو داوی کے پہلو سے چپک کے بیٹھی تھی، منہ بسورتے ہوئے بولی۔

”ٹو تو ہے ہی بھوکی۔۔۔ نان پکڑے بھی کھائے، تنک مرچ والے امرود بھی، ابھی بمش لے کر دیا ہے۔“ حیرا نے زمین پہ بیک پیچک دیا اور دونوں خیر آپس میں رگڑ کے جوتے اتارنے کی کوشش کر گئی۔

”کیا لپکا ہے وہاں؟“ بلی نے اس کی باتیں نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔  
”کچھ لپکا ہے حیرا۔“ داوی نے اسے پرے بنایا۔ بھوک میں لاڈھی اچھے نہ لگ رہے تھے۔

”کھانے کے لئے پکانے والی کا ہونا ضروری ہے اور نہ تیری ماں کا تلو اکتا ہے مگر میں نہ  
بھین کا۔ پکانا کس نے ہے؟“

”تو دادی تم تو گھر پہ ہو۔ تم پکالو، اس عمر میں آ کے پکانا بھی بھول گئی ہو۔“

سمیرا اپنی بڑی بہن اور بھائی کی طرح منہ پھٹ اور بد مزہ تھی، اس لئے تنگ کے بولی۔

”مر..... بے درایتی.....“ دادی بلبلاتی تھی۔

”مجھے نہ نظر کج طرح آتا ہے، نہ بڑی بڑیاں تھمیت کے چلا جاتا ہے۔ اب میں اس

عمر میں کھوتے جتنی جوان لڑکیوں کو برا بھلا کہتا ہوں۔“

”نہ سہی پڑھے، سو گئی روٹی ہی کھادو۔“ دادی کو پتا کہ اسے بڑا مزہ آتا تھا۔

”اور ویسے بھی ابھی کل خالد شایہ تم کو کہہ رہی تھیں کہ تمہاری اتنی عمر نہیں جتنی عام طور پر

بائیوں دادیوں کی ہوتی ہے۔“

”تو بڑی کن سونیاں لیتی ہے میری، ماں کی بھیجی۔“ دادی نے چل اٹھائی۔ ”ہاں نہیں

ہے میری عمر..... مگر حال اپنے سے بڑی عورتوں سے برا ہے۔ تیری بھیجی (گھڑو) ماں نے

مجھے بچپنان سے ہی بنا بنا کے نہیں چلا میں۔ جتنی تیری زبان چلتی ہے، اتنے ہی ہاتھ چور ہلا لے۔ تو

کیوں نہیں پکاتی۔ تیری عمر کی لڑکیاں ساری ہانڈی روٹی کرتی ہیں۔“

”کرتی ہو گی۔ ساری لڑکیوں کے ابا کویت نہیں ہوتے۔“ وہ اڑتی۔ ”ذکر نے

بچوں کے دماغ میں ابھی طرح یہ بات بٹھا دی تھی کہ وہ اس محلے کے باقی لوگوں سے الگ

ہیں۔ وہ تو گھر میں کوئی جوان مرد نہ ہونے کی وجہ سے اس کے شوہر نے یہ تاکید کی ہوئی تھی

کہ وہ اس پرانے محلے کو نہ چھوڑیں، جہاں پرانی جان بچان ہے۔ ورنہ وہ گھر میں مقول ہے

بھجوانے کے علاوہ بیک میں بھی برابر رقم جمع کرنا رہتا تھا۔ تاکہ وطن واپس لوٹنے پہ اچھا سا

مکان کسی بڑے شہر میں لے سکے اور نیا کاروبار بھی شروع کر سکے۔ اس کے بچوں نے ابھی

سے خود کو پور پور کا بھٹا چھوڑ دیا تھا۔

”روٹی پکاتی ہے میری جوتی۔ بلی اجا شیرے کے ہوٹل سے دو تھپے والے نان پکڑ لا۔

کہنا، ای شام کو پیسے دے دو گی۔“

”نامراد، بے دریدہ..... دادی یا دانی؟ اس کے ساتھ پیٹ نہیں لگا ہوا؟“

”چلو، دادی! کیا یاد کرو گی۔ ایک نان تمہارا بھی منگوا لیتے ہیں۔“

”تو کون سا احسان کر رہی ہے۔ جو ایسے جتا رہی ہے۔ تیری تو بھینش لگائی پڑے گی

اب، گھڑی گھڑی میرے منہ کو آتی ہے۔“

”چل اٹھنا، تھپے والے نان کا کس کراب مجھے بھی بھوک لگ رہی ہے۔“ سمیرا نے بلی

کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔

”میں نے نہیں جانا۔ میں تھی ہوئی ہوں۔“ بشیرے کے ہوٹل پہ رش بھی بڑا ہوتا ہے۔

اتنی دیر سے باری آتی ہے۔“

”اسے رہنے دے سمیرا! اس وقت ہوٹل پہ جھونکا ہوتا ہے، وہ جمع ہوتا ہے، خرغ سے

کہہ دو لاوے۔“

”دادی کی بات سنو.....“ سمیرا نے کھینچ کھانچ کے آخر بلی کو کھڑا کر دیا۔

”خرغ بھائی تو امی کے کہنے پہ بھی بچے نہیں اترے۔ میری بات کیا مانی ہے اس نے۔

چل بلی جلدی کر۔“

بلی چھوٹی ہونے کی وجہ سے سب سے دقت تھی اور کچھ فطرت بھی دیوتھی۔ دل نہ چاہنے

کے باوجود کھڑی ہو گئی۔ اپنی خاموش طبیعت کی وجہ سے دادی کی جھٹکی بھی تھی۔ اب بھی دادی

کو اس پہ ترس آئے لگے۔

”لو، ذرا سی پیٹی، مگر میں پیڈل چل کر سکول سے گھر آئی ہے اور ماں کا کھکھ نصیبوں

میں ہے، نہ یہ کچی پکائی روٹی۔ اب پھر گلی گلی بھرے گی۔ پیٹ بھر نے کے لئے۔“ وہ دیر تک

بڑ بڑاتی رہی۔ بلی دیکھتا ہوا منہ بعد اخبار میں لپیٹ کر گرم تھپے والے نان لے بھی آئی۔

سمیرا نے ٹپٹیل لانے کی زحمت کے بغیر اخبار میں سے ہی نوح نوح کر کھانا شروع کر دیا۔

دروازہ کھلنے کی آواز پہ دادی نے سر اٹھایا۔

”لو! اتنی تمہاری مسافراں، اسے بھی خوشبو آگئی ہو گی تھپے والے نان کی۔ سہیلیاں بھی

تو بھوکے شکے خاندانوں کی بنائی ہیں۔ اٹان کے لئے خوراکیں خرید کے لے جاتی ہے۔

آگ لگا دی ہے مرد کے پیسوں کو۔“

دادی اس وقت اپنے منہ سے دونوں کام برق رفتاری سے لے رہی تھی۔ کھانے کا

بھی..... اور طعنے دینے کا بھی۔ ذکر نے کے لئے شاید یہ معمول کی بات تھی۔ اس نے ساس کی

باتوں کا جواب دینا تو درکنار ان پہ برا ماننے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ وہ چادر اتار کے

چار پانی پہ بچھنے کے بعد وہیں بیٹھ کے پانی لگی۔ اس نے ناگواری سے زمین پہ مگر کی گندگی،

رتنوں اور برستروں کو دیکھا ضرور تھا، مگر ان کے بارے میں کسی سے باز نہ کرنا ضروری نہ

سمجھاتا تھا۔

”پیڈل چل کے آ رہی ہے مائیک منڈی سے؟“ دادی پھر کھڑی ہوئی۔

”اچھی بجلی سولے گھر سے نکلی تھی۔ وہاں جاتے ہی پیٹ میں درد اور مروڑ..... تو بہ، برا حال ہے۔“ وہ دوپٹے دروازہ ہو گئی اور چادر سے پلو سے بندھا ہوا ہونڈ نکالا۔

”بجلی اچانک کے کھکے سے موڑے کی بوتل لے آئی۔“

”امی، میں نے نہیں جانا۔“ اس نے ٹھک کے کہا۔

”میں اچھی اچھی باہر سے نان لے کے آئی ہوں۔ میرے سے نہیں جایا جاتا بار۔“

”تا تو تیرے باپ نے دس دس نوکر رکھ کے دیئے ہوئے ہیں مجھے۔“ پیٹ کے درد

سے وہ پہلے ہی بے حال تھی۔ بجلی کے انکار نے اسے تلخ پا کر دیا۔

”وہ دس کیا بارہ نوکر بھی رکھ دے تب بھی اس گھر کا کچھ نہیں ہونے والا۔“ پیٹ پوچھا

کرنے کے بعد دس دس اور دم ختم آ گیا تھا۔ ”نوکر دوں پے راج کرنے والوں کے بھی کوئی گن

ہوتے ہیں۔“

”اماں! میں اپنی بیٹی سے بات کر رہی ہوں۔“ ذکیہ کتنی ہی سست اور لا پرواہ ہو۔

”ساس سے بدکاری سے پرہیز کیا کرتی۔“

”چل شہناش بجلی! جلدی کر۔ بہت درد ہے۔“

”میں سمجھتی ہوں، میرا سے کہو۔“

”ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے۔ اس نے ٹھیک لے رکھا ہے صبح شام چکر لگانے کا۔“ دادی

نے اپنی لاڈلی پوتی کی سائیلٹی۔

”اماں! میرا اب سیانی ہو گئی ہے۔ اس لئے اسے دکا نوں پہ نہیں سمجھتی۔“

”تو بجلی کے سیانے ہونے میں کتنا وقت ہے اور وہ جو سب سے بڑی ہے، جواں

جہاں..... اسے تین گھنٹے ہو رہے ہیں گھر سے نکلے ہوئے۔ کچھ اس کی بھی پرواہ ہے یا نہیں۔“

”دیناں ساتھ ہی ہوگی، گھر میں جو کوڑے کے ڈھیر لگے ہیں اس سے ہی پتہ چل گیا

تھا اس لئے فکر نہیں ہوئی۔“

”ہاں دیناں تو جیسے بڑی اعتبار والی ہندی ہے، جس کے ساتھ لڑکی کو بھیج کر تجھے فکر

ہی نہیں ہو رہی۔ اس کا کوئی بھروسہ ہے بھلا، مجھے تو حیرا کا اس کے ساتھ لور لور پھرنا پند نہیں،

بھائی کس لئے ہوتے ہیں۔ اچھے گھروں کی لڑکیاں باپ بھائی کے ساتھ باہر جاتی اچھی لگتی

ہیں۔ اب اپنی بوتل کے لئے آواز دے تا اسے..... جو میرے سے لگا رہتا ہے چھین گئے۔“

”ارے اماں! انہیں منگانی مجھے بوتل۔“ ذکیہ نے اٹھ جوڑے۔

”ارے اماں! انہیں منگانی مجھے بوتل۔“ ذکیہ نے اٹھ جوڑے۔

”ارے اماں! انہیں منگانی مجھے بوتل۔“ ذکیہ نے اٹھ جوڑے۔

یہ نہیں کہ اسے لاڈ میں براد کر کے رکھ دیا جائے۔ میرا بھی اکلوتا بیٹا ہے۔ پیار بھی کیا مجھ بیوہ

عورت نے اور باپ کی طرح رعب بھی رکھا۔ ہڈ حرام نہیں بنایا ورنہ آج پردیس میں دیہاتیاں

نہ لگا رہا ہوتا۔ یہیں سبھی توڑ رہا ہوتا تیرے بیٹے کی طرح..... پھر میں دیکھتی ہی عیش و آرام کہاں

سے ہوتے۔ لڑکی ہے تو اس کا تاس مار ڈالا ہے ٹوٹے۔ بجائے گھر داری کھانے کے اسے

بازاروں اور کھیلوں کے گھروں کا رستہ دکھا دیا ہے۔ وہ بھی کیا کرے، ماں جو کرے گی اس

نے وہی دیکھنا اور وہی سمجھنا ہے۔“

”چھا اماں! بس کرو۔ مان لیا میں نے۔ میں بڑی نکمی ہوں۔ اب بس کرو۔“ پیٹ

کے ساتھ ساتھ اب سر میں بھی درد ہونے لگا تھا۔

”نکمی تھی تو نہیں، اب ہو گئی ہے۔“ دادی کا دلیم اچانک کم ہوا۔ اسے شاید شادی کے

ابتدائی سالوں والی ذکیہ یاد آئی تھی۔ تب وہ خاصی سکھ رہا کرتی تھی۔ اب غالباً شوہر کی غیر

موجودگی اور درد سے پیسے کی فراوانی نے لا پرواہ کر دیا تھا۔

”اب بھی وقت ہے، عقل کر، پیسے کا کیا ہے آتی جیز ہے۔ آج ہے تو فائدہ اٹھا۔

جوڑے رکھ۔ کھانے پیئے، تجھے دینے اور کپڑے لیرے بنانے میں ضائع نہ کر۔ یہ گھر دیکھ،

اس محلے کے باقی گھروں سے الگ نظر نہیں آتا۔ دافر کمانی کا کوئی اثر گھر پہ نظر نہیں آتا۔ گھر

میں گھر والی کا دل لگے تو اس کو گھر بنانے، سجانے کا شوق بھی ہو۔ یہ تو شکر کر، بانو بے شک

تیری منہ ہے، لیکن پھر بھی منہ پانچیں دکھایا۔ نہ تیری لا پرواہیاں دیکھیں نہ تیری بیٹی کے سر

چائے، اپنے لائق فائق بیٹے کے لئے انگلیاں حیرا کو۔“

”بڑا احسان کیا ہے اماں! مرتے دم تک نہیں بھولوں گی۔“ ضبط کرتے کرتے بھی ذکیہ

کی آواز بھرا گئی۔ بجلی سے دیکھا نہ گیا۔ یہ بحث اس کے جانے سے انکار سے ہی شروع ہوئی

تھی۔ اسی لئے اس نے اس بحث کو ختم کرنے کا سوچا۔

”لاڈامی! پیسے دو، میں بوتل لا دوں۔“

اسے دروازے سے نکلتا دیکھ کے دادی ایک بار پھر بڑبڑائے بغیر نہ رہ سکی۔

”ہاں، اب اسے بھی رستہ دکھاؤ باہر کا۔ کوئی کمر نہ رہے۔“

☆=====☆=====☆

رومیہ کے ہر اعزاز سے جلت جھلک رہی تھی۔ صاف لگ رہا تھا وہ کہیں جانے کے

ارادے سے جلدی جلدی کام نہ مٹا رہی ہے۔

حق نواز نے کچھ دیر تک اسے برقی رفتار سے کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہی ڈیر درواز



میں رکھ کے لاک کرتے اور فائلز کی کینٹ میں رکھ دیکھا۔ اب وہ اپنا سیل فون اور چابیوں وغیرہ اٹھا کے اپنے شولڈر بیگ میں رکھ رہی تھی۔ اس دوران دیکھا کہ میں بھی ڈیڑھ بجوں سے پھسل کر نیچے جا کر بیٹھ گئی۔ جنہیں سینے سے ہونے اس کے سادہ سے چہرے پر جھنجھلاہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ فائلز رکھتے ہوئے بھی اس نے اپنی عادت کے مطابق ترتیب کا کوئی دھیان نہیں رکھا تھا۔ بلکہ اپنی سیدھی ڈیڑھ کر دی تھیں۔ حق نواز کے لئے یہ بڑی حیرت کی بات تھی۔ وہ اس وقت فون پر کسی سے بات کر رہا تھا اور کن انہوں سے گا ہے بگا ہے اس کی جلت اور گھبراہٹ بھی دیکھ رہا تھا۔ جیسے یہ رویصہ نے اپنا شولڈر بیگ اٹھایا، حق نواز نے دوسری جانب سے بات کرنے والے کو بات مکمل کرنے کا موقع دینے بغیر ہی جلدی سے ”اللہ حافظ“ کہتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

”خیر میرے رویصہ؟ کس کا فون تھا؟“

وہ یہ تو نوٹ کر ہی چکا تھا کہ راجیجی بجلی انہماک سے کام کرتی ہوئی، وہ اچانک آنے والی ایک فون کال سے ڈسٹرپ ہوئی تھی اور اس کے بعد ہی اس نے انفر آفٹری میں اپنا کام سمیٹا تھا۔

”گھر سے تھا، سیدھ کا۔“ وہ جواب دے کر تیزی سے مڑی اور پھر کچھ یاد آنے پہ پلٹی۔ ایک بار پھر اس کے چہرے پر جھنجھلاہٹ نمودار ہو گئی۔

”سرسے تو بات کی ہی نہیں اور وہ ابھی مینٹک میں بڑی ہیں۔ حق نواز اتم میرے لئے ایک فلو کر دے۔“ پلیز سر منظور سے کہہ دینا کہ میں گھر جا رہی ہوں۔ ممی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”میں چلا ہوں تمہارے ساتھ۔“ حق نواز نے ایک دم ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”تم شیڈیل بھول رہی ہو کہ تمہاری کھٹار اور کھٹاپ میں ہے۔“

”اوہ یس۔۔۔“ اس نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ ”ایک تو یہ گاڑی ہمیشہ ان دنوں دعا دے جاتی ہے، جب اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ ممی کا بی بی ایک دھوٹ کر گیا ہے اور ڈاکٹر نے کہا تھا ایسی حالت میں ان پر فائلز کے دوسرے انجک کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ بہت کیر کی ضرورت ہے۔ اب یہ نہیں سمجھتی دیر ان کی طبیعت خراب رہے۔ میں تو ان کا بی بی ہائی ہونے پہ فوراً ہسپتال لے جاتی ہوں، فوری ٹریٹ منٹ کی وجہ سے پیرالائز ہونے کا خطرہ مٹ جاتا ہے، اگر رات کو خود انخواستہ۔۔۔“

تیزی سے بیڑھاں اترتے ہوئے وہ بولے جا رہی تھی۔

”تم آج کے تک کامت سوچا کرو اور اگر سوچنا ہی پڑے تو کم از کم اچھا سوچو۔ ایسا کرو تم آج میری گاڑی رکھ لینا۔ میری طرح قابل اعتبار ہے۔“

”تمہیں پریشانی ہوگی۔“

”اگر نکلتا کہہ رہی ہو تو فٹ ہے تمہاری سوچ پر اور واقعتاً میری پریشانی کا خیال ہے تو ڈونٹ وری۔۔۔ میں تمہاری طرح ان چار پیپوں پر مکمل انحصار نہیں کرتا۔ میری کانٹیک کس طرح کام آئے گی اور کل تو میں بھی آف ڈے ہے۔“

رویصہ ایک بار پھر گھر کا نمبر بلا کے سیدھ سے بات کر رہی تھی۔ ”اوکے، یہ اچھا ہے، تم پہنچو۔۔۔ میں آ رہی ہوں۔ ہاں حق نواز بھی ساتھ ہے۔ پریشان مت ہونا۔ تمہارے ہاتھ پیر پھولیں گے تو ممی کی طبیعت اور بگڑے گی۔ ان کی ساری فائلز ساتھ رکھ لینا۔“

”رائٹ سے ٹرن لے لینا، ہم گھر نہیں، ہسپتال جا رہے ہیں۔“ اس نے سیل فون آف کرتے ہوئے کہا۔

”سانے والی آتی ضرور اپنی کار میں ممی اور سیدھ کو ہسپتال لے جا رہی ہیں۔ وہ خود بھی ڈاکٹر ہیں۔ اس لئے لنگر کی کوئی بات نہیں۔“

”یہ بات تمہیں اپنے آپ کو بتانا چاہئے، مجھے نہیں، کبھی سیدھ کو پریشان نہ ہونے کی تاکید کر رہی ہو، مجھے بھی فکر نہ کرنے کا کہہ رہی ہو۔ جب کہ ہوائیاں تمہارے اپنے چہرے پہ اُڑ رہی ہیں۔“

”کیا کروں؟“ اس کی پلکیں بھگ گئیں۔ آواز میں آنسوؤں کی نمی گھل گئی تھی۔

”چار سال پہلے جب انہیں فالج کا پہلا ایک ہوا تھا تب بہت مشکل وقت گزارا تھا۔ میرے قائل انگریز اور ہر تھے۔ سیدھ بہت چھوٹی تھی ابھی نانکھہ اسٹیڈیو میں پڑھتی تھی۔ میں اکیلی کی کوسنیانے کے قابل نہ تھی اس کے باوجود مجھے انہیں چودہ سالہ بچی کے بھروسے پہ چھوڑ کے لٹکا پڑا تھا۔ بہت دشمن دور تھا۔ ایک تو علی کے اچانک عتاب ہونے کا صدمہ۔۔۔ فاضل کرسس۔۔۔ اور پھر ممی کا پیرالائز ہونا۔ کبھی تو دل چاہتا تھا سب چھوڑ چھوڑ کے گھر بیٹھ جاؤں۔ اس اتنی سی بچی کے لئے تقریباً ناممکن ہوتا تھا ممی کی دیکھ بھال کرنا، لیکن میں ایسا کر بھی تو نہیں سکتی تھی۔ جو کچھ پاپائے چھوڑا تھا وہ ممی کی بیماری اور قرضے پگانے میں ختم ہو گیا۔ ممی کی جاب بھی نہ رہی۔ اب اگر میں بھی ساتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھ جاتی تو۔۔۔ جیسے تیسے پیسہ زدیے۔ زلزل کے بعد جاب کی تلاش۔۔۔ شکر ہے زیادہ خوار نہ ہونا پڑا، لیکن ممی کی

نبھاتے۔ اگرچہ دیکھ بھال کے لئے گورنر بھی موجود تھی۔ مگر ڈاکٹر ٹار کی والدہ پرانے خیالات کی مالک تھیں۔ انہیں بچوں کا ملازموں کے رحم و کرم پہ چھوڑنا پسند نہ تھا۔ جہاں تک ان سے ممکن ہوتا وہ بچوں کے سب کام اپنی نگرانی میں کروا تیں۔ حتیٰ کہ ان کے ٹیوٹر اور قاری صاحب کے آنے پر بھی ان کے ساتھ موجود ہوتیں۔ ان کی گھمبشت پہ ہی مجرمہ کر کے سسر نیلوفر ٹار نے دو بچیوں کے بعد ایک بیٹے کی خواہش پر تیسری بار ماں بننے کا حوصلہ کر لیا۔

لیکن علی کے آنے کے بعد دادا، دادی دونوں نے دیا سے جانے میں زیادہ وقت نہ لگایا۔ علی کو ڈھائی سال کی عمر میں گورنر کے سپرد کر دیا گیا۔ سسر ٹار کی تدریسی ذمہ داریاں مزید بڑھ چکی تھیں۔ اب وہ ایک بڑے تعلیمی ادارے کی وائس پرنسپل تھیں۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی میں ان کی لیکچر شپ بھی جاری تھی۔ دوسری جانب ڈاکٹر ٹار اپنے برسوں پرانے خواب کی تکمیل میں مگن تھے۔ اپنی سالوں کی محنت سے کمائی جانے والی دولت کے ساتھ ساتھ خاندانی جائیداد تک لگ کر وہ ایک بڑا اور جدید ہسپتال بنانا چاہ رہے تھے۔ لہذا جو وقت ملا بھی تو وہ اسی میں صرف ہوجاتا۔ رومیہ اور سیدہ اپنی بڑھاپا میں مصروف تھیں، کیونکہ علی تعلیم یافتہ والدین کی جانب سے اس معاملے میں کوئی رعایت نہیں تھی لیکن اس سب کے باوجود علی سب کا چھپتا اور لاڈلا علی تھا۔ علی شروع سے ہی بے انتہاء ذہین تھا۔ اسے بہترین سکول میں داخل کرایا گیا۔ اس کے لئے دنیا کی ہر اسائن سپلا کرنے کی کوشش کی جاتی۔

ابھی وہ پانچ سال کا تھا کہ ڈاکٹر ٹار دل کے پہلے دورے میں ہی خالق حقیقی سے جاملے۔ اس وقت جب ان کا خواب تکمیل کے آخری مراحل میں تھا۔ یہ سانحہ پوری فیملی کے لئے کئی لحاظ سے ناقابل برداشت تھا۔ ایک تو بیٹے اس عمر میں باپ کے سامنے سے محروم ہو گئے، جب انہیں اس کی اشد ضرورت تھی اور دوسرا یہ کہ ڈاکٹر ٹار جاتے جاتے اپنے پیچھے لاکھوں کا خرچہ چھوڑ گئے۔ جوسر نیلوفر ٹار کو یہ بھگہ، چند پلاٹ جو بچیوں کے مستقبل کو محفوظ رکھنے کے لئے لے کر رکھے گئے تھے۔ اپنے جہیز میں لئے والا فلیٹ اور قیمتی زیورات تک بچ کر ادا کرنا پڑا۔ پوش علاقے سے وہ ایک نسبتاً متوسط علاقے کے مقبول فلیٹ میں شفٹ ہو گئے۔ گورنر، کنگ، ڈاکٹر اور سب کو فارغ کرنا پڑا۔ اگرچہ سسر نیلوفر ٹار کی اپنی آہنی خاصیت تھی لیکن نہ تو بچوں کی تعلیم کے مسئلے میں کوئی کپکپ و ماہر کرنے پہ تیار تھیں، نہ ہی ان کے طرز زندگی میں نمایاں فرق لاکے انہیں احساس محرومی اور احساس کمتری میں مبتلا کرنا چاہتی تھیں۔ اس لئے بیٹے ابھی ان ہی اعلیٰ تعلیمی اداروں میں پڑھ رہے تھے۔ جن کی فیس ادا کرنے میں ان کی نچوڑ کا اچھا خاصا حصہ نکل جاتا۔ ایک جزدقی ملازم بھی تھی۔ اس کے

جواب اور وہ بھی ایسی ٹھٹ، اس کے ساتھ ساتھ گھر کی ذمہ داریاں اور بھی کی دیکھ بھال۔ ان کو ہسپتال وارنٹ کے لئے اور فزوقرانی کے لئے لے جاتا، یہ سب مجھے مشین بنا گیا۔“

”تمہاری محنت رنگ بھی تو لائی۔ آئی پیرالائز ہونے کے ڈیڑھ سال بعد بھی اپنے پیروں پہ چلنے اور اپنے ہاتھ سے کام کرنے کے قابل تو ہو گئیں، ٹھیک ہے کہ ان کا دایاں بازو اور ٹانگ پر اپر موٹیں کرتے مگر اب انہیں کم از کم کسی پڑھنے پڑھانے کی ضرورت ہے۔ یہ بھی بہت بڑی بات ہے ورنہ قانچ کے شکار بعض اوقات ایسے خوش قسمت جانت نہیں ہوا کرتے۔“

”اس بات کا تو میں بھی شکر ادا کرتی ہوں، لیکن ساتھ ہی وہ مشکل دن یاد آتے ہیں تو خفزدہ بھی ہوجاتی ہوں۔ ان کا بی بی ڈا ر سا بھی ہائی ہو جائے تو مجھے گھر ہونے لگتی ہے۔ قانچ کا دوسرا ٹھیک زیادہ خطرناک ہوا کرتا ہے۔“

”ہاں، مگر تو ہوتی ہے، میری ای بھی ہائی بلڈ پریشر کی مریض ہیں، لیکن ان کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ بیزری کا قائل نہیں۔ کہیں آئی بھی تو بد بیزری نہیں کرتیں؟“

”نہیں، ایک تو انہیں ویسے بھی کھانے پینے سے خاص دلچسپی نہیں۔ ضروری خوراک بھی بہت اصرار کے ساتھ کھانا پڑتی ہے۔ دوسرا سیدہ خاصہ دھیان رکھتی ہے کہ کھانے میں تنگ، سالے اور آئل زیادہ نہ ہونے پائے۔ یہ اس کا ڈیپارٹمنٹ ہے لیکن صرف ڈائنٹ کنٹرول کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر زیادہ مینشن لینے سے بھی تو منع کرتے ہیں۔“

اس بار حق نواز کچھ نہ کہہ سکا۔ یہ بھی نہیں کہ انہیں مینشن سے دور رکھا کرو۔ کیسے کہتا جب کہ وہ جانتا تھا۔ جس ماں نے اپنے دس سال کے خوبصورت، صحت مند ذہین بچے کو کھویا ہو اسے قرار کہاں؟

اس نے اسی خاموشی کے ساتھ اپنی گاڑی پارکنگ میں کھڑی کر دی۔

☆=====☆

رومیہ ٹار کا تعلق ایک تعلیم یافتہ اور متحول گھرانے سے تھا۔ اس کے باپ ایک کامیاب سرجن تھے، تو می ایک ہائی کوالٹی فانی پروفیسر، تین بہن بھائیوں میں رومیہ کا پہلا نمبر تھا۔ اس سے سات سال چھوٹی سیدہ تھی اور سب سے چھوٹا علی، ان کا اکلوتا اور پیارا سا بھائی۔ یہی ان کی چھوٹی بیٹی تھی اور اسے زیادہ چھوٹی اس لئے لگا کرتی کہ ناپا اور می دونوں بے انتہاء مصروف لوگ تھے۔ مگر اور بچوں کے لئے چاہنے کے باوجود وقت میں ہی نکال پاتے وہ اور سیدہ تو پھر خوش قسمت تھی کہ ان کا سارا بچپن دادا اور دادی کی پُر شفقت تربیت میں گزرا۔ ڈاکٹر ٹار اور سسر نیلوفر ٹار بچیوں کو اطمینان سے دادا دادی کے سپرد کر کے اپنے فرائض

علاوہ وہ چونکہ دن کا زیادہ وقت گھر سے باہر گزارتی تھی اس لئے بلڈنگ کے گیٹ کبھی کبھار کو تنخواہ سے ڈاکٹر دم دیتی تاکہ وہ ان کی غیر موجودگی میں فلیٹ کا دروازہ کھول سکی۔

اجتہاد میں انہیں خاصی مشکل پیش آئی، عملی زندگی میں وہ عرصے سے تھیں۔ پہلے بھی جاب اور گھر کی ذمہ داریاں دونوں ہی نے اٹھانے کا ارادہ کیا تھا، لیکن جب ذمہ داریاں بانٹنے والا بھی موجود تھا اور وہ یہ کام اپنے حقوق اور گھر سے کرتی تھیں۔ اب مجبوراً صحت کرنا پڑی تھی تاکہ گھر اور بچوں کے خرچے چلتے رہیں۔ اب جسمانی تھکان کے ساتھ ساتھ اعصابی اور ذہنی تھکان بھی رہنے لگی تھی۔ انہی سب سے بڑی بچی رومیہ بھی سولہ سترہ سال کی تھی اس کے باوجود خود کو بہت عمر رسیدہ محسوس کرنے لگی تھیں۔ وہ جو ہمیشہ بہت تر تازہ اور ہشاش بشاش رہا کرتی تھیں اب پروردہ اور بڑا حال نظر آنے لگیں۔

رومیہ عمر کے لحاظ سے سمجھ دار اور معاملہ فہم تھی تو سیدہ فطر غار میں پرہیزگار رہنے والی۔ بچپن نے باپ کی کمی کو محسوس تو کیا لیکن حالات کی تبدیلی کو قبول بھی کر لیا۔ جب کہ ناز و نعم اور آسائش میں پلنے والا علی چڑچڑا ہوا تھا۔ وہ اپنی گورنر کو بھی بہت مس کرتا تھا جس سے پچھلے دھاتی تین سالوں میں وہ خاصا اونچ ہو چکا تھا۔ یہ بچھڑا ساقی بہت برا لگتا تھا وہ اپنے وسیع و عریض بنگلے میں بے لالان میں سائیکل چلاتا چاہتا تھا، فٹ بال کھیلنا چاہتا تھا، اس کی ضد کے ہاتھوں مسز نیلفر ڈائرنے مجبوراً اسے بلڈنگ کے دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے کی اجازت دے دی۔ رفتہ رفتہ بلی بھی گیا۔

مسز نیلفر کو اس کی پرہیزی میں دلچسپی نہ لینے پر تشویش تو تھی لیکن وہ جانتی تھیں ابھی اسے اس ماحول سے بانوس ہونے میں وقت لگے گا۔ گیٹ کبھی کبھار الفت خان سے انہوں نے خاص طور پر علی کا خیال رکھنے کو کہہ رکھا تھا کہ وہ بلڈنگ سے باہر نہ جانے پائے اور وہ بھی الفت خان سے خاصا مانوس ہو چکا تھا۔ ایک دو سال میں وہ سب بھول بھال گیا۔ یوں بھی اس کی عمر ہی کتنی تھی۔ وہ نئے ماحول میں ایڈجسٹ ہوا تو اس کی ذہانت بھی مزید بڑھ گئی۔ اپنی بڑی بہنوں کی طرح وہ بھی کلاس میں نمایاں پوزیشن لینے لگا حالانکہ کھیل میں اس کی دلچسپی برقرار تھی۔ اسلٹ پر کو دا جی ساقبت دینے کے باوجود وہ اچھے مارکس لے لیتا تھا اس لئے مسز نیلفر اس کے باہر نہ پڑنے پر زیادہ اعتراض نہیں کرتی تھی اور وہ ایسے بھی وہ ان کے آنے سے پہلے پہلے گھر واپس ضرور آ جاتا تھا لیکن ایک شام جب مسز نیلفر ڈاکٹر گھر لوٹیں تو رومیہ کو پریشانی کے عالم میں بالکونی سے نیچے جھانکتے پایا۔

”مئی اعلیٰ اب تک گھر نہیں آیا۔“

”اس کو اب ڈاکٹر کھینچ کے رکھنا ہی پڑے گا فقیر، ہسپتال میں آ گیا ہے۔ ویسے تو دین ہے مگر لا پرواہ بھی ہے۔ اگر اب بھی اس نے اسلٹ پر کو سیریسلی نہیں لیا اور یونگی اپنا ٹائم ویٹ کرتا رہا تو.....“

”مئی! اس کے سارے فریئڈز واپس آ چکے ہیں۔“ وہ اپنی گرم شال اتار کے تہہ کرنے کے بعد اپنی بیٹل اتارتے ہوئے کہہ رہی تھیں جب رومیہ نے ان کی بات کاٹنے ہوئے اپنی پریشانی کی اصل وجہ بتائی۔ ان کے ہاتھ وہیں کے وہیں رک گئے۔ سوالیہ نظروں سے وہ بچی کی جانب دیکھنے لگیں۔

”میں نے آس پاس کے سب ہی فلیٹس میں پتہ کروا لیا ہے۔“ اس کی بات سننے ہی انہوں نے دو بارہ بیٹل اور شال اوڑھتے ہوئے باہر نکل گئیں۔ اس کے بعد انہوں نے خود علی کے سب دوستوں کے گھروں میں جا کے پتہ کیا، وہاں سے علم ہوا کہ مئی تو اپنی فلیٹ کے ساتھ ویک اینڈ گزارنے اپنی نانو کے ہاں گیا ہوا تھا۔ ذریعہ فلو ہونے کی وجہ سے پیچھے نہیں آتا جب کہ فیضی اور سرمد جو ایک ہی سکول میں پڑتے تھے، ان کے منتقلی ٹیٹ ہو رہے تھے، وہ بھی آج کیلئے نہیں آئے۔ ان کے علاوہ دو اور دوست تھے۔ ان دونوں کا کہنا تھا کہ اپنے باقی دوستوں کی غیر موجودگی کی وجہ سے وہ جلدی ہو رہے کے واپس چلے گئے تھے۔ انہیں علم نہیں تھا کہ علی اور کتنی دیر تک نیچے پرہاد کر رہا تھا۔ الفت خان کے بیان کے مطابق اس نے آخری بار علی کو پاؤں کے اندر ہی سائیکل چلائے دیکھا تھا۔ جب وہ عصر کی نماز پڑھ کر واپس آیا تو کچھ ڈاؤن تھا۔ وہ بھی سمجھا کہ علی بھی اوپر چلا گیا ہوگا۔

مسز نیلفر کے ساتھ آس پڑوس کے کئی لوگوں نے ہر کند جگہ پر علی کی تلاش رات بھر جاری رکھی۔ اگلے دن پولیس میں رپورٹ بھی درج کرانی گئی لیکن علی کا کچھ پتہ نہ چلا۔ اس وقت وہ دس برس کا تھا۔ اس کے جانے کے صرف پڑھ بیٹے بعد ہی مسز نیلفر ڈائرنے فاتح کے باعث معذور ہو گئیں۔ دو سال رومیہ نے ان کی پیاری سے لڑتے گزارے۔ اب وہ اس قابل ضرور تھیں کہ چل پھر لیتی تھیں۔ دایاں بازو حرکت نہیں کرتا تھا اور دائیں ٹانگ میں بھی بلی کی ننگڑا ہٹ آگئی تھی۔ اس کے باوجود وہ اب معذوری کی زندگی نہیں گزار رہی تھیں اور رومیہ اسی پر اللہ کی شکر گزار تھی۔ البتہ بیٹے کی جدائی کے غم سے ماں کو کھانے میں ناکام بھی۔ جس نے پچھلے چار سال سے انہیں اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا۔

☆=====☆

حیرا کر کے کے اندر تھی، لیکن باہر سے کئی ہوئی ہرگز نہ تھی کہ باہر برآمدے میں ذکیہ

”اُمی..... چٹک والا جن۔“ اس نے دہائی دی۔

”اُگ لگے تیرے چٹک والے جن کو، گھر میں ہونے والا جوئی بیٹھا ہے، اسے بہانے پڑے ہوئے ہیں۔ اُٹھ جا میں کھڑی ہوں۔“

”ذکیہ! فرخ کو کبھیج دے۔ کم از کم شام کے وقت تو لڑکی کو نہ بھیجا کر۔“ دادی نے بھی اندر ہی سے آواز دی۔

”فرخ کبھی اس وقت گھر ہوا ہے اماں؟ اور اپنا حمل ہے۔ ڈر کی کیا بات، اتنی روٹن ہوتی ہے باہر اب میں روٹی ڈالوں یا دکالوں کے کھیرے لگاؤں۔ حیرا تو آج باہر نکلنے والی نہیں۔ پتہ تو ہے کہ اتنی شرمیلی ہے۔“ ذکیہ کے اٹھنے ہی دورانے کے اوٹ میں کڑی حیرا جلدی سے اندر ہوگئی۔ اس ساری بحث کے دوران آصف ڈھیمٹ بنا بیٹھا رہا۔ ایک بار بھی خود دکان چا نے کی پچیس نہیں کی اور کیوں کرتا، یہ صرف اس کے ماموں کا گھر نہیں تھا، ہونے والا سرال تھا۔

برے برے منہ بناتے ہوئے بلی ہاتھ میں پیسے دو کے چلی ہی گئی۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ دھتے کے دوران وہ یہ کام کر لے تاکہ اس کا ڈرامہ نہ چھوٹ جائے۔

”چا چا بیٹیر بارہ روٹیاں کڑک۔“ اس نے بچوں کے بل ایک کے تندور والے کو زور سے آواز دی۔

”چا چا! گھر مہمان آئے ہیں، مجھے پہلے لگا دو۔ میں ابھی آکے لیتی ہوں۔“

یہاں سے وہ اسی طرح بھاگی ہوئی صادق کی دکان تک گئی۔

”صادق بھائی جان۔“ دکان پر اسے کوئی نظر نہ آیا تو وہ اندر جھانک کے آواز دینے لگی۔ نیچے فرش پر دردی بچھا کے لیٹا ایک لڑکا رسالہ پڑھ رہا تھا۔

”کیا چاہئے؟“ وہ اٹھ بیٹھا۔ سترہ اٹھارہ سال کا نو عمر لڑکا تھا۔ اس سے پہلے بلی نے اسے کبھی اس کی دکان یا محلے میں نہیں دیکھا تھا۔ یہاں یا تو صادق بھائی جان ہوتے یا ان کا چھوٹا بھائی راجا۔ کبھی بھھار مان کے بوڑھے ابا ہوتے۔

”پاؤ بینن اور چھانڈے۔“

اس نے سامنے رکھے انڈوں کے ریک میں سے چھانڈے تو فوراً نکال کر ایک لفافے میں ڈالے اور مزے کے زمین پر رکھے دھیر سارے کنستروں پر نظر ڈالنے لگا۔

”بینن..... ہاں۔“ یہاں۔“ اس نے ایک اور لفافے میں بینن ڈالا تو دسافر میں چپکے سے گر گیا۔ پھر وہ اسے تولنے کے لئے ترازو میں رکھنے لگا تو اسے پاؤ وزن والا بات ہی تھی

کے سامنے اس کا محیر آصف نہ صرف اسے صاف نظر آ رہا تھا بلکہ وہ خود بھی اپنی بھرپور تیاروں کی جھلک اسے دکھانے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ ذکیہ کی پشت دروازے کی جانب مکی اس لئے وہ بیٹی کی سرگرمی سے لاعلم تھی اور نہ جانے کون سے خاندانی قصے چھپنے بیٹھی تھی۔ جن کو بے دھیانی سے سنتے ہوئے آصف مسلسل سر ہلانے جارہا تھا البتہ چھلکتی ہوئی بے باک نظریں بار بار صیرا پے جا پڑتی تھیں، جو لال سرخ کرپ کا جوڑا پہنے، دوپٹے کا پلو جان بوجھ کر نیچے مگرانے دروازے کے پت پت اپنا سرخ نیل پائس سے سجا ہاتھ رکھے اٹھایا شرارت سے نچاری تھی..... مکارے اور آتی لائسنز سے بوجھ لگائیں بھی ناز سے پت پٹائی جارہی تھیں۔ ذکیہ گلاس رکھنے کے لئے نیچے جھکی تو آصف نے نظر بچا کے اسے ایک شوخ سا اشارہ بھی کیا جس پر اس نے شرم و حیا کا مظاہرہ کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔ اسی کمرے میں اس کی دونوں چھوٹی بہنیں بیٹھیں اپنا ہوم ورک کر رہی تھیں۔

”ہائی کوڈ کینڈا ذرا..... سری دیوی بنی ہوئی ہے۔“ میرا نے بلی کو شہو کا دے کر متوجہ کیا۔ اس کے لبوں پر ستمخرا نہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ بلی نے بھی اس منظر میں دلچسپی تلاشنا چاہی مگر اسے خاص مزہ نہ آیا۔

”کیا ہے؟“ وہ بار بار کے ٹھوکوں سے بد مزہ ہوئی۔

”دیکھ تو سہی، اپنے آپ کو میری دیکھ رہی ہے اور میری دیکھ ڈرا..... منالا ہو رہی، زکوٹا جن۔“ وہ ہنسی دیتے ہوئے بولی۔ اگر یہ تیرہ میرا کے کانوں تک پہنچ جاتا تو اس کی بیٹی لگنا لازمی تھی۔

”زکوٹا جن..... ہاں جج۔“ چٹک والا جن کا نام ہو گیا ہے، چلوئی دی لگائیں۔“ بلی نے اس ڈرامے کا نام لیا جو آج کل اس کا پسندیدہ تھا۔

”نکوئی مارنی دی کو، یہ ظلم جو لگی ہے سامنے۔“ پتہ نہیں اسے کیا مزہ آ رہا تھا جو اس کے دانت اندر نہیں جارہے تھے۔ بلی اپنی کتیاں سمیٹ کر نی دی والے کمرے میں چلی گئی۔ جہاں پہلے ہی دادی کا قہقہہ تھا۔

”بھئی..... او بھئی!“ ابھی پہلا وقفہ ہی آیا تھا کہ ذکیہ کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔

”جا، بیٹیر کے کندور سے روٹیاں پکڑ لا اور صادق کی دکان سے پاؤ بینن اور انڈے بھی لا دے۔ اب آصف اتنے دنوں بعد آیا ہے تو روٹی کھائے بغیر تو نہ جانے دوں گی۔ شوہر بے والے کوٹنے ہیں، بغیر ابلے انڈوں کے مزہ نہیں آئے گا اور آصف میرے ہاتھ کے پکڑوں کی بھی فرمائش کر رہا ہے، چل، جلدی سے دوڑ لگا۔“

دیر نہ ملا۔ ہر بات سے اناری پن جھلک رہا تھا۔

”اوہو..... پاؤسی ہوگا۔ اعزاز تو ہو رہا ہے۔ یہ لو بھی اور لاؤ پیسے۔“

”کیوں..... میں تمہیں کیوں دوں پیسے؟“ بلکی نے عیبوں والا ہاتھ پیچھے کیا۔

”یہ صادق بھائی جان کی دکان ہے، ان کی چیزیں ہیں، میں کسی اور کو پیسے کیوں دوں؟“

”ارے واہ..... تو سودا بھی پھر اپنے صادق بھائی جان سے لو..... چلو شکل گم کرو۔“ اس کے ڈانٹنے پر وہ کم کر بیچنے ہٹی تو لاڑکے کی ہنسی نکل گئی۔

”اوئے بدعو، میں ادھر کھڑا ہوں تو دکان والوں کا کچھ لگتا ہی ہوں گا۔ صادق بھائی جان میرے کزن ہیں۔ وہ کسی کام سے گھر گئے ہیں۔ یہ سودا چاہتے تو لے جاؤ اور پیسے چپ چاپ ادھر کر جاؤ۔“ گھر نہیں تو شاہاش..... مجھے رسالہ پڑھنے دو۔“

اسے اگلی دکان پہ جا کے حریف وقت ضائع کرنے کے خیال سے کوفت ہوئی۔ اس نے جلدی سے لفافے پکڑے، پیسے رکھے اور بھاگنے کی تیاری کی۔

”یہ لو.....“ اس نے ایک چوڑم اس کی جانب بڑھا لی۔

”یہ کیوں؟“ وہ ہچکچا گئی۔

”دکھو، میرے پہلے پہلے کھسکے لئے۔ یہ لو پیاری بے بی۔“ اس نے زبردستی اسے چوڑم جھانکی اور دوبارہ رسالہ کھول لیا۔

روڈ ٹالنے لے کر وہ گھر آئی تو ذکیہ بچن میں معرّف تھی۔ دادی ابھی تک ٹی وی کے سامنے اور آصف وہیں جما بیٹھا تھا۔ بچن سے چونک کر لڑکیوں کے کمرے کا دروازہ صاف نظر آتا تھا اس لئے حمیرا اب تاک تھا تک نہیں کر رہی تھی۔

آصف بے زاری سے بیٹھا کروں ادھر ادھر تھا کہ جائزہ لے رہا تھا۔

”اے بلی..... ادھر آؤ۔“ آصف نے اشارہ کیا۔

کمرے سے آئی آوازوں سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ جلدی داہن لوٹنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ اب دوسرا وقت آ رہا تھا۔ وہ مرے مرے قدموں سے آصف کے قریب آئی۔

”اور سناؤ، کون سی کلاس میں پڑھتی ہو۔“ ایسی ہی دو چار ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اس نے نظر بچا کے جب سے ایک تہ شدہ کاغذ نکالا اور اس کی مٹی میں دو بادیا۔

”ابنی باجی کو دے دینا۔“ سرگوشی کے اعزاز میں کہا گیا۔ ایک سنسنی کی بلی کے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ یہ ڈیوٹی سے بڑی دلچسپ محسوس ہوئی۔ وہ اس وقت کو چمپا کے کمرے میں

آئی تو حمیرا نظر نہ آئی البتہ میرا کی جاسوس نظروں نے بھانپ لیا۔

”یہ ہاتھ میں کیا ہے؟“

”آصف بھائی جان نے دیا ہے، باجی کے لئے۔“ اس نے اسی رازدارانہ انداز میں کہا۔

”دکھاؤ۔“ اس کے ہاں کرتے بھی میرا نے رتھ بچمن لیا اور چپکٹی آنکھوں کے ساتھ چپکے لے لے کے پڑھنے لگی، کہیں اس کا رنگ گلابی ہو جاتا اور کہیں سرخ۔ البتہ بلی کے سر کے اوپر سے یہ باتیں گزرتی رہیں۔ وہ جمانیاں لیتی رہی۔ اچانک ساتھ والے سنور سے حمیرا نکلی۔ میرا کے چمپاٹے چمپاٹے بھی اس نے رتھ اچک لیا۔

”حرام خور! میرا خط پڑھتی ہے۔“ اس نے میرا کی سر میں جڑنے کے لئے مکا اٹھا ہا ہی تھا کہ وہ غچہ دے کر باہر نکل گئی۔ جیسا کہ وہ آگئی۔ حمیرا نے اسے ہی دو تھپڑے مارے۔

”میں نے کیا کیا ہے؟“ وہ رونے لگی۔ الٹا حمیرا کو مصیبت پڑ گئی کہ دادی یا ماں ادھر نہ آ جائیں اس کی آواز سن کر اور اس کا خط پکڑا جائے، جس سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ اس جیسے کو کھٹے والے ہیں اور پہلے بھی کھٹے رہے ہیں۔ یہ راز مکمل جاتا تو اس کا گھر سے باہر نکلنا بند ہو جاتا۔ آصف سے تو کبھی مینے ڈیڑھ مینے بعد ملنا ہوتا تھا، لیکن روز کی سیر اور بازاروں میں خریداری..... یہ سب بھی ختم ہو جاتا۔“

”چپ کر پٹاؤ۔“ چپ کر چا۔“

”میرا پڑھ رہی تھی۔ میں تو لے کے آئی تھی آصف بھائی جان سے..... امی.....“ حمیرا نے اس کے منہ پر پختی سے ہاتھ جما دیا۔

”چپ..... پہلے چھوٹا تھا کہ اس ذلیل میرا کی غلطی ہے۔ شاہاش ادھر آ، میں کل تیرے لئے بازار سے اتنا پیار ہنجر بیڑا لائی تھی اور ہاں میرا ایک کام کرے گی تو کل کھول کے لئے پورے دس روپے دوں گی۔“ اس نے بھلا چھٹا کے اسے چپ کر ائی لیا اور ایک جوابی خط لکھ کے اسے تھا لیا۔

”یہ چپکے سے اپنے آصف بھائی جان کو دے دینا اور دیکھو کسی کو پتہ نہ چلے، اس میرا کی بچی کو بھی نہیں، تو تو میری سبیلی سے ناکل میرے ساتھ زہن کے گھر بھی چلنا۔ اس کی چھوٹی بہن سے تیری بھی دوستی ہے۔ دونوں مل کے کھیلنا۔“ حمیرا سارے لالچ اور بھلاوے دے کر اس نے بلی کو مٹا لیا تھا۔

بڑی۔

”کب اچھا لگتا ہوں یہ بتا دو تا کہ میں آئندہ اسی کیفیت، اسی حالت میں رہا کروں۔“

”جب میرے کہنے کا میری بات سمجھ جاتے ہو تب۔“

”ابھی بھی میں کچھ کچھ سمجھ تو رہا ہوں مگر تمہاری زبان سے سنا چاہتا ہوں۔“

”تم مجھے کام کرنے دو گے یا نہیں؟“

”مزدور کرنے دوں گا مگر یہ جاننے کے بعد کہ تم میرے ہاں آنے سے کھڑا کیوں

ہوں جب کہ فزیک کی شادی میں تم خوش خوش شریک ہوئی تھیں اور تب ہماری دوستی ایسی گہری

بھی تھی۔ دو تین ماہ ہوئے تھے جان بچانا کو۔“

”اور تب ہی میں جان مٹی جی حق نواز! کہ تمہاری چٹلی مجھے پسند نہیں کرتی۔ نہ صرف

میرے ساتھ بلکہ اس آفس کی وہ سب لڑکیاں جن کو تم نے کوئی کھیل ہونے کے ناٹے اپنی بہن کی

شادی میں انوائٹ کیا تھا۔ سب ہی کے ساتھ ان کا رویہ عجیب سا تھا۔ اس کے بعد ایک آدھ

بار، جب بھی میں ان سے ملی، مجھے شرت سے یہ محسوس ہوا کہ انہیں مجھ سے ملنے سے تو کیا،

میرے ہونے یا نہ ہونے سے بھی کوئی دلچسپی نہیں بلکہ انہیں شاید تمہارا مجھ سے زیادہ ملنا چاہنا

بھی پسند نہیں۔ مجھے ان باتوں سے کوئی خاص پر اہم نہیں، نہ ہی میں اس میں اپنی انسلٹ

محسوس کرتی ہوں۔ میں ایک پیچور لڑکی ہوں، جانتی ہوں ہر چٹلی کی کچھ رویات ہوتی ہیں۔ ان

کے ذہن میں اگر باہر کام کرنے والی خواتین کے بارے میں کچھ غلط فہمیاں ہیں تو یہ ایسی

انوکھی بات نہیں۔ میں اسے اپنا کام مسئلہ بنانے سے انکار نہیں کر رہی بلکہ میں اس خوشی کے

موقع پر تمہاری امی کو پریشان نہیں کرنا چاہتی کیونکہ بات صرف اتنی نہیں کہ وہ مجھے ایک درنگ

وہن ہونے کی وجہ سے ناپسند کرتی ہیں بلکہ شاید تمہارے حوالے سے بھی وہ کچھ خدشات

رکھتی ہیں۔ ہاں ویسے یہ میں آ جاؤں گی۔ ہماری دوستی کا بھرم بھی رہ جائے گا اور یہ فکشن خاصا

فارمل سا ہوتا ہے۔ اس لئے زیادہ آسان سا نہیں ہوگا۔“ اس نے اتنی وضاحت سے یہ سب

کہا کہ حق نواز کچھ کہی نہ سکا۔

اس نے واقعی کچھ غلط بھی تو نہیں کہا تھا۔ اس کی امی واقعی دنیاوی خیالات کی تھیں اور

سب سے بڑھ کے اس کا بڑا بھائی شاہ نواز..... جس کی شادی تھی۔ اسی کی خند کے نتیجے میں

فوزیہ جو ان کی سب سے چھوٹی بہن تھی، میٹرک سے آئے تعلیم حاصل نہ کر سکی کیونکہ شاہ نواز

کا بچپن عورتی میں بڑھنے والی لڑکیوں کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اسی کے کہنے پر فوزیہ کی شادی محض

سترہ سال کی عمر میں کر دی گئی۔ حالانکہ امی پہلے بھولا نا چاہتی تھیں اور شاہ نواز کی شادی کے

”آئی کی طبیعت اب کسی ہے؟“

”شکر ہے اللہ کا۔ پہلے سے خاصی بہتر ہے۔ اس روز تمہارے لیکچر کا خاصا اثر ہوا تھا۔

دو دن سے بلڈ پریشر بھی نارمل ہے۔ اگر اسی طرح بیکاری کی پیشکش سے دور رہیں گی تو آئندہ بھی

ٹھیک رہیں گی۔ جب تمہارے لیکچر کا اثر ختم ہونے والا ہوگا تو میں بتا دوں گی۔ آ کر ایک ڈوز

اور دے جانا۔“

اس کی نظریں مائٹرز پر جمی تھیں، ایک ہاتھ ماؤس کو متحرک رکھے ہوئے تھا اور دوسرے

ہاتھ سے وہ اپنے بالوں کی اس موٹی سی لٹ کو بار بار کان کے پیچھے اڑنے میں مصروف تھی۔ جو

کلاپ کی قید سے نکل گئی تھی۔ ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ لئے وہ اس کے سوال کا تفصیلی جواب

دے رہی تھی اور ہمیشہ کی طرح حق نواز کو بے حد اچھا لگ رہی تھی۔ بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ اس

نے حق نواز کی جانب دیکھتے ہوئے کوئی بات کی ہو۔ چنانچہ وہ ایسا ارادہ کرتی تھی یا غیر

ارادی طور پر..... مگر اسے رومیہ کی ادا بہت بھاتی تھی۔

”نی اپنی اہل حق تھیں، آئی اور سنیہ کو آتا ہوگا ہمارے ہاں۔“

”وہ کیوں؟“

”بھول گئیں۔ شاہ نواز بھائی کی شادی یا پھر یا قاعدہ دعوت نامے کی منتظر تھیں۔

خیر..... یہ میں نے کیا ہوں۔ تمہارا کارڈ۔“

اس نے ایک خوبصورت کارڈ اس کی جانب بوجھایا، جسے رومیہ نے اپنا کام روک

کے بغور بڑھا۔

”ویل۔ ویسے تو تمہارے گھر کے نزدیک ہی ہاں میں ہے۔ یعنی آسانی رہے گی۔ پہنچ

جائیں گے جیسی۔“

”کیا مطلب؟ صرف ویسے اٹینڈ کر دو گی۔ مہندی، آؤشن حتیٰ کہ کیک ہونے والی

ڈھونکی میں بھی تم آؤنا چاہو۔ خبردار جو کوئی چھپا لیا تو۔“

”دیکھو، میں جھوٹے وعدے نہیں کر سکتی، اس لئے صاف صاف کہہ رہی ہوں کہ صرف

ویسے یہ آؤں گی اور میرے ساتھ ہی ماسیج ہوں گی یا نہیں، اس کے بارے میں بھی ابھی سے

کچھ کہہ نہیں سکتی۔“

”کیوں، بہت مصروف ہستی ہوگئی ہو جو چھوٹے موٹے لوگوں کی خوشیوں میں شریک

ہونا گوارا نہیں؟“

”پلیز حق نواز! یوں عورتوں کی طرح طعنے مت دیا کرو، اچھے نہیں لگتے۔“ وہ ہنس

لے شراکت بہت سخت تھیں۔ اسے پروے کی پابند اور سیدھی سادی لڑکی چاہتے تھے۔ اب کہیں چاہے اس کی ای سی سویرا کو ڈھونڈ پائیں جس کی کالچ سے گریجٹ مگر پروے کی سخت پابند تھی۔ بہت کم گوارہ معصوم مثل و صورت والی اس لڑکی کا چہرہ اس کی بے باکی ہونے کی گواہی دیتا تھا۔ ایسے میں اگر حق نواز نے اشاروں کنایوں میں رومیہ کے لئے اپنی پسندیدگی ظاہر کر دی تھی تو ان کا بھڑکنا فطری تھا۔ وہ دوسری بہو کے طور پر ایسی لڑکی کو کبھی برداشت نہیں کر سکتی تھیں جس کے سر پر باپ کا سایہ تھا نہ بھائی کا ساتھ۔ وہ بخیر خوشی میں لڑکوں کے ساتھ پڑھتی تھی اور اب مردوں کے ساتھ اخبار کے دفتر میں کام کرتی تھی۔ بغیر پروے کے سارے شہر میں گاڑی دوڑانی، خبریں اٹھنی کرتی بھرتی تھی۔ رومیہ ان کی ناگواری پہچان گئی تھی۔ ابھی تو وہ بے جا جاتی تھی کہ اس کی ناگواری کی اصل وجہ حق نواز ہے۔ جس نے ماں کو بے الفاظ میں بے تادیب تھا کہ وہ رومیہ کو زندگی کا ساتھی بنانا چاہتا ہے۔

فوزیہ کی شادی پہ اس کے اور دوسری کولیئرز کے آنے پہ شاہ نواز نے بھی ناک بھون چڑھائی تھی۔

”بہن کی شادی ہے اور تم نے گرل فرینڈ رکھا ڈھیر اکٹھا کر لیا ہے۔ وہ لوگ کیا خیال کریں گے کیسا آزاد خیال گھرانہ ہے۔ ضرور لڑکی بھی۔“

”فارا ڈھیک شاہ نواز! یہ نہیں کیسے کیسے فضول خیالات آتے ہیں تمہارے ذہن میں۔“

اسے ان سب کولیئرز کا ”گرل فرینڈ“ ٹھہرائے جاتا سخت برا محسوس ہوا جن سے اس کا غلوں اور احترام کا رشتہ تھا بلکہ رومیہ اور اس جیسی لڑکی کو وہ بے حد سراپتا تھا جو اپنی جیسی کے لئے محدود جہد کر رہی تھیں۔ رومیہ کی مثال سامنے تھی۔ کم عمر تھی اور پُرکشش بھی۔ اس کی طرح کتنے ہی لوگوں نے اس کی ہم سفری کی تمنا کی ہوگی۔ وہ جانتی تو کسی کا ہاتھ تھا کم ایک خوشحال اور بے فکر زندگی کی شروعات کر سکتی تھی۔ مگر وہ ماں کے علاج، بہن کی اعلیٰ تعلیم اور گھر کے دیگر اخراجات پورے کرنے کے لئے ہی یہ جاب کر رہی تھی۔ یہ فطرت جاب جو عام عورتوں کے بس کی بات نہیں پھر کیسے اسے ایسی اور ایسی لڑکی کو برا قرار دیا جاسکتا ہے جو گھر سے نکل کر باہر کام کرنے پہ مجبور ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے ان میں اکا دکا ایسی ہوں جو شوقیہ جاب کرتی ہوں مگر ان چند کی وجہ سے سب کو ہی غلط نہیں لگا جاسکتا کہ ان کو وہ تادیب نہیں کر سکتا۔ وہ صرف اپنی کولیئرز کا ہی نہیں بلکہ روز بس اپنا پ نظر آنے والی ہر اس لڑکی کا احترام کرتا تھا جو روزگار کی نیت سے گھر سے باہر قدم نکالتی تھیں۔ اس کے دل میں ان لڑکیوں کے لئے گھر

میں بیٹھے والی خواتین سے کہیں بڑھ کے احترام تھا۔

یہ بدکردار کیسے ہو سکتی ہیں۔ اگر ہو سکتی تو ذرا دھڑک کے لئے گلی گلوں کے پرانے سکولوں میں چھ چھ گھسنے نہ رکھنا تھیں۔ دسویں، ہارویں منزل کی بیڑھیاں چڑھ کے کسی معمولی سے آفس میں ٹائپسٹ کی نوکری نہ کریں۔ آٹھ سو روپے کی خاطر ریلوے اسٹیشن کے نزدیک بے گھر گھومتی بی سی او میں ٹیلی فون آپریٹر کی سیٹ پہ بیٹھ کے ہر قماش کے بندے کو مسکرا مسکرا کر نہ چھیٹیں اور نہ ہی سٹریٹر پر گن کے گلی گلی براؤنٹ بیچنے کی خاطر گھروں کے دروازے کھٹکھٹا دیں اور بد لے میں خاتون خانہ کی بھری جینٹیل۔ اگر یہ واقعی بدکردار ہو سکتی تو یہ سب کیوں کرتیں۔ کیوں جان تو زحمت اور ذلت والی زندگی چھیتیں۔ وہ ای آسانی سے غلط ذرائع سے اس سے کہیں زیادہ رقم کما سکتی تھیں لیکن وہ ایسا نہیں کرتیں۔ محنت اور حلال کی کمائی پہ یقین رکھنے والی ان محنت کش خواتین پہ انگلی اٹھانا سے پسند نہیں تھا مگر یہ اس کے اپنے خیالات تھے، ان کو وہ نہ اپنے بھائی کے غریب سکا تھا نہ ماں کو کھال کر سکا تھا۔

”چلو اچھا ہے، نہ اسے رومیہ! وہ خامی سمجھ دار ہے۔“ اس نے مزید اصرار نہ کیا۔

”تم یقیناً فرخندہ لودھی کے کسی منہ پر کام کر رہی ہو۔“ اثبات میں جواب ملنے پہ پر اسرا منہ ہٹا کر رہ گیا۔

”ایک تو یہ حق ہے تمہارے حواسوں پہ چھا گئی ہے۔ ذرا سوئ نہیں کرتی تمہیں ایسی ترس لگاتی، نام نہاد آزادی نسوان کی حامی سوشل ورکر ٹائپ خواتین سے دوستی۔“

”پہلے تو میں یہ سمجھ کر دوں کہ وہ محض آزادی کے بنیادی حقوق کے لئے کام کرتی ہے، خاص طور پہ بچے۔ بچوں کو جس طرح نظر انداز کیا جاتا ہے وہ۔“

”بس بس، رہنے دو۔ ہونہ۔ بچوں کو نظر انداز۔“ اس نے ہنسنا نہ انداز میں سر جھٹکا۔

”میں نے کم از کم اپنے آس پاس بچوں کو نظر انداز ہوتے نہیں دیکھا۔ ہمارے معاشرے میں تو بچوں کو کچھ زیادہ ہی اثر اور بڑویشن رکھا جاتا ہے۔ ضرورت سے زیادہ کیئر۔ ضرورت سے زیادہ لاؤ۔“

رومیہ نے گہری سانس لی۔ ”تمہارا مشاہدہ اس معاملے میں خاصا سطحی ہے۔ اس طے میں پھر کسی تعمیلی گفتگو کریں گے۔ ابھی تو مجھے اس منہ پر کے لئے بہت ساری سچ درک کرنا ہے۔ یہ ان بچوں کے بارے میں ہے جنہیں خیر خاتونوں نے ایڈیٹ کیا جاتا ہے۔ ان میں سے چند ایک ہی ایسے خوش قسمت ہوتے ہیں، جنہیں ایک بھری بڑی جیسی کا سکھل پاتا

ہے، ورنہ بڑے بڑے دعوؤں کے ساتھ گولے بچوں کا کیا حال ہوتا ہے، وہی فرخندہ لودھی نے دکھانا چاہا ہے۔ جیم خانے والے بھی پلٹ کے نہیں پوچھتے۔ میں فرخندہ کے ساتھ مل کے آج کل مینی ریسرچ کر رہی ہوں۔ اس کی این جی وی کی اہم جیم خانوں سے پچھلے کئی سالوں میں گولے جانے والے بچوں کے بارے میں معلوم کر لیا ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ ان درجنوں بچوں میں سے کتنی کے دو چار ہی اطمینان بخش حال میں ہیں۔ بے اولادی کی وجہ سے جن جوڑوں نے ان جیم بچوں سے اپنی عمری دور کرنا چاہی، ان میں سے کئی ایک کے اپنی اولاد ہو گئی اور انہیں اپنی یہ جلد بازی کھٹکنے لگی۔ جگر کا گوشہ بنانے کے جانے والے وہ لوگ اب ان کو اپنے بیٹے اٹھانے اور کھلانے والا ملازم بنائے ہوئے ہیں۔ کئی خود کو ذہنی طور پر تیار ہو کر بچہ ایڈاپٹ کر بیٹھے مگر اپنی فیملی کو اعتماد میں نہ لے سکے۔ ایسا زیادہ تر جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہنے والے جوڑوں کے ساتھ ہوا ہے۔ ان کے گولے بچوں کو ماں باپ تو مل گئے لیکن دادا دادی، تانا تانی، خال، چھو بھی بننے پر کوئی تائید نہیں۔ یہ بچہ احساسی کمزری کا شکار ہو چکے ہیں۔ ایک فیملی میں پرورش پانے کے بعد ملین میں جوا اعتماد ہونا چاہئے تھا، ان کی ذہنی نشوونما جس طرح ہونا چاہئے تھی، وہ بھی مفقود ہے۔ صبح شام انہیں اس گھر میں رہنے والوں کی حقیر کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور بہت سے کیمرز میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بچہ گولے لینے کی کوئی غصہ وجہ نہ ہونے کے باوجود متحمل خاندان ایسا کرتے ہیں اور بے مل لوگوں کی داد واہ بھی سہیتے ہیں کہ وہ کسی جیم کے سر پہ ہاتھ رکھ رہے ہیں جب کہ حقیقتاً وہ گھر میں ”غلاموں“ اور ”کنیزوں“ کا ڈھیر لگا رہے ہوتے ہیں۔“

”تو کیا فرخندہ لودھی کے ریسرچ کرنے اور تمہارے فخر چھاپنے سے یہ سب رک جائے گا؟“

”تم جو سیاستدانوں کے بیٹے اور میزاتے ہو، کیا ایسا کرنے سے وہ سدھر جائیں گے؟ نہیں۔ پھر بھی تم ایسا کرتے ہو، صرف عوام کو با شعور بنانے کے لئے تاکہ وہ اپنا برا بھلا سمجھ سکیں۔ یہ جان پائیں کہ کھوکھلے دعوے کرنے والے اور صحیح معنوں میں قوم کے لئے مخلص سیاست دانوں میں کیا فرق ہے۔ یہی مقصد فرخندہ کا بھی ہے، لیکن تم ضمیر سے سیاسی قسم کے صحافی..... ایوان بالا کی ریشہ وادوں تک تو تمہاری نظر کی رسائی ہے مگر ایک عام شخص کی عام سی زندگی کے اور بھی بہت سے مسائل ہوتے ہیں۔“ وہ کہتے ہوئے دھیرے سے مسکرائی۔

=====☆=====

”یہ کیسا کارڈ ہے؟“

رومیہ نے گھر پہنچے ہی اپنے بیگ سے شادی کا کارڈ نکال کر مسز نیلوفر شاکر کو پکڑ لیا تو وہ پوچھنے لگیں۔ ساتھ ہی دروازے سے چند بھی نکال لیا۔

”حق نواز کے بڑے بھائی کی شادی ہے، ساری فیملی کا انویٹیشن ہے۔“

”اچھا..... اچھا.....“ وہ مر ہلائے نکلیں۔ ساتھ ساتھ کارڈ کا بھی بغور مطالعہ ہو رہا تھا۔

”مہندی تو آج ہی ہے..... میری طبیعت تو ٹھیک نہیں۔ اگر سنیہ تمہارے ساتھ جانا چاہے تو پوچھ لو اس سے۔“

”میں کہیں نہیں جا رہی۔“ اس نے جو گزرا تارے اور سکھندی سے ان کے بیٹہ پہ ہی آڑی تر چھی لیٹ گئی۔

”کیوں؟ میری فکر مت کرو، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تمہیں جانا چاہئے۔ حق نواز کو برا لگے گا۔ وہ بر ضرورت کے وقت بن بلائے سب سے پہلے پھینچتا ہے۔“

”تمہیں برا لگے گا، میں اسے بتا چکی ہوں۔ دیکھے بھی میں نے صرف آج جانے سے انکار کیا ہے۔ مہندی وغیرہ کے کنکشن ایک تو بہت رات تک چلتے ہیں، دوسرے فضول کا شور شرابا۔ اتنی محنت کے بعد کہاں دل چاہتا ہے گی؟“

”لو کیا تو ایسے کنکشن میں جانے کے لئے ساری محنت بھول جاتی ہیں۔ تم نے ہی کام اور بے دلی کو اپنا اوزار بننا چھوڑنا سیکھا ہے۔ جیٹا اپنی عمر کی لڑکیوں کی طرح رہا کرو۔“

ضروری نہیں کہ جاب کرنے والی لڑکی شین بن جائے۔ میں خود شادی سے پہلے سے پریکٹیکل لائف میں ہوں۔ اپنی خال کو دیکھو، پیک کی جاب کرتی ہیں، مجھ سے دس سال ہی چھوٹی ہے لیکن اس شپ ٹاپ سے رہتی ہے جیسے تم سے چار پانچ سال بڑی ہو۔ ایک تم ہو کہ اپنا خیال رکھتی ہو نہ اپنی ڈرائیگ کا۔ کہیں آنے جانے کی عادت ڈالو، دوست بناؤ تو تمہیں اور مٹے سینے کا شوق بھی ہو۔“

”ہے ناشوق..... بہت ہے۔ اب اس کا کیا کیجئے کہ خاصی بد ذوق ہوں۔ ہمیشہ تو آپ میری شاہک میں سو سو کیڑے نکالتی ہیں۔ کبھی آپ کو کلرز ڈال گئے ہیں، کبھی اسٹائل آؤٹ آف ڈیٹ..... بد دل ہو کے میں نے تو بیٹا سنو رہا ہی چھوڑ دیا۔“ وہ شرارت سے مسکراتے ہوئے سارے الزام ان پر دھک رہی تھی۔

”بہت خوب..... یوں باتیں بنا کے موضوع نہ بدلو۔ میں کہہ رہی ہوں، اچھا سا سوٹ نکالو، تیار ہو جاؤ اور مہندی کے کنکشن میں ضرور جاؤ۔“

رومیہ..... میری جان..... خوش رہا کرو تاکہ میں بھی خوش رہوں۔ تمہیں عام لڑکیوں



”ہاں، اس کے کہنے سے بھلا کیا ہوتا ہے۔ تم پہ تو ماں کے کہنے کا اثر نہیں ہوتا۔ وہ بے چارہ کس گنتی میں۔“

”اوسوئی..... کیوں بیکار کی ٹینشن لے رہی ہیں آپ۔ اب یہ کوئی مسئلہ ہے جس پہ آپ مگر کھاری ہیں۔ دودن سے لی بی نائل ہے، جو آپ سے برداشت نہیں ہو رہا۔“

”بیکار کی ٹینشن! تم میری بیٹی ہو، تمہاری عمر شادی کی ہے۔ کیا مجھے ٹینشن نہیں لینی چاہئے۔ بے چارہ حق نواز..... اتنا بھلا کتا.....“

”اچھا بابا..... چلی جاتی ہوں میں اس بے چارے بھلے لڑکے کے بھائی کی مہندی پہ..... آپ کہیں تو لہنگا پہنیں کہہ ہاتھوں میں پرانہ اور کالوں میں جھکے بھی ڈال لوں؟“ اس نے بحث سے جان چھڑا دیا۔

”تمہیں اس طرح دیکھنے کا ارمان تو ہے مگر تمہاری اپنی شادی پر۔“ انہوں نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کے اس کی پیشانی چومی۔

”مگر میں اکیلی جاؤں گی اور اس شرط پہ کہ دیر ہونے پر آپ پریشان نہیں ہوں گی۔“

”سیدہ آپ کے پاس گھر رہے گی۔ میں آپ کو رات کے وقت اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔ ہاں پندرہ پندرہ منٹ بعد دفن ضرور کرتی رہوں گی۔ پراس۔“ وہ تیار ہونے لگتی۔

”مگر آنے تک اس کا کوئی ارادہ نہ تھا مہندی میں شرکت کرنے کا لیکن ماں سے گفتگو نے کچھ اس رخ پہ پلٹا کھایا کہ وہ مزید نصیحتوں اور ہدایتوں سے بچنے کے لئے جانے پہ تیار ہو گئی۔

☆=====☆

حمیرا اور زینون خوش گپیاں لگاتی، ہنسی مٹھول کرتی بازار سے واپس آ رہی تھیں۔ آج چونکہ دیناں ساتھ نہیں تھی، اس لئے زینون حمیرا کے کہنے پہ اسے گھر تک چھوڑنے آ رہی تھی۔ وہ دونوں آگے آگے تھیں اور ان سے ایک قدم پیچھے بلی اور گئی تھیں۔ گئی زینون کی چھوٹی بہن خنی جو بلی کی نظر بیاہم مڑتی۔

”حمیرا! یہ جو تیری گلی کے گڑ پہ دکان ہے، اس پہ کتنا بونگا سا آدمی بیٹھا ہے۔ اس دن تیرے گھر سے واپس پہ میں گئی کے لئے غائبی رہی تو دیکھا تھا..... تو بہ، مزمل..... کو جانے! زینون نے اپنی کوئی والی مولی سی تاک چڑھائی۔

”دفع کر۔ یہ عجلت ہی کبے (بصورت) لوگوں کا ہے۔ ذرا کوئی ڈھنگ کی شکل نہیں، سوائے میرے آصف کے۔“ وہ اترائی۔ اس کی بڑھ بھکی ہانجی اسی محلے میں رہتی تھی، اسی

سے مختلف زندگی گزارتے دیکھ کے مجھے اپنا آپ مجرم لگتا ہے جیسے.....“

”پلیز می! اس میں گھٹ کی کیا بات ہے۔ اپنی اپنی عادات ہوتی ہے۔ مجھے زیادہ شور شرابا پسند نہیں۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں خوش نہیں ہوں۔ کیا آپ کو اپنی خوشی کا یقین دلانے کے لئے ضروری ہے کہ میں شارٹ شرٹس کے ساتھ صوفی شلواریں یا پٹیا لہ شلواریں پہوں۔ ہفتے میں دو چار مرتبہ بیوٹی پارلر جاؤں۔ بالوں میں اسٹریٹنگ کرواؤں، ڈارک کلر کی لپ اسٹک لگاؤں، کالوں میں کنزروں تک آئے ایئر کنڈر پہوں۔“

”اسٹوپی۔“ سرنیلوفر شار کے لبوں پہ مسکراہٹ ریک گئی۔

”اور رہا مہندی کے نقش میں شرکت کا سوال تو می..... میں یور ہو جاؤں گی وہاں..... کسی سے خاص علیک سلیک بھی تو نہیں۔“

”تو کرو.....“ انہوں نے مشورہ دیا۔ ”حق نواز کی فیملی سے تمہیں اسے فرم بڑھانے چاہئیں۔“ انہوں نے وہ بات کی جو پہلے بھی ڈھکے چھپے الفاظ میں کی بار کہہ چکی تھیں۔

”آپ کو پتہ ہے کہ جن لوگوں سے میرا مزاج نہ ملتا ہو، میں ان سے زیادہ کھلتی ہوتی ہوں۔ حق نواز سے دوستی کا مطلب یہ نہیں کہ اس کی شادی فیملی سے میری فریقہ نشینی ملتی ہوگی۔ جی بات یہ ہے کہ میں ان کے لئے ”ایلیٹن“ ہوں۔“

”کیا..... حق نواز اور تمہاری دوستی..... صرف دوستی ہے؟“ پہلی بار انہوں نے مکمل کے یہ سوال کیا جو انہیں اکثر شک کرتا تھا۔

”آپ کو کیا لگتا ہے؟“ وہ اٹھ کے بیٹھ گئی اور ان کی سائیز ٹیبل پہ پزاریکارڈ کا چاٹ اٹھا کے دیکھنے لگی۔

”تم میری بیٹی ہو لیکن جی بات یہ ہے کہ اس کے باوجود میں حتی طور پہ تمہارے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتی، البتہ حق نواز کے ہر انداز سے مجھے محسوس ہوا ہے کہ وہ تمہیں پسند کرتا ہے۔“

”پاگل ہے وہ۔“ رومیہ نے سر جھٹکا۔

”اس کا مطلب ہے کہ میرا انداز غلط نہیں۔ پاگل ہی ہوگا جو پتھر سے سر پھوڑ رہا ہے۔“ سرنیلوفر نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

”اس نے بھی کچھ کہا تم سے؟“

”کئی بار، لیکن اس کے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔“ اس نے شانے اچکا لئے اور سرنیلوفر اس بار چڑ گئیں۔

لئے تو آصف کا روز روز کا آنا جانا تھا۔

”ہائے نہیں باہی!“ بلی نے سز کے بہن سے کہا۔

”صادق بھائی جان کے ایک کزن ہیں بڑے اساتذہ سے، وہ آج کل دکان پر ہوتے ہیں۔“

”ابھی صبح زینون کے گھر سے نکلتے ہوئے تو میں نے دیکھا تھا۔ صادق کا بڑا حباب بیضا کھاس رہا تھا۔“

”اچھا! کب جب میں مین لینے آئی تھی، تب تو وہی تھے۔ بواہنس کے بات کی۔ ایک چوہہ گم بھی دی۔“

”جمل حیرا! ڈراؤ کیس تو کسی، کیا چہ ہمیں بھی ایک ایک چوہہ گم مل جائے۔“ زینون نے آنکھ ماری۔ وہ غاسی دل پیچک تھی۔

”ارے واہ، دیدہ دلیری تو دیکھو۔ اب دن دیہارے ڈاکے پڑنے لگے۔“ زینون نے دکان پہنچتے ہی آنکھیں مٹکا کے کہا۔

”ہی، کیا مطلب؟“ اسی دن والے لڑکے نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ تو صادق بھائی صاحب کی دکان ہے، آپ جناب یہاں کیا کر رہے ہیں؟“

”ڈاکا ڈالنے والے سب کچھ سمیٹ کے چلتے جتے ہیں مس! جانے دفعہ پہنچے کے مطالعہ نہیں فرماتے۔“ اس نے رسالہ لڑکے دکھایا۔ زینون کی سمجھ میں اس کی گاڑی اردو نہ آئی۔ وہ جتنی آن پڑھ تھی جب کہ حیرا جو پانچ جہ جانتیں پڑھی ہوئی تھی، مگر ادی۔ شکل و صورت سے وہ کوئی حوری نہ تھی لیکن زینون کی نسبت بہتر تھی۔ اچھا پہن اوزھ کے اور بھی اچھی لگتی۔ بساط بھر میک اپ اور ہار سنگھار زینون نے بھی کر رکھا تھا لیکن حیرا کے کانوں کی سونے کی بالیاں، قیمتی، قیمتی، قیمتی جواہر، اہل والی جوتی اور لٹکانی پہنڈھی کویت سے آئی گھڑی اسے آسودہ خاندان کا ظاہر کر رہی تھی۔ اس چیز نے بھی اس لڑکے کو مجبور کر دیا کہ وہ زینون کے بجائے دوسری لڑکی میں دلچسپی لے۔

”میں نمیک کہہ رہا ہوں مس؟“

”ہم میں سے کوئی استانی نہیں ہے جو جس مس کر رہے ہو۔“ زینون نے اپنی سمجھ کا مظاہرہ کیا۔ حیرا کی ہنسی چھوٹ گئی۔

”بہت خوبصورت ہنسی ہے آپ کی۔“

چھوٹا سا شہر تھا، متوسط لوگوں کا محلہ..... وہ لڑکا اگر کچھ بے باک ہو رہا تھا تو اس کی وجہ

ان شوخ لڑکیوں کی جانب سے ملی ہوئی شرمتی۔ جب انہیں کوئی تکلف نہیں تھا تو وہ کیوں شرافت کا مظاہرہ کرتا۔ اس کی نظر میں بے باکی سے ان بنی سنواری لڑکیوں کے سراپے اور چہروں پہ پھل رہی تھیں۔

”سز کو کیوں؟“ اس سوال پہ حیرا کی ہنسی اور بھی، نکھر گئی۔

”آپ کی ہنسی کہہ رہی ہے کہ آپ کو اس پہ کوئی اعتراض نہیں۔“

”زیادہ پہلے کی ضرورت نہیں، سمجھے۔“ اس نے بڑے بڑے ہنسیوں اچکا کر۔

”امید تو رکھ سکتا ہوں۔“

”اس پہ پابندی نہیں۔ میرا کیا جاتا ہے۔“

”میرا تو پانچ منٹ میں ہی بہت کچھ چلا گیا۔“

”لو جی، ادھر تو ڈائنگ شروع ہو گئے۔ اب گانا مت گانے بیٹھ جانا۔“ زینون کے لیے سے رنگ اور حسد دونوں چمک رہے تھے۔ حیرا ہمیشہ اس کو سائیڈ پہ کر دیا کرتی تھی۔ اس کو چلنے دیکھ کر حیرا کو اور مزہ آیا۔ وہ اس چمچیز چھڑا کر کھول دینے لگی۔ لڑکے نے دونوں کو

خضری بوتلیں بھی کھلی کھلی کے دیں۔ بچیوں کو لائی پاپ اور میمن کے پکٹ پکڑائے۔ دوپہر دخل رہی تھی۔ گلی کے اندر عورتوں کا آنا جانا اس وقت پھر بھی لگا رہتا تھا۔ چاہے دن کے اور کسی وقت میں کم ہی کسی لیکن گلی کی کھڑ پہ بنی اس دکان جس کے شہر سڑک کی جانب کھلتے تھے۔ گلی سے باہر الگ تھلگ تھی۔ سڑک پہ سے بھی کوئی آکا دکھا دیکھ، آکرش یا سائیکل والا گزر جاتا۔

لڑکا خاصا چرب زبان تھا اور پڑھا لکھا بھی۔ اس نے بتایا تھا کہ ابھی اسی ایف اے کا امتحان دے کر یہاں اپنی خالہ کے ہاں چھٹیاں گزارنے آیا ہے، اسی لے اس کا اعزاز کھنگو اور پسینے اوزھ سے کا ڈھنگ یہاں کے گنوار لڑکوں سے بہت بہتر تھا۔ کچھ اس لے بھی اور کچھ زینون کے سامنے شیخی بگھارنے کے لئے، حیرا مسلسل اس کی حوصلہ افزائی کرتی رہی۔ اس کی تعریفوں پر شرماتی اور مسکراتی۔ اس کے شوخ جملوں کے بے تکلفانہ جواب دیتی رہی۔

”یہ لڑکے ادھر ہی آرہے ہیں۔ چل حیرا!“ زینون نے اسے متوجہ کیا۔

”میرے دوست ہیں، گھبرا کیوں رہی ہیں۔“ لڑکے کو اپنے باروں کے سامنے شو مارنے کا موقع ملا تھا، وہ کیسے ہاتھ سے جانے نہ دیتا، اس لئے روک لیا۔ ان پہ رعب جمانا چاہتا تھا کہ ان کے شہر اور ان کے محلے آنے کے دو دن بعد ہی وہ ایک لڑکی پھنسا چکا ہے۔ حیرا گھبرا کے اسی وقت پلٹ جانا چاہتی تھی کیونکہ ان میں سے دو لڑکے اسی کی گلی کے تھے۔

”ابھی جانے دو..... وعدہ رہا کھل پھراؤں گی۔“

”میں انتظار کروں گا، تم کماؤ میری کمزور آؤ گی۔“ محض میں منٹ کی ملاقات میں نوبت قصوں وعدوں تک آگئی تھی۔

”تمہاری قسم۔“ اس نے اس فلمی انداز میں کہا کہ وہ لڑاکا ہے اختیار اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ بیٹھا۔

”آصف بھائی جان..... باجی! وہ دیکھو۔“ بلی کی آواز یہ وہ کرٹ کھا کے بٹھی۔

آصف اپنی سائیکل پر سوار اس سے چتر گڑ کے قافلے پہ تھا۔ اس کی گھورتی نظروں سے وہ اس طرح خوفزدہ ہوئی کہ اور کچھ نہ سمجھا تو جو ہاتھ اس لڑکے نے تمام رکھا تھا، وہی ایک جھٹکے سے کھینچ کے اس کے چہرے پہ زور سے دے مارا۔ مقصد صرف آصف پہ یہ ظاہر کرنا تھا کہ چھپر جھاڑ اس لڑکے کی جانب سے ہوئی تھی۔

لڑاکا جو جتنی بھی محبت کے خمار میں ڈوبا، ایک لڑکی کا ہاتھ تھامے نہ جانے کن جہانوں کی سیر کر رہا تھا، چھپر کھا کے پہلے تو بڑ بڑا دے کر گیا۔ اس نے بے چینی سے اس لڑکی کو دیکھا جو تقریباً آدھے گھٹنے سے اس کے ساتھ تقریباً کر رہی تھی اور اب چہرے پہ غصہ ناک تاثرات لے لے گا لیاں دے رہی تھی۔ دو قدم لے قافلے پہ کھڑے اس کے دوست اس کی بے عزتی کا تماشا دیکھ رہے تھے۔

آصف بھی سائیکل کھڑی کر کے آگے بڑھا۔ اس کے ارادے اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ حیران کے اشارہ کرنے پہ زبٹون نے اسے آگے جانے سے روکا۔

”جانے دو بھائی جان! ایسے ہی کوئی لٹکا ہے۔ حیرانے اچھا سبق سکھایا ہے۔ آپ جاؤ گے تو بات بڑھ گی۔ ایو یس بے چاری کی بدنامی ہوگی۔“

”تو کیا میں بے غیرتوں کی طرح چپ چاپ دابیں چلا جاؤں۔“

”اسی میں منتل مندی ہے۔“ حیرانے بھی بہتر آواز میں کہا۔ ”اگر میرا بھائی یا چاچا ملا لڑتا تو اور بات تھی۔ تم بغیر سو لوگ بھی کہیں گے، اس لڑکی کے پیچھے دوڑ کے مارا ماری کر رہے تھے۔ میں بدنام ہواؤں گی۔“

آصف انہیں لے کر گلی میں گھس گیا۔ دوسری جانب وہ لڑکا ابھی تک گال پہ ہاتھ رکھے کھٹکے کے عالم میں کھڑا تھا۔ آصف وغیرہ کے جاتے ہی اس کے دوست جولاڑی جھگڑے کا غصہ محسوس کر کے دوڑ کھڑے تھے لیک کے اس کے پاس آئے۔

”یہ کیا تمہارا تھا؟ اوہ تجھے کیا ضرورت تھی اس کا ہاتھ پکڑنے کی۔ اپنے آپ کو کچ بچ کا ہیرو سمجھ بیٹھا تھا۔“ یہ تبصرہ اس دوست کا تھا جس نے اسے کسی ترکب میں ہیرو کا خطاب دیا

تھا اور اب سب ہی اسے ہیرو دیکھنے لگے تھے۔ ویسے تو وہ صادق کی خالہ کا بیٹا تھا لیکن صادق اور اس کے چھوٹے بھائی نے اس کی زیادہ دوستی نہ تھی۔ شاید مرادو مزاج کا فرق آڑے آتا ہو۔ وہ چونکہ دوستانہ فطرت کا تھا، اس لئے آتی ہی اس محلے میں ڈھیر سارے دوست بنائے جو اسی کی طرح کے تھے۔

”بڑی قندیل لڑکی ہے۔“ سکتے سے باہر آتی ہی وہ اس لڑکی کو بھلا برا کہنے لگا۔ ”میں تو سمجھ رہا تھا یہاں کی لڑکیوں میں اتنی چالاکی نہیں ہوگی لیکن یہ چھوٹے شہر کی عام ہی لڑکی تو بہت تیز فٹل۔“ پہلے خود فری رہی، لطف دیتی رہی، لٹے ملانے کے وعدے بھی کر لئے اور جب بھائی کی شکل دیکھی تو چھپر مار کے چلتی بنی۔

”وہ اس کا بھائی نہیں، سمجھتے رہے اور بھائی کو کبھی کم نہ سمجھتا۔ زیادہ نہ چپک۔“ لٹے کے وعدے..... ادو..... دوست نے مذاق اڑایا جو یہاں کاسب سے ادبائش لڑکا تھا۔ اصل نام تو نہ جانے کیا تھا، سب ”ٹٹی“ کے نام سے پکارتے تھے۔

”لڑکی سے مار کھا کے اب جھوٹی کہاں بنا رہا ہے۔“

”میں بچ کہہ رہا ہوں۔ مکار لڑکیاں بولتیں بھی لپی لگیں۔ دوبارہ ہاتھ آئی تو چھوڑوں گا نہیں۔“ اس نے منہ پہ ہاتھ بھیر کے قسم کھائی۔

”اچھا چھوڑو، جی پاؤ یار! ہیرو..... آج شام کا کیا پروگرام ہے۔“ ٹٹی نے سرگرمی لگائی۔

”پہلے تو ایک کش مجھے لگانے دے، میٹر ڈاؤن ہو رہا ہے۔“

”نہیں! پھر نہ کہنا کہ بتایا نہیں، اس لے کہہ رہا ہوں کہ یہ سادہ سگریٹ نہیں، اس میں پریاں بھری ہیں۔“

”پریاں؟؟؟؟؟“ وہ یوں کہتے پتے ہو تم؟“

”اؤ نہیں! یار! وہ گندہ نشہ ہے۔ بندہ کسی جگہ نہیں رہتا۔ یہ تو چوس ہے، بڑی ہلکی چیز۔ زرا سرور ہی سرور۔ بالکل شراب کی طرح..... یعنی نشہ تو ہے بے ہوشی نہیں۔ اس کا نہ نا لگانے سے اندر باہر پریاں تاچنے لگتی ہیں۔“

”ہیرو کی آنکھوں کے آگے تو اس وقت ستارے ناچ رہے ہیں۔“ ایک یار نے مذاق اڑایا۔ اس نے غصے کے مارے ٹٹی کے ہاتھ سے سگریٹ چھین لی۔

دھوئیں کے سرخو لے بنا تا وہ اب تک ذہن میں اس لڑکی کو کمرہ چھکانے کے منصوبے بنا رہا تھا۔

آج ان لوگوں نے لڑکی والوں کے ہاں مہندی لے کر جانا تھا۔ تیاریاں عروج پہ تھیں۔  
 "فوزی! یہ تمہاری مندا کپن کے آگے ہے۔" شاہ نواز نے بہن کو روک کے پوچھا۔  
 "بلکہ..... وہی جو میں نے پہنا ہے۔" اس نے اپنے لباس کی جانب اشارہ کیا۔ وہ  
 دونوں بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی اور کچھ عرصہ قبل ہی اس کی شادی ہوئی تھی، اس لئے خوب  
 ارمان نکال رہی تھی۔ ابھی بھی اپنا عرصہ صبر نہ بھاری کام والا بلکہ پہنے ہوئے تھی۔  
 "اور آج تو زیادہ تر لڑکیوں نے لنگے ہی پہنے ہیں۔" اس نے اپنی چھوٹی سی بیٹی کی  
 پونیاں بتاتے ہوئے جواب دیا۔

"مگر اس کا حلبہ تو دیکھو، اتنی چھوٹی قمیص اور دوپٹہ بھی نہیں لپا۔"

"بیٹی عی تو ہے بھائی جان!" فوزی بے پروا لگا لیکن وہ ظاہر کے بغیر بولی۔ شادی سے  
 پہلے وہ بھائی کی بے چارہ نوک کا شکار تھی لیکن اب سسرال میں ماحول دوستانہ اور کھلا ڈلا  
 تھا۔ اب اسے اپنے بھائی کی بے جا تنقید چھوٹی تھی۔ اپنی بارہ تیرہ سالہ زندگی کے بارے میں اس کا  
 تجربہ اسے اچھا نہ لگا۔

"بیٹی ہے تو کیا بے لگام چھوڑ دیا جاتا ہے۔" وہ تیزی سے چڑھا کے پوچھنے لگا۔

"پتہ نہیں امی نے کیا سوچ کے تمہارا رشتہ یہاں طے کر دیا۔ عجیب آزاد خیال اور  
 بگڑے ہوئے لوگ ہیں۔ مجھے تو ڈر ہے کہ ان کی صحبت میں تم بھی میگز نہ جاؤ۔" برقع تو چھوڑ دیا  
 ہے، بال بھی کٹوا لئے ہیں، اب دیکھو اور کیا ہو جاتی ہے۔ میں تو کہتا ہوں اس بیٹی کو اس  
 ماحول سے ابھی سے بچا کر رکھنا۔ اس کی تربیت بے پرائز پڑے گا۔"

"بلیئر بھائی جان!" وہ گھبرائی۔ اس کا سارا سسرال یہاں موجود تھا۔ شوہر بھی کہیں  
 آس پاس تھا۔ اگر کسی کے کانوں میں بھٹک پڑ جاتی تو اس کے لئے صورت حال خطرناک  
 ہو سکتی تھی۔

"تمہارے چہرے سے بارہ کیوں بچے ہیں۔" حق نواز کبیرہ لینے اندر آیا تو فوزیہ کو آف  
 مود کے ساتھ بیٹھا دیکھ کے پوچھا۔

"ہمارے بہنوئی صاحب سے جھڑپ ہو گئی ہے کیا؟"

"شکر ہے ان کا دماغ نہیں بھرا ہوا جو شادی والے گھر میں ایسی حرکتیں کرتے  
 پھر رہے۔" حق نواز بھی اس سے بڑا تھا لیکن شاہ نواز کی نسبت وہ اس سے بے تکلف تھی اور دل  
 کی باتیں بھی کہہ لیا کرتی۔

"قسمت تو اس بے چاری کی خراب ہوگی جو کل اس گھر میں دلہن بن کے آئے گی۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو، امی نے سنا تو فوراً بدھگولی کا فتویٰ صادر کر دیں گی۔"

"بالکل صحیح کہہ رہی ہوں۔ ہر بات میں اعتراض، ہر چیز میں غرابی ڈھونڈ لیتے ہیں  
 بھائی جان! چلو اپنی بہن کی حد تک تو ٹھیک ہے، اب کسی غیر پر اپنے اعتراضات ٹھونسنے کی کیا  
 نیگ ہے۔ زیر اپنی بہن کے بارے میں بہت حساس ہیں۔ انہوں نے ان کے خیالات سن  
 لئے تو بہت مایوس کریں گے۔ ان کے نزدیک تو ان کی بہن اب تک بیٹی ہے۔ بھائی جان کی  
 طرح نہیں، جنہوں نے مجھے بچپن میں بھی کبھی دوست کے گھر جانے دیا نہ خود کہیں تفریح کے  
 لئے لے کر گئے۔ ایسے حالات میں، میں ان کی ہونے والی بیوی پر ترس نہ کھاؤں تو اور کیا  
 کروں۔ کیا بنے گا بے چاری کا۔"

"فکرت کرو، میرا مشاہدہ کہتا ہے کہ ایسے روز فکری شکاک قسم کے زن مرے ثابت  
 ہوتے ہیں اور یہ جو تم اپنی بھائی کے لئے اتنی ہمدردی دکھا رہی ہو، تب جل کر دہائیاں دے  
 رہی ہوگی۔"

"میں نہیں، میں اس قسم کی مذہب ثابت نہیں ہوں گی۔"

"تم لوگ اس وقت کون سی باتیں چھیڑے بیٹھے ہو۔" ان کی امی تیزی سے اندر داخل  
 ہوئیں۔ غلت ان کے ہر اعزاز سے نمایاں تھی۔

"مہندی لے کر کھانا نہیں ہے کیا؟ شاہ نواز دیکھن میں سب لڑکیوں اور عورتوں کو بٹھارہا  
 ہے تم جاہو تیرے ساتھ گاڑی میں بیٹھ جانا۔ جلدی کرو۔"

"دیکھن..... وہی سیاہ بیٹشوں والی بڑی سی ویٹکین جو بھائی جان کے دوست کی ہے؟"  
 فوزیہ نے کھڑے ہو کر دوپٹہ سنبھالا۔ "ان کا سب پلے تو فوج کی بکتر بند گاڑیوں میں ہم  
 عورتوں کو لے جائیں تاکہ کسی کی نظر نہ پڑے۔"

شاہ نواز اگرچہ اس وقت ساتھ نہیں جا رہا تھا مگر کچھ دیر بعد اپنے والد اور تایا کے ساتھ  
 وہیں پہنچنے والا تھا کیونکہ مہندی کی رسم ادا ہونے کے بعد نکاح کیا جاتا تھا۔ یہ ان کے ہاں کا  
 رواج تھا۔ شادی سے کچھ روز قبل یا پھر مہندی والی رات کو ہی نکاح کا فرض ادا کر دیا جاتا  
 تھا۔

"بیلو....." گاڑی میں بیٹھے ہوئے حق نواز نے سیل فون پر ہیکلے رو میسج کے نام کو  
 حیرت سے دیکھتے ہوئے کانوں سے لگایا۔ وہ یوں کہی فون کیا کرتی تھی، اس لئے اس کا پہلا  
 خیال اس کی ممی کی جانب ہی گیا کہ کہیں ان کی طبیعت خراب نہ ہو گئی ہو۔

”سم شروع ہوئی ہے کیا؟“ دوسری جانب سے ہاں کے خلاف توقع سوال کیا گیا۔  
”ابھی کہاں، ابھی تو روانگی ہو رہی ہے۔“

”وہاں کا جوائے ریس کا رڈ یہ درج ہے، مہندی وہیں ہو رہی ہے یا کسی ہال میں؟“  
”وہیں۔“ اس نے ماں کی موجودگی کی وجہ سے مختصر جواب دیا۔ البتہ لیوں پہ آتی مسکراہٹ اور آنکھوں میں یکا یک پیدا ہوئی چمک نے ان کو بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ ان کی ناگواری بھی ظاہر کر رہی تھی۔

”فحیح ہے، میں بھی رہی ہوں لیکن زیادہ دیر کوئی نہیں۔ سیدہ گومی کے پاس چھوڑا ہے اور رات کو زیادہ دیر ہوگی تو اکیلے ڈرائیو کر کے جانا مشکل ہوگا۔“

”اوکے۔“ اس سے زیادہ وہ کچھ کہ نہ سکا، ورنہ اسے اکیلے آنے سے روکنا چاہتا تھا۔ جانتا تھا روڈ ویس بہت با اعتماد ہے، اس کے گھر کا راستہ بھی خاصا پاروٹی ہے۔ رات کے آخری چہرے تک وہاں ٹریفک رواں دواں رہتی ہے اور یہ بھی کہ اپنے پیشہ وارانہ فرائض ادا کرنے کے لئے لمبا اوقات وہ اس سے بھی زیادہ رات تک اگلی ڈرائیو کرتی ہے لیکن یہاں اس کا اکیلا آنا اس کی امی کو مزید معترض ہونے کا موقع فراہم کر سکتا تھا۔

”کس کا فون تھا؟“ وہ جانتا تھا کہ امی یہ سوال ضرور کریں گی، اس لئے جواب بھی پہلے سے تیار تھا۔

”ایک دوست کا۔“ یہ جواب کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔

”کون سی دوست کا؟“ انہوں نے لفظ ”کون سی“ کو خاصا چننا کر اور معنی خیز بناتے ہوئے کہا۔ حق نواز بڑا لڑا کہہ گیا۔ کوئی جواب نہ دیتے ہوئے اس نے ڈیک میں گلے گیت کا دایم تیز کر دیا۔

☆=====☆

چھوڑ کے گھر سناٹا سہاگن

لوٹ چلی مہمان سہاگن

دہلیزوں کے کھیل نرالے

ہر باہل کے دیکھے بھالے

سوسودہم گمان سہاگن

لوٹ چلی مہمان سہاگن

”سویرا! انکل جی آئے ہیں۔“ بینش کی آواز پہ وہ کسی گھر سے خیال سے چوگی۔

وہی کمرہ تھا۔۔۔ وہی کھڑکی۔۔۔ اور وہی دروازہ۔۔۔

اس کا سادہ سا سرکہ جو کم سامان ہونے کی وجہ سے ہمیشہ کشادہ محسوس ہوا کرتا تھا، آج کچھ کچھ بھرا ہوا تھا۔ مہندی کے بچے تھا، مضائقہ کے ٹوکے، ہار بکھرے۔۔۔ ان سب کو مہمان بچوں سے بچانے کے لئے سب سے محفوظ کمرہ بھی تھا، اس لئے ان کا ڈھیر بیڈ، صوفے اور کارپٹ پہ پڑا ہوا تھا۔ اس نے غیر ارادی طور پہ سر سے ذرا کھٹکتا ہوا سنہرے گوٹے سے سجا سبز اور پیلا چٹری کا دوپٹہ اور اس کے آگے کھینچ لیا۔ بینش نے حیرت سے اسے آدھے چہرے تک آچھل پھیلاتا اور قدرے ذرا سارخ موڑتے ہوئے دیکھا۔ اس کے گھر کا ماحول بہت دوستانہ تھا۔ وہ اور اس کی بیٹیں اپنی لمبا سے زیادہ پایا سے قریب رہی تھیں لیکن سویرا سے چار سالہ دوستی کے دوران اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ اپنے ابو سے کڑائی تھی۔ اس کا سامنا جب بھی سویرا کے ابو سے ہوا، اس نے انہیں بہت مشفق اور نرم خوابا بھر پے نہیں کیا وجہ تھی جو وہ ان کا سامنا ہونے پر گھبرا جاتی تھی۔ بینش نے اس کے ابو کو بھی کبھی اپنی بیٹی سے رکی یا ضرورت کے چند فقرے کہنے کے علاوہ کوئی دوسری بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔ آج شاید پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ انہوں نے اس کے کمرے میں قدم رکھا تھا۔ کم از کم بینش کی موجودگی میں ذہنی بار۔

سویرا سر جھکا کر بیٹھی اپنے ہاتھ مسل رہی تھی۔

”انکل جی! آپ کو سویرا سے کوئی بات کرنی ہے تو میں باہر چلی جاتی ہوں۔“ بینش نے انہیں کافی دیر تک بیٹھنے کے سامنے یوں چپ چاپ بیٹھنے دیکھا تو بول پڑی۔

”نہیں۔“ ان کے ہونٹوں پہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ ابھر کے معدوم ہوئی۔ انہوں نے نظریں اٹھا کر سویرا کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈب رہی تھیں۔ ان کا ہاتھ کپکپاتا ہوا آگے بڑھا اور اس کے سر پہ ٹھہر گیا۔ اس کا سر کچھ اور بھی جھک گیا۔ گود میں دھرے ہاتھوں پہ آنسوؤں کے چند قطرے گرے تھے۔

”جی جی اللہ کی امان میں دیا۔“ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

ان کے جانے کے بعد سویرا نے اپنا سر دوبارہ کھڑکی سے ٹکا دیا۔

”انکل جی بہت اداں لگ رہے تھے۔ تمہارے جانے کا خیال تنگ کر رہا ہوگا۔“  
بینش کی بات کا اس نے کوئی جواب نہ دیا اور گالوں پہ بہتے آنسو اٹھویں سے صاف کر کے دوبارہ نیچے دیکھنے لگی۔ بینش دوبارہ سے پہناؤ کی کپڑوں کی پیٹنگ کرنے لگی۔ وہ پچھلے دونوں سے سویرا کو اس کیفیت میں دیکھ رہی تھی۔

لاکھ جن کر دیکھے پورے  
رہ جانے تھے رہے اور رہے  
اماں کے ارمان، سہاگن  
لوٹ چلی مہمان سہاگن  
”اس کے ابا آئے تھے یہاں؟“

سویرا کی امی نے اندر داخل ہوتے ہوئے پیش سے پوچھا۔  
”جی، سویرا سے ملے آئے تھے۔“

پیش کی بات پہ انہوں نے غور سے اپنی بیٹی کا چہرہ پڑھنا چاہا جو ہر قسم کے تاثرات سے  
عاری تھا۔

”پیش! ایسے سرخ دوپٹہ اپنے ہاتھ میں ہی رکھنا، کہیں کسی کو دھڑکھڑکھتا ہوا نہ  
جانا، تہہ بھاری ذمہ داری ہے۔ ہندی کی رسم کے بعد کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کے پیسے ہی  
لاڑکا یہاں بیچے گا، نکاح پڑھا دیا جائے گا۔ اس وقت اس پیلے جوڑے پہ یہی سرخ دوپٹہ  
اودھا دیا جائے گا۔ یہ بڑا ہرکتوں والا دوپٹہ ہے، میں اس پہ بڑے جیڑی سے دم کروا کے لائی  
تھی، ان شاء اللہ نکاح بھی ساتھ خیریت سے ہوگا اور آگے بھی کوئی بڑی بلا آس پاس نہ پھٹے  
گی۔“

”بہت بھاری دوپٹہ ہے آئی! میں ایسا کرتی ہوں الماری میں رکھ دیتی ہوں۔“  
”چلو، ایسا کرلو۔ ویسے بھی نکاح کے وقت اسے ہمیں لایا جائے گا۔ بس یہ یاد رہے کہ  
نکاح کے وقت یہ سر پہ ہو۔“ وہ جاتے جاتے تاکید کر گئیں۔ پیش مڑ کے الماری میں وہ سرخ  
جھللاتا دوپٹہ رکھ رہی تھی، اس نے سویرا کے ہونٹوں پہ آئی وہ عجیب سی مسکراہٹ نہ دیکھ سکی۔  
ایسی مسکراہٹ جس میں طفرے کے ساتھ ساتھ ایک بھردری بھی تھی۔

مہمانوں کو کھڑا جانا ہے  
اک دن چھوڑ کے در جانا ہے  
رب کے پاس اماں سہاگن  
لوٹ چلی مہمان سہاگن

وہ ایک بار پھر بیچنے لان میں دیکھ رہی تھی، جہاں اس کے خاندان کے تقریباً سب ہی  
لوگ جمع تھے۔ بڑے کریموں پہ بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ لڑکیاں زرق برق  
لباسات میں اٹھلائی۔ گانوں اور ڈانس کی پرنکشن کے بارے میں باتیں کر رہی تھیں۔ بچے

یہاں سے وہاں بھاگتے نظر آرہے تھے۔

کوئی وقت جاتا تھا، جب لڑکے والے یہاں پہنچ جاتے اور اس کے بعد کچھ گھنٹوں  
بعد..... وہ اسے سوپ دی جائے گی جس کی امانت تھی۔

”امانت.....؟ کیا واقعی امانت کو امانت کی طرح سونپا جا رہا ہے؟“ اس نے افسردگی  
سے سوچا۔

اس کی نظر گیٹ کے نزدیک کھڑے اپنے باپ کے چہرے کی جانب مچی، جہاں الیکا کی  
سرت جھٹکے لگی تھی۔ انہوں نے دھڑکڑی، کسی سے بات کرتی بیگم کو آواز دے کر اس طرف  
بلا دیا۔ شاید لڑکے والے آگئے ہوں گے۔

اسنے غوردار فاصلے کی وجہ سے سویرا ان کی آواز تو نہ سن سکی تھی مگر اسے اندازہ تھا کہ  
یقیناً ان کی آواز جو شہ جذبات سے کپکپا رہی ہوگی۔

”نئے سالوں بعد میں آج ابھی کو خوش دیکھ رہی ہوں۔ اللہ میاں جی.....! اگر ان کی  
یہ خوشی میری خوشیوں سے وابستہ ہے تو میری دعا ہے اللہ کے میں ہمیشہ خوش رہوں۔“ پہلی بار  
اس نے اپنی آئندہ زندگی کے حوالے سے ایک خوش آئندہ دعا لگائی۔

پکھ لگے دل کو اچانک سکون سا آگیا۔ وہ کھڑکی کے نزدیک سے اٹھ گئی اور پردہ گرا  
دیا۔

☆=====☆=====☆

”سحرانہ تو بہت اچھا ملا ہے عظمت بی بی! بس دعا کرو کہ لڑکی بعد میں بھی اتنی اچھی  
ثابت ہو، جتنی اب لگ رہی ہے۔ میں نے تو اپنی جانب سے بہت جہان پھلک کے ذہن  
ڈھونڈی ہے۔ پڑھی لکھی بھی ہے اور پردہ، نماز روزے کی پابندی بھی۔ خوبصورت بھی ہے اور  
خوب سیرت بھی۔ آج کل کی لڑکیوں والی تیز طراری نظر نہیں آتی۔“ حق نواز کی امی نسیم بیگم  
اپنی کچی عزیزہ سے بات کر رہی تھیں جو مشکل و صورت سے ہی خاصی جہانیدہ لگ رہی تھیں۔  
ان کی بات سن کر بڑے مدبرانہ انداز میں مسکرائیں۔

”نظر نہیں آتی یا بے نہیں؟ بہت فرق ہے دونوں باتوں میں نسیم! اور یہ بات تو سب  
پہلے بھی کہتی تھی۔ اب بھی کہتی ہوں کہ لوگوں کو پرکھنے میں تم بالکل کوہی ہو۔ جہاں اتنا وقت  
لگایا ہو کہ ڈھونڈنے میں، وہاں کچھ عرصہ اور بھر جاتی۔ میں عمرہ کر کے لوٹ ہی آتی پھر دیکھ  
بھال کے جانچ پڑھ کے بات طے کرتے۔ پہلے تو کوئی بات تم نے میرے مشورے کے بغیر  
نہیں کی تھی۔ فوہیہ کے معاملے میں بھی مجھے آگے آگے رکھا اور اب.....“ ان کے انداز میں

گھٹا۔

”بس مجھے ڈرتھا کہ اتنی اچھی لڑکی ہاتھ سے نکل نہ جائے۔ یوں بھی عظمت لی بی اب تقسیم ایسی بیوقوف بھی نہیں رہی۔ تمہاری صحبت کا اثر ہے۔“ انہوں نے اتر کر گردن ہلائی۔  
”آؤ تمہیں اپنے سوسہاٹے سے ملواتی ہوں۔ بہت سیدھے سادے شریف لوگ ہیں، پیارے بھی ہیں لیکن نہ آؤ گے نہ غرہ۔ ہاپ نہ بھی نظر ملا کے بات نہیں کی۔ اتنا افسار ہے اس شخص میں۔ وہ دیکھو کھینچ لٹھلٹھل کے ساتھ کھڑا ہوا ہے، سفید لباس میں۔“  
”ہاں دیکھنے میں تو بھلا آدمی لگ رہا ہے۔ بھائی کوئی نہیں ہے لڑکی کا؟“  
”نہیں، بس یہ تین بھینس ہیں۔ وہ بڑی والی ہے۔ اس کا میاں تمہارے بیٹے کے ساتھ بیٹھا ہے۔ بہت کھاتے پیتے لوگ ہیں۔“

”میاں تو اس کا عمر میں خاصا بڑا لگ رہا ہے اور یہ خود میں پینتیس سے زیادہ کی نہیں۔ بڑی والی کے لئے یہ بڑھا کیوں دھوڑا ان لوگوں نے؟“ عظمت لی بی کی جانب سے یہ پہلا اعتراض آیا جس کا فوری جواب تقسیم بیگم نے منہ بند پڑا۔ یہ سوال کئی بار ان کے ذہن میں بھی کلبلا یا مگر وہ دبا گئیں، یہ سوچ کر کہ وہ لوگ برآمدان جائیں۔  
”وہ دوسری والی ہے جس نے پچھو گود میں اٹھا رکھا ہے اور وہ جو اس طرف کھڑی سودی والے کو بدایات دے رہی ہے، وہ لڑکی کی ماں ہے۔ بڑی ہنس کھ کھرت ہے۔“  
”دور دور سے ہی تعارف کراؤ گی۔ بسی لٹو تو سہی۔ ہم بھی تو دیکھیں، کیا سنا پڑن دکھایا ہے تقسیم بیگم نے اس بار۔“ ان کے تیر سے صاف ظاہر تھا کہ انہیں اپنی اس عزیزہ کی ہم دفراست پہ خاص مہرور نہ تھا۔

”بھن! یہ عظمت لی بی۔ میری چچا زاد، میری سہیلی، میری بہن۔ بہت سے رشتے ہیں ان سے میرے۔“ انہوں نے نزدیک جا کے سویا کی امی سے ان کا تعارف کرایا۔  
”اور یہ ذکیہ بہن ہیں، ہماری ہونے والی بہن، سویا کی والدہ۔“  
”ذکیہ!“ عظمت لی بی جو ان کی صورت نزدیک سے دیکھ کر ہی ٹھٹھکی تھیں، نام سن کے چونک گئیں اور بخور ان کا چہرہ دیکھنے لگیں جیسے کچھ یاد کر رہی ہوں۔

☆=====☆

”اس دن تو سمجھو، آصف بھائی جان کے ہاتھوں تیرا نقل ہی ہوا جانا تھا۔“  
زہون کچھ دنوں بعد لی بی تو وہی بات یاد کر کے اسے ڈرنا لگی۔  
”ہاں، اس دن تو شامت آتے آتے رہ گئی۔ وہ تو میرا دماغ کام کر گیا۔ مجھ پڑا

ٹک نہیں گیا آصف کا۔ الٹا میری دھاک بیٹھ گئی کہ کیا لڑکی ہے، بچھڑنے والے کو حرو چکھا دیا۔“

”ہاں ایسے معاملوں میں دماغ تو خوب چل رہا تھا۔ ویسے اس دن ہوا کیا تھا، اتنی شوقی کیوں ہو رہی تھی اس لڑکے کے ساتھ؟“

”پتہ نہیں کیا ہوا تھا وہ لڑکا بھی تو۔۔۔۔۔۔“ حیرا کے لبوں پہ اس کی لمبے دار ہنسی یاد کر کے مسکراہٹ دوڑنے لگی۔ زہون کے تن بدن میں اس مسکراہٹ نے آگ لگا دی۔ اسے ایسے بہت سے واقعات یاد آئے گئے۔ جب حیرا نے اس کی اچھی بھلی شروع ہوئی تو اسٹوری میں اپنی اسٹوری دے کر کہانی کا رخ اپنی جانب موڑ لیا تھا۔ حالانکہ اس کی بھنی اچھی بھلی اپنے چہرے پر ڈاؤن آصف سے ملے ہوئے تھی جسے وہ پسند بھی کرتی تھی۔ بھلی پھلکی بچھیر چھاڑے آگے وہ کبھی نہ پڑتی تھی مگر زہون کا کام ضرور خراب کر جاتی۔

”گلتا ہے حیرا دل اس لڑکے پہ آگیا ہے۔ اس ہالی عمر والے لڑکے پہ۔۔۔۔۔۔ سو ہوتا بھی رنج کے ہے۔ آصف بھائی جان تو اس کے آگے کچھ بھی نہیں۔“

”ابو کیوں کچھ نہیں۔“ حیرا ابرامان لگی۔ ”کہاں آصف، کہاں یہ لٹوڑا۔ وہ تو میں ایسے ہی دل لگی کر رہی تھی، ورنہ جو آصف میرے لئے ہیں، وہ کوئی اور نہیں۔ زندگی تو مجھے ان کے ساتھ ہی گزارنی ہے۔ کسی فضول سی بات کے پیچھے میں ان کو خفا نہیں کر سکتی۔“

”اچھا۔۔۔۔۔۔ میں تو آئی تھی تجھے لینے۔۔۔۔۔۔ ابھی آتے ہوئے میں نے اس دکان میں اسی لڑکے کو دیکھا تھا جسے سارے مہرور مہرور کہتے ہیں۔ میری منت کر کے کہہ رہا تھا کہ ایک بار تجھے اس دکان پہ لے آؤں۔“

”نہ بابا۔۔۔۔۔۔ حیرا نے کانوں کو ہاتھ لگا لئے۔ ”میری تو بہ۔۔۔۔۔۔ میری طرف سے صاف جواب ہے۔ دماغ دور ایسی دل لگی اور بلی مذاق جس کی وجہ سے زندگی عذاب میں پڑ جائے، اس دن کی گھٹلی کے بعد اب مجھے عقل آگئی ہے۔“

”ہونہ، تو سوچو یہ کھاکے بلی بیج کو بھلی۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے اٹھی۔ محن میں وہی معمول کی بحث جاری تھی۔ دادی کو کھانسی ہو رہی تھی اور ذکیہ، بھلی پہ چلا رہی تھی۔

”ذہیب ہڈی، اٹھ جا، دادی کو پینٹی گولیاں لا دے۔ کھانسی کا شرمت ختم ہوا پڑا ہے، یہاں سے تو لے کر انہیں۔ میرے سر میں مہندی چھپی ہے، سر دھو کے بازار گھٹوں کی تو دو لاکھ لاکھ کی۔ جب تک بے چاری پینٹی گولیاں ہی چوس لے گی، ورنہ کھانسی کھانسی کے اس کا انگریز چر لے جائے گا۔“

”ای امیر! میں نہیں کر رہا گری میں لکھنے کو، آئی صوب ہے۔ دوپہر کے بعد۔۔۔“  
”دوپہر کے بعد تو میں بھی دوائے آؤں گی۔“

”اری ذکیہ! فرح سے کہہ دے۔“ دادی نے کھاتے ہوئے کہا۔

”وہ سوراہا مال! اور یہ بڑ حرام دے دے اندر باہر کے سوچکر لکھتی ہے، جب میں کسی کام کا ہوں تو اسے موت آتی ہے۔ جاتی ہے یا اٹھاؤں چل۔“

زحون نے چلے دل کے ساتھ یہ منظر دیکھا اور بغیر کسی سے مخاطب ہوئے وہاں سے نکلی گئی۔ اس کا رخ سیدھا صادق کی دکان کی جانب تھا۔

”وہ تو نہیں آ رہی، نہ ہی اپنے آئے والی ہے۔ بہت حیران لڑکی ہے۔“ ہیرو کے سامنے کھڑی وہ چلے دل کے ساتھ چھپوٹے اڑا رہی تھی۔ اس کا دوست غلی بھی پاس کھڑا تھا۔

”وہ تمہارے ساتھ مذاق نہیں کر رہی تھی بلکہ مذاق اڑا رہی تھی۔ تو یہ تو بہ۔۔۔ اے بڑے بول یک رہی تھی کہ میرا قول دل کیا۔ بڑا ہی غرہ ہے اس میں۔ اگر ذرا شکل اچھی

ہوتی جب یہ نہیں کیا حال ہوتا۔ کہہ رہی تھی، اس وہم کے دکان دار کو کہنا، اپنی اوقات میں رہے۔ اس جیسے تو ہم گھر پہ ملازم بھی نہ رکھیں۔ نہ منہ نہ منہ، جن پہاڑ اٹھتا۔“

”خود بڑی حور پری ہے۔“ ہیرو کو تو غم و غصے سے برا حال تھا، البتہ اس کے دوست غلی نے دانت کچکپکاتے ہوئے کہا۔

”نہ ایک ہی اس کی چھوٹی دکان تھی، جہاں اس نے سنوکر نیل اور دو چار اور گیمز رکھے ہوئے تھے۔ اب تو ایک وی ای آر بھی رکھ لیا تھا۔ فلوں کے شوقین اسی سینما گھر میں ٹکٹ خرید کے اپنا چسکہ پورا کیا کرتے۔ محلے کے چند سرکردہ افراد

نے ایک آدھ ہاں اس سینما گھر کے خلاف آواز مچی اٹھائی جو یہاں کے کچے جنوں کو بخراب الاخلاق لہجے میں دیکھا کر گراہ کر ہاتھ مار گئی بیٹھ صاف بچ لکھا۔ بدکردار اور بد زبان ہونے کے

ساتھ ساتھ وہ ایک کانیاں شخص بھی تھا۔ اب بھی اس کی باتیں چلتی پہنل کا کام کر رہی تھیں۔

”اچھا سمجھ رہے ہو یا راز دار! سی لوہڑ یا کھڑے کھڑے دس لوگوں کے سامنے بھرے بازار میں تجھے تھوڑا سا جلی گئی جب کہ غلطی بھی تیری نہیں تھی۔ تو کوئی اس کے پیچھے گیا تھا

چھپڑنے۔ ذرا اکڑ دیکھو۔ نکلے نکلے کی بات سناگئی، یا نہیں؟“

اس دن کا تھوڑا سا اب تک نہیں بھولا تھا۔ غلی اور زحون کی لگائی بھجائی۔ وہ پوری طرح سے بھر گیا۔

”مجھے معمولی دکاندار کہا ہے اس نے؟ میں تو صادق بھائی کی تیاری کا خیال کر کے یہاں گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ جاتا ہوں، ورنہ میں اور دکاندار۔۔۔ آج تو آپ ہی صرف اس کی خاطر

تھا اور اس کی یہ صفت۔۔۔ لڑکی ہے اس لئے لگا کر رہا ہوں۔“

”ضرورت کیا ہے لگا کر نہ کر، بے عزتی، بے عزتی ہے۔ چاہے کوئی بھی کرے۔ لڑکی کرے تب تو دودھی بے عزتی ہے۔ بدلہ لینا یہ مرد کی شان ہے۔“ غلی نے اسکا کیا۔

”محل چھوڑ دو، اس وقت آؤت ہو رہا ہے۔ دفع کر اس دکان کو شوکر اور میری دکان پو آ۔۔۔ کیا گرا کر مرقم ہے اور کیا بڑے مگر مگر ہیں۔ سواد آ جائے گا۔ اس کے کہنے پہ وہ دکان بند کرنے لگا۔“

”وہ دیکھ، اسی چٹانے کی چھوٹی بہن پھلجی۔“ غلی نے فوج کا دے کر اسے متوجہ کیا۔ سامنے سنسان غلی میں سے تیلی بے زاری شکل بنائے آ رہی تھی۔

”اور جھسات سالوں بعد اس نے یہ نہیں کتنے لٹا ڈالے ہیں۔ بڑی دلی سے دو ہاتھ آگے ہی ہوگی۔“ اس نے زہر خنجر سے کہتے ہوئے سر جھکا اور شکر کانا لگانے لگا۔

”دکان بند ہوگئی ہے؟ میں نے کوئی اس لکھی تھی۔“ وہ نزدیک آگے ماموسی سے بولی۔ تب دونوں دکان میں چھوڑ کے تیسری دکان تک چاکے تھے جو غلی کی تھی۔ یہاں دوپہر کے وقت اکثر دکانیں گھنٹہ بڑھ گھنٹہ کے لئے بند ہو جایا کرتیں۔

”کوئی دکان گلیاں، بچی یا کچی؟“ غلی نے اپنے پیلے دانت لگاتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں۔۔۔“

”وہاں تو ختم ہو چکی ہیں۔ آؤ میں یہاں سے دے دیتا ہوں۔“ اس نے اپنے ساتھ کھڑے دوست کو آٹھ ماری جو نہ بھینے کے عالم میں کھڑا کرکھڑا سے دیکھ رہا تھا۔ بلی نے چند سینکڑے کے سوچا۔ مگر وہاں جاتی تو ای بھلی گلی والے کو کھسکے تک بھیج دیتی۔ ایک اور

پھر۔۔۔ اس سے بچنے کی خاطر دو ٹی کے ساتھ اس کی دکان میں چلی گئی۔

☆=====☆

”ذکیہ! کہیں تم تو بروہالہ کے رہنے والے تو نہیں ہو؟“ چند منٹ تک تو عفت بی بی چپ چاپ کھڑی انہیں دیکھتی رہیں جیسے اپنی یادداشت کھکاں رہی ہوں پھر پورے دوقتی سے سوال کیا تھا۔ ذکیہ کا رنگ تھو گیا۔

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ تم تو ادرہ۔۔۔ لاہور سے ہی ہیں۔“ دائیں بائیں دیکھتی وہ بڑی بے چارگی سے کہہ رہی تھیں۔ اس بات پر عفت بی بی کا شک یقین میں تبدیل ہو گیا۔

”نہیں، آج سے آٹھ سو سال پہلے تم لوگ بروہالہ میں رہتے تھے۔“

”نہیں عفت بی بی! انہیں غلط فہمی ہوگئی۔“ نسیم بیگم نے مداخلت کی۔



”ان کے یہاں عابد چودھری تو اہم کے بڑے مشہور کپڑے کے تاجر ہیں۔ شاہ عالم مارکیٹ میں ہول سیل کی دکانیں ہیں۔“

”عابد چودھری..... یہاں یہی نام تھا..... یہ تو وہی ہیں۔ پہلے یہ یورپ والہ میں رہتے تھے اور یہ عابد چودھری کویت میں ہوتا تھا۔“

”ہاں یہ تو بتایا تھا بہن نے ایک بار کہ ان کے یہاں نے دس بارہ سال کویت میں لگائے ہیں۔“ تنہیم بیگم بھی چوکیں۔ ان کے خیال میں عظمت بی بی جن کی یادداشت قابلِ رشک ہے، اگر ان کی بات درست ہے تو سویرا کی امی کیوں کر رہی ہیں۔

”ہاں اور پھر وہاں سے سب کام ہندو چھوڑ کے یہاں بھاگے بھاگے کیوں آئے، یہ نہیں بتایا؟“ وہ چپک کے بولیں۔

”یہ وہی ذکیہ ہیں جن کو میں جانتی تھی۔ یا تو یہ مجھے بھول چکی ہیں یا بھول جانے کی اداکاری کر رہی ہیں۔ بہر حال اگر بھول رہی ہیں تو ذکیہ صاحبہ میں یاد دلا دوں کہ یورپ والہ میں جس محلے میں آپ رہا کرتی تھیں، وہ میرے بھائی بھائی کا گھر بھی تھا۔ ان کے آپ لوگوں سے اچھے مراسم تھے کیونکہ اس محلے کے چند متول گھرانوں میں سے ایک آپ کا گھرانہ تھا۔ آپ کے شوہر کویت میں اچھا خاصا کارہے تھے۔“ ان کی آواز اتنی بلند اور انداز اس قدر جارحانہ تھا کہ آس پاس اس گھر میں سب ہی مشغول رہ گئے تھے۔ کئی خواتین تو جمع ہو چکی تھیں تاکہ اصل صورت حال کا اندازہ ہو سکے۔

”آپ کی تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ہوا کرتا تھا، ایک بوڑھی ساس تھی۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟“

ذکیہ کرنے کے سے انداز میں نزو کی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ ان کا چہرہ لٹھے کی مانند سفید ہو رہا تھا۔ ان کی پٹلی جی اور ایک قریبی عزیزہ کو سہارا دینے قریب چلی آئیں۔ ان کے شوہر کوکری نے اس جانب متوجہ کیا تو وہ بھی سست قدم اٹھاتے اس طرف بڑھنے لگے۔

”اب شاید میں بھی یاد آ جاؤں۔ میں، عظمت بی بی، اپنے بھائی منصور اور بھائی زینا کے پاس انہی دنوں رہنے کے لئے آئی ہوئی تھی۔“ ”ان ہی“ دونوں پہ وہ بہت زور دے کر بولیں۔ ذکیہ نے اپنی آنکھیں زور سے سچھ لیں۔

”میرا بیٹا پیدا ہونے والا تھا، دو ڈھائی مہینے تک وہاں رکی تھی میں، اس لئے آپ..... آپ کے ساتھ ہونے والا حادثہ..... آپ کا وہاں سے جانا اور پھر آپ کے جانے کے بعد کے بھی تمام حالات و واقعات مجھے خوب اچھی طرح یاد ہیں۔“

”کیسے واقعات، کیا ہوا تھا؟ کیوں چھوڑا انہوں نے اپنا پرانا شہر؟“ اب تو تنہیم بیگم مجھ جس تھیں۔

”کیسی باتیں کر رہی ہیں امی آپ؟“ حق نواز کو بہت عجیب سا محسوس ہوا۔ یوں محسوس لگا کہ یہ سب ڈکس کرنا۔ اگرچہ ہونے والی بھائی کے والدین کے تاثرات اور دیگر رشتے داروں کی دہلی دہلی سرگوشیاں ظاہر کر رہی تھیں کہ وہ لوگ واقعی کچھ چھپانا چاہ رہے ہیں۔ اصل بات وہ بھی جانتا چاہتا تھا کہ چھپائی جانے والی باتیں کتنی بھی ہو سکتی ہیں لیکن دوسری طرف اسے سامنے بیٹھی خاتون کی دیگرگوں حالت پر اس آزمائش جس کی بیٹی کے لئے وہ کل بارات لانے والے تھے۔ اب ان پر مردہ چہروں میں امید کی ایک رقی نظر آ رہی تھی۔

”ہوسکتا ہے عظمت آج کو کوئی غلطی ہوئی ہو۔ یہ بھی تو دیکھیں کہ وہ جن خاتون کا ذکر کر رہی ہیں، ان کی تین بیٹیاں اور ایک بیٹا بتا رہی ہیں جب کہ ذکیہ آجی کا تو کوئی بیٹا ہی نہیں۔“ اس نے بات سنبھالنا چاہی۔

”اب نہیں ہوگا پہلے تو تھا اور ان سے پوچھیں کہ کہاں گیا ان کا وہ قاتل بیٹا۔“

”بہن جی.....“ سویرا کے ابوالکے بڑے اور سر جھکا کے اپنے بڑے ہوئے ہاتھ ان کے آگے کر دیئے۔

”قاتل بیٹا..... واقعی؟“ ہر جانب چہ گویاں شروع ہو گئیں۔ اب سب ہی عظمت بی بی کی تفصیل سے جاننے کے خواہش مند تھے اور وہ بڑی شان سے گردن اٹھاتے اپنے سامنے دو مجبور و بے بس انسانوں کی بے چارگی کا حوالہ دے رہی تھیں جن کی اس وقت شدت سے یہ چاہ ہوئی کہ اس عورت کی زبان ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے یا کھلنے سے پہلے وہ دونوں زمین میں سنا جائیں۔

اس جھوم سے ذرافا صلے پر کڑی رو میسر نے یہ منظر دیکھ کر تاسف سے دیکھا۔

”اگر انہوں نے اپنے بیٹے کی کسی مجرمانہ حرکت کو چھپا کر اپنی بیٹی کا گھر بسانا چاہا ہے تو ایسا کیا برا کیا ہے۔ بیٹے کی غلط حرکت کی سزا ہے، قصور کوئی نہ ملے، یہی سوچا ہوگا انہوں نے اور اگر یہ خاتون یہ راز جانتی ہیں تو یوں جمع کر انکشاف کرنے سے نہیں کیا ملے گا۔ پتہ نہیں ہمارے معاشرے میں ایک فرد کے گناہ کی سزا اس کے سارے خاندان کو کیوں دی جاتی ہے۔“ وہ چپ چاپ سوچ رہی تھی۔ اس نے زیادہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی جن پہ بندھے باتوں کی انتہاء آخر نہ کرے، ان سخت دلوں کو وہ کیسے اس نے رہنما نہ حرکت سے باز رکھ سکتی تھی۔

یہ کس کے ہیں تھے.....؟ کون وہاں ہاں دے کر رو رہا تھا؟

اس نے ذہن پہ زور ڈالے ہوئے سوچا اور وہیں کھڑے کھڑے سب پہ نظر دوڑا لی۔

وہ نیچے کی طرف آتی میز پر کھڑی تھی۔ ابھی اس نے دو ہی زینے طے کئے تھے۔

اس کے سر پہ گونے کے کام سے بوجھل ہنز چادر کا سا یہ جس کے چاروں کوئے، اس کی

بہن میرا، دوست بیٹن اور کزنز روا، مریم اور روشی نے تمام رکے تھے۔ وہ چاروں بھی کم کم

چھتری کھڑی تھیں۔

گھٹنوں کے تل نیچے زمین پر، سر جھکائے بیٹھا وہ شخص جس کی سفید داڑھی آنسوؤں

سے ٹپکی ہو رہی تھی، وہ اس کا باپ تھا۔

یہ بیٹن اس کے بھی نہیں تھے۔ وہ بیٹن کرتا ضرور تھا، سالوں سے کر رہا تھا مگر یہ بیٹن سنائی

نہیں دیئے جانے والے تھے۔ اس کی ایک نگاہ ہی سوئے بیٹن پہ بھاری ہوتی تھی۔ وہ ایک نگاہ

جو وہ سویرا پڑنے کے بعد اوپر آسمان کی جانب کرتا تھا۔

اس کی بہن سمیرا زرد چہرہ لئے اپنے عمر رسیدہ مگر نازک حواض شوہر کی جانب سبھی ہوئی

نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ یہ بیٹن اس کے بھی نہیں تھے۔ ہاں اندریہ اندر وہ بیٹن ڈالنے کی

تیار ضرور کر رہی ہوگی..... جو کچھ ابھی ہوا تھا، اس کے بعد جو کچھ ہوگا، وہ اسے صاف نظر

آ رہا تھا۔

اس کی ماں..... ہاں یہ عورت جس کے ہاتھ ابھی تک عظمت لی لی کے آگے بندھے

ہوئے ہیں۔ اس بات سے بے ناز کہ جس کو بات کہنے سے روکنے کے لئے وہ یہ ہاتھ جوڑ

رہی ہے، وہ بات کب کی کہی جا چکی۔ وہ تو اپنے سامنے کھڑی اس مہمان عورت کی سفاکی پہ

یوں حیرت زدہ ہوئی کہ اپنے بندھے ہاتھ نیچے کرنا بھی محسوس ہوئی۔ البتہ اس کی آنکھوں کو اپنا

آپ بچا کرنا خوب یاد رہا۔

”ہاں شاید یہ بیٹن اس کے ہیں، میری ماں کے۔“ اسے یاد آتی گئی۔

”لیکن یہ بیٹن..... ابھی تو میری ماں خاموش ہے، اس کے لب بختی سے ایک دوسرے

میں پیوست ہو کے اپنی رگت تک کھور ہے ہیں پھر یہ بیٹن۔ یہ کب۔“

اس نے ذہن پہ زور ڈالا تو سینہ پیٹ پیٹ کر، بال بوج بوج کر بین ڈالتی ماں بچکے

ساتھ اور بہت کچھ یاد آ گیا۔ وہ سب کچھ جو وہ کبھی یاد نہیں کرنا چاہتی تھی۔

☆=====☆

”ذکیہ! گھنٹہ ہونے والا ہے، یہ بتا اب تک نہیں لوٹی۔ مجھے تو فکر ہو رہی ہے۔“ داوی

”ان کے صاحبزادے نے پندرہ سال کی عمر میں قتل کیا تھا، اپنے ہی ایک محلے دار

لڑکے کا۔ اب یہ بیٹن وہ ابھی تک جیل میں مڑ رہا ہے یا مگر پک گیا ہے اور ان کی وہ لڑکی جس

کی وجہ سے قتل ہوا ہے، وہ بھی بچہ نہیں..... ارے..... وہ بات کرتے کرتے اچھل پڑیں۔

”بھیکس جی، ہاں ہمارے چھوٹے بھائی سے غلطی ہوئی۔ ہم نے مانا۔“ سویرا کی بڑی

بہن آگے بڑھی۔

”آپ کو یہاں رشتہ نہیں کرنا، بے شک واپس چلے جائیں۔ یوں تماشا بنانے کی

ضرورت نہیں۔“ اس کے تہہ خداسے بکڑے ہوئے تھے۔

”اے لڑکی! افسانہ تو ہم شریف لوگوں کا بنانے چلی تھی۔ وہ تو بھلے وقت میں مجھے یاد

آ گیا کہ تین لڑکیوں میں وہ سب سے چھوٹی والی تھی اور یہ لڑکی میری بیٹن ابھی انجانے میں

بہو بنانے چلی تھی، وہ بھی سب سے چھوٹی والی ہے۔ میں تو سب کو خبردار کر کے جاؤں گی۔

کہیں تم ہمارے بعد کسی اور کو بیوقوف بنادلو۔“ وہ سڑکے سب کو اعلان کرنے والے انداز

میں مخاطب کرنے لگیں۔

”ان کے بچے نے جس لڑکے کو قتل کیا تھا، وہ اصل میں تھا ہی مارے جانے کے قابل۔

ذیل نے ایک چھوٹی سی نو سو سال کی بیٹی سے زیادتی کی تھی اور وہ بیٹی ان ہی کی تھی۔ ان کی

سب سے چھوٹی بیٹی۔“

بالآخر انہوں نے دھما کر ہی ڈالا۔

عظمت لی لی نے گویا سب کے سروں پہ دم چھوڑ دیا تھا۔

لیکن بیٹن..... ہم بیٹن کے بعد تو دھماکا ہوتا ہے۔

کھرام بچ جاتا ہے۔ ہر جانب بھگدڑ مچ جاتی ہے جب کہ یہاں ایسا کچھ نہیں تھا۔

اس کے برعکس یہاں موجود تمام انوس کو پیسے کسی نے جادو کی چھڑی گھما کے پتھر کا کر دیا

تھا۔

ہر شخص..... ہر منظر..... ہر چیز..... سب کچھ ساکت تھا۔ بس ایک چیز تھی جس کی آواز

بہت تیز تھی۔

یہ دل تھا۔ سویرا کا دل۔ جو یوں دھڑک رہا تھا گویا پسلیاں توڑ کر ابھی باہر آ جائے

گا۔ ہر جانب ایک گہری خاموشی ہونے کے باوجود وہ واحد تھی جس کے ارد گرد قیامت کا شور

تھا۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں..... دھڑ دھڑ..... دھک دھک..... ہر قسم کا شور بھا

تھا۔ کہیں دور سے بہت مانوس سے بیٹن بھی سنائی دے رہے تھے۔

”میری دکان..... خالہ میں نے آج تو دکان کھولی ہی نہیں۔ مڑی گیا ہوا تھا۔ اہا کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ میرا مای کا لڑا کئی دن سے بیٹہ رہا تھا لیکن آج وہ بھی واپس اپنے شہر چلا گیا ہے۔ اسی کو لاری والے اڑے چھوڑ کے آ رہا ہوں۔ طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی دچارے کی۔ شاید تب چڑھ گئی ہو۔ مری بھی تو اصر کر کے۔“

”ہائے ہائے۔“ غیر میری بلی کدھر گئی۔“ اس کا طویل بیان سننے کے دوران ہی وہ دو بڑھتیے پر مار کے رونے لگی۔

”آلے دوالے (اوجھر اوجھر) کدھر بھی نہیں ہے۔ کسی سبیلی کے گھر نہیں گئی۔ کسی نے اسے گلی میں آتے جاتے، کھیلے نہیں دیکھا۔ جیری دکان بھی بند ہی تو ہو گئی کدھر؟“

آس پاس کے کواڑ اس کی فرادوں پر کھلے گئے۔ عموماً اس وقت مرد گھر نہیں ہوتے لیکن جو بھی چند ایک تھے، آس پاس کی گلیوں میں سے اسے ڈھونڈنے لگے۔

عورتیں انہی سے کہنے لگیں کہ کدھر لے گئیں۔ کچھ بچے بھاگ کر اس کے گھر بلی کے نہ لٹنے کی اطلاع دینے دوڑے تو چند ایک سیانے لڑکے سائیکل کے گرد دوسرے بھٹکی کی دکانوں پر چڑھ کر نہ چلے گئے کہ شاید بلی وہاں ٹھپھی کو لپاس لے گئی ہو۔

”اگر وہ درگزی بھی ہوتی تو کوئی سانگھو نہیں ٹپ (ٹپ) گئی ہوگی، اوجھر پور والہ میں..... اسی بھٹکی کی دکان پر گئی ہوئی اور پھر بھی ڈیڑھ گھنٹہ تو نہیں لگتا، واپس آئے میں ہائے میری بلی..... راہ بھول کے کہیں نہ گھر لگ گئی..... یا پھر کوئی مر جانا پک (اٹھا) کے لے گیا۔“

مجھد میں اعلان ہونے لگا۔

دادی بھی اپنی کانپتی گھر سے نکل آئی اور ذکیہ کے رونے سننے میں اس سے بڑھ کے اس کا ساتھ دینے لگی۔ اوجھر بلی کی پچوہ بھی باور اور آصف بھی فون پر خبر ملتے ہی دوڑے چلے آئے۔ ایک گھنٹہ مزید گزر گیا۔ جتنے لوگ اسے ڈھونڈنے نکلے تھے۔ ایک ایک کر کے نہ لگائے واپس لوٹنے لگے۔ بھٹکی عورتیں اپنے بچوں کو ڈراوے دینے لگیں۔

”دیکھا..... اور لنگھو پھروں کو باہر۔“

یہاں بیٹھے دس دن میں ایک آدھ واقعہ ایسا ہو جاتا تھا۔ کوئی نہ کوئی بچہ کھو جاتا پھر مجھد میں اعلان ہوتا اور سب بمسائے مل کے ڈھونڈ رہے ہوتے لیکن آج کے واقعہ میں سبھی اس لئے زیادہ محسوس ہو رہی تھی کہ ایک تو وہ بچہ کدھر ہوئے تھے، کوئی دو ڈھائی سال کا، کوئی چار باج سال کا..... حد سے حد کوئی چھ سال کا۔ زیادہ تر تین سال کی عمر کے بچے ہوتے۔ دنیا بھر کے شوق میں دو تین گلیاں پرے نکل جاتے اور پھر رات بھول جاتے۔ روتے ہوئے

نے کوئی چٹھی ہار کھا تو ذکیہ تنگ آ گئی۔

”اوہو! اناں! کھیلنے لگی ہوگی۔ ہے تو بچی نا۔ آپ تب تک یہ شہد چوس لو، آرام آجائے گا کھانسی کو۔“

”مرن جی! اس اپنی دوادوار کو نہیں رو رہی۔“ وہ جھگڑ گئیں۔

”لڑکی اب تک گھر نہیں لوٹی، اس کی گھر کر رہی ہوں۔“ ٹوہنسی ماں ہے آرام سے بیٹے پر ہنسی ہوئی ہے اور اتنی دوادوار کو کون باہر کھل رہا ہوگا؟

”کسی سبیلی کے گھر کس گئی ہوگی۔“ وہاں بے ٹھری کا وہی عالم تھا۔ اب تو عجیب سے بچے سے باریک نگہی بھی نکال لی تھی مگر سے جو میں نکالنے کے لئے۔

”اب اٹھ ہی گئی ہے تو کتنی رکھ رکھتے اور آڑی کوڑی (آس پاس) جھانکی مار۔ کدھر ہے نہائی۔“

ماس کے سسل واہیلے سے وہ تنگ آ گئی اور چپل تھنٹھن گلی میں نکل گئی۔

واپس آنے کے دو تین گھروں کے دروازے کھٹکھٹانے پر بھی اسے بلی نہ ملی تو وہ بھی تیش میں مبتلا ہو گئی۔ حالانکہ قطعاً وہ خاصی لاچار وادھورت تھی۔ اسے گرمیوں کی لمبی دوپہروں میں دیر تک سونے کی عادت تھی اور میرا، بلی دوپہروں سونے کی چور..... ان کی کھٹ پٹ اور غور شرابے سے اس کی نیند خراب نہ ہو اس لئے وہ خوشی نہیں سمجھتیوں کے گھر جا کے کھیلنے کی اجازت دے دیا کرتی تھی اور ایسا بھی بلی ہوا تھا کہ بلی بغیر بتائے گھر سے نکلی اور اپنی دیر تک باہر رہی ہو۔

بظاہر کچھ بھی غیر معمولی نہیں تھا مگر کوئی احساس تھا جو معمول سے ہٹ کر اسے گھبراہٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔ اس کے دل کو کسی انہونی کا ڈر سا لگ رہا تھا۔ ابھی یہ ڈر، یہ واہر..... مکمل کے اس کے سامنے واضح نہ ہو رہا تھا۔ صرف ایک بے چینی اور اضطراب کی صورت اسے گھیر رہا تھا۔

”ایک تو یہ اہاں..... نہ خود آرام سے بیٹھتی ہے نہ کسی دوسرے کو بچھن لینے دیتی ہے۔ بیٹھے بٹھائے وہم لگا دیا ہے۔“ کچھ اور نہ سوچا تو بے چیر کی بلی کی طرح ساری گلی میں بیٹی کو ڈھونڈتے ہوئے وہ ماس کو کوٹنے لگی۔

”وہ صادق، بلی تیری بلی (دکان) پر آئی تھی..... کچھ پتا ہے پھر کس طرف گئی تھی؟“

گلی کا موڑ مڑنے سے پہلے ہی اسے صادق اس طرف آ دکھائی دیا تو وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھی تھی۔

سانے زمین پر اوندھی گری..... وہ پہلی ہی تھی کمری نہیں تھی، صرف بے ہوش تھی۔  
وہ تو لاش نہیں تھی مگر اس پر ایک نظر ڈالتے ہی اس کا پندرہ سالہ بھائی کھڑے کھڑے  
ایک لاش میں تبدیل ہو گیا۔

ان چار دنوں میں اس گھرانے پہ کیا کیا کچھ نہ گزر چکا تھا۔ ان کی سب سے چھوٹی بیٹی نو

”نلی کی دکان..... وہ تو بند ہے۔“

سال کی محصور بنی کسی درمے کی ہوں کا نشانہ بننے کے بعد نازک حالت میں ہسپتال میں داخل تھی۔

ان کا جواس سال بیتا..... فرخ..... جس نے ابھی جوانی کی پہلی بھاری دھجک سے نہ دیکھی تھی، اپنی بہن کو اس اوجڑی حالت میں دیکھنے کے بعد اپنے ہوش و حواس کو بیٹھا تھا اور جیچیں مارتا، وہاں سے بھاگ کر آہوا تھا۔ ایک آدمہ نے اس کے پیچھے لپکتا چاہا تھا مگر بنی کی حالت زیادہ توجہ طلب تھی۔ اسے فوری طبی امداد کی سخت ضرورت تھی۔ وہ سب فرخ کو اس کے حال پہ چھوڑتے ہوئے ایک گروہ کی صورت میں بنی کو ہسپتال لے گئے۔ دوسری طرف محمود نصے سے بے قابو ہوتا فرخ سیدھا علی کے گھر پہنچ چکا تھا۔ ٹی ٹی بی کے کنوئل میں بھی تھی کہ شام سے بنی کی کھنڈ پائی تھی مگر یہ علم اب تک نہیں تھا کہ علی والے اس تک پہنچ گئے ہیں۔ اس کے مٹی سینا گھر سے اسے خیم مردہ حالت میں اٹھالائے ہیں۔ اپنے تئیں تو وہ اور اس کا دوست اسے مردہ سمجھ کے چھوڑ بھاگے تھے کہ رات کے کسی پھر خاموشی سے اس کی لاش ٹھکانے لگا دیں گے۔ اب جواس نے پورے علاقے کے لوگوں کو بنی کی تلاش میں سرگرداں دیکھا تو بدحواس ہو کر بھاگنے کی تیاری پکڑی مگر اس سے پہلے کہ وہ گھر سے نکل پاتا فرخ نے اسے جالیا اور دھتیا نہ طریقے سے اس کا سر جھڑ کے ستون سے ٹکرا کر اسے قتل کر ڈالا۔

ضعیف دادی جو پہلے ہی پوتی کے ساتھ گزرنے والے سامنے اور خاندان کی ہونے والی بدنامی پر پھردے سے شرمناک تھی، اس غم کو برداشت نہ کر پائی اور اگلے ہی دن ہر درد ہر تکلیف سے نہات پانگی۔

ذکر اور اس کے رشتے دار جو پچھلے تین دن سے اس شش و شب میں گرفتار تھے کہ عابد چوہری کو کویت سے کیا کہہ کر بلوائیں، کیا یہ کہ۔

تمہاری کسن بھی کسی کی درمے کی کی بیعت چڑھ گئی۔

یا اس بات کی کہ تمہارا اکلوتا بیٹا قتل کے جرم میں سلاخوں کے پیچھے ہے اور اپنا دماغی توازن تقریباً کھو بیٹھا ہے۔

اب ان کی مشکل آسان ہو گئی۔ وہ عابد چوہری کو اس کی ماں کی وفات کی خبر دے کر واپس آنے پہ مجبور کر سکتے تھے۔

عابد چوہری ایک شریف انٹنس، سیدھا سادا مضنئی انسان تھا۔ اپنی ماں سے بے حد عقیدت رکھنے والا بیتا..... ایک شفیق باپ..... اور ایک نرم مزاج شوہر جس نے جتنی اُن چڑھ، قدرے اجڑ اور بیوقوف سی بیوی کے ساتھ بھی مہر کے ساتھ جہا کر لیا۔ حالانکہ وہ ایک سلیجے

ہوئے مزاج کا مناسب حد تک تعلیم یافتہ انسان تھا اور اپنی اولاد کو اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتا تھا مگر انفسوں تعلیم تو ایک طرف، روزگار کے چکر میں وہ ان کی تربیت تک حسبِ خواہش نہ کر سکا۔ بچکے کئی سالوں سے اس کے کویت میں مقیم ہونے سے اس کے کنبے پر کئی اچھے برے اثرات مرتب ہوئے تھے۔

اچھے تو یہ کہ خوشحالی آگئی تھی۔ اگرچہ بہت نظر نہیں آتی تھی کیونکہ اپنی بیوی کے چھوڑ پھین اور شاہ خرچی سے واقف ہونے کی وجہ سے وہ اسے بس اتنا ہی خرچہ پہنچاتا تھا جس سے وہ گھر کو کھلے ہاتھ سے چلا سکے۔ باقی کی بچت اور مستقبل کے لئے سرمایہ کار وہ خود کر رہا تھا اور اس میں خاصا کامیاب بھی تھا۔

نئے اثرات یہ تھے کہ حصولِ رزق کے لئے بیرون ملک مقیم ہونے کی وجہ سے وہ اپنے بچوں کو اپنے سامنے پروان چڑھنے نہ دیکھ سکا، نہ ہی انہیں اپنے خوابوں کے مطابق پال سکا۔ اعلیٰ تعلیم تو ایک طرف، اس کی اولاد کو گراں لائی تعلیم بھی حاصل نہ کر سکے۔ بیوی بنی کو تو ذکیہ نے شوہر کے جانے کے کچھ ہی عرصہ بعد سکول سے اٹھالیا۔ فرخ بھی سکول کی تعلیم مکمل نہ کر سکا۔ چھوٹی دونوں بچیاں ذہین تھیں اور ابتدائی جماعتوں میں تھیں مگر میں کوئی ان کے اس شوق کی حوصلہ افزائی کرنے والا نہیں تھا، اس لئے اسے ان دونوں سے بھی خاص امیدیں نہیں۔

ان دونوں دن رات کی اٹھک محنت وہ اس نیت سے ہی کر رہا تھا کہ اب کی بار وہ پاکستان جانے تو پھر واپس آنا نہ پڑے۔ وہیں کا رو بار بجائے اور باقی کی زندگی بیوی بچوں کے ساتھ چین و سکون سے بسر کرے۔ اسی خواب کی تکمیل کے لئے وہ اپنے خون پسینے کی کمائی جمع کر رہا تھا۔ ماں کی وفات کی اچانک خبر اس کے لئے دھچکے کا باعث تھی۔ اس کا دل پر دلیں سے اور بھی اچاٹ ہو گیا جس کی وجہ سے وہ ماں کے آخری دنوں میں اس کی خدمت کر کے جنت کا طلب گار بھی نہ بن سکا۔ ایک احساس یہ بھی تھا کہ اب اس کی بیوی اور کم بخت بغیر کسی بزرگ کے سامنے کے، کیلے ہیں، اس سوچ کے زیر اثر اس نے اپنا کام سینٹا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پاکستان آ گیا۔

میاں آ کے اسے علم ہوا کہ اس کا یہ فیصلہ بروقت نہیں تھا۔ قیامت تو آچکی تھی اور ستم یہ کہ آ کے گزری بھی نہیں۔ یہ قیامت اس کے خاندان پر ظہر بھی گئی اور نہ جانے اسے کتنے عرصے تک اس خاندان پہ مسلط رہتا تھا۔

وہ یہ سب ہرگز نہ ہرگز یا نہیں کرتا چاہتی تھی۔  
مگر وہ سب اسے یاد آ رہا تھا۔ ایک ایک کر کے سب کچھ۔  
وہ یقیناً ذاتی عورت۔

ہوش میں آتے ہی وہ یہ یقین منتی..... سوچی ہوئی آنکھیں بشکل کھول کے کسی مانوس  
مہربان چہرے کو تلاش کرتا چاہتی تھی مگر اس کے ارد گرد کی انجان چہرے ہوتے۔  
جنس، سواہد، ترم بھرے، ہر طرح کے چہرے۔ ڈاکٹر کا..... نرس کا..... پریس  
والے کا..... یا پھر کسی محلے دار یا عزیز کا۔

مگر ماں کا چہرہ نظر نہ آتا۔ اس کے صرف یقین سنائی دیتے۔ وہ یہ یقین حیرت سے منتی  
جو جانے پہچانے لگتے۔ ذہن پہ بہت زور دینے کے بعد اسے یاد آتا، اس یقین میں جو درد  
ہے، وہی کرب اس کی چیخ میں بھی تھا۔  
کس چیخ میں؟

یہ یاد کرنے کے لئے اسے اپنے ذہن پہ زیادہ زور نہ ڈالنا پڑتا۔ اسے یاد آ جاتا کہ یہ  
یقین اس کی اپنی تھیں۔

اور اس کے ساتھ ہی ایک بار پھر وہ یقین مارنے لگتی۔ بے قابو ہو کے اپنے ہاتھ بند  
نرسوں سے چھڑا رہی تھیں۔

”چھوڑ دو مجھے..... امی..... مجھے چھوڑ دو۔ دادی..... نہیں۔ چھوڑ دو۔ اللہ  
میاں جی.....“

آخری نام اللہ کا تھا جو ان شیطانوں کو ناگوار گزرا۔ پھر کپڑا ٹھونس کے اس کا منہ بند  
کر دیا گیا تھا۔

ہسپتال کے بیڈ پر تڑپتے تڑپتے اسے اپنا سانس بند ہوتا محسوس ہوا تھا۔ اس نے پورا منہ  
کھول کے سانس لینے کی کوشش کی تھی مگر وہ ایسا کرنے کی تھی۔

اور آج..... آج کتنے سالوں بعد پھر اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ وہ منہ کھولنا چاہتی  
تھی..... کچھ کہنا چاہتی تھی..... اس بندے سے ہاتھوں والی عورت کو جو اس کی ماں تھی اور اس جھکے  
سر والے شخص کو جو اس کا باپ تھا۔ انہیں چیخ چیخ کے پکارنا چاہتی تھی مگر ان کی ہر اس کی آواز بند  
تھی۔

وہی محسوس..... وہی درد..... وہی بے بسی..... وہی یقین..... وہی ایسی جنس چہروں کا  
جھگڑا۔

سویرا کی آنکھوں کے آگے اندھرا چھا گیا۔ وہ لہرا کے گرنے لگی اور اس کے گرد کھڑی  
بائیں لڑکیوں میں سے صرف ایک کے ہاتھ اسے سنبھالنے کے لئے آگے بڑھے تھے۔

یہ ہاتھ اس کی حیز از جان دوست پیش کا نہیں تھا جو اس سے دوستی اور غلوں کا دم بھرتی  
تھی۔ وہ لگا ہوا حیز..... اپنے ہاتھ سینے دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔

یہ ہاتھ اس کی کزنز روا، مریم اور دوستی کے بھی نہیں تھے جن کے ساتھ اس کا لڑکپن گزرا  
تھا۔

یہ ہاتھ اس کی بہن میرا کے تھے جو اس کے نیم بے ہوش وجود کو ہاتھوں میں بھرے  
بلک بلک کے رو رہی تھی۔ وہ سارے آنسو بھاری تھی جو آج سے گیارہ سال پہلے نہیں بہا پانی  
تھی۔ تب ہی آنسو خوف سے اس کے اندر ہی جمہ ہو گئے تھے۔ وہ خود اتنی کم عمر تھی کہ اپنی بہن  
کے ساتھ پیش آنے والے سامنے کی یگینی سے واقف نہ تھی۔ ہاں مگر بے روپے ٹوٹنے والی  
معصیتوں نے اس کا سارا لالہابی پن رخصت کر دیا تھا۔ آج اس کے اندر کی برف پگھل رہی  
تھی۔

آج وہ اپنے وہ آنسو بھی بھاری تھی جو گیارہ سال پہلے اس نے اپنے اندر اتار لئے  
تھے۔

☆=====☆=====☆

عابد چوہدری اور ڈاکٹر کو تو سمجھنے کے قابل ہی نہ رہے تھے، البتہ سویرا کے ماموں اور  
خالو وغیرہ آگے بڑھ کے لڑکے والوں کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

”دیکھیں، آپ اس طرح واہیں مت جائیے۔ ان سے یہ غلطی ضرور ہوئی کہ آپ سے  
یہ بات چھپائی مگر.....“

”تو کیا اشتہار لگواتے، عجیب بات کر رہے ہیں صاحب آپ۔“ لڑکے والوں کی  
جانب سے کوئی بکڑ کر بولا۔

”تاہم دیکھتے تو کیا ہو جاتا۔ آنکھوں دیکھی کسی کون لگتا ہے۔“ کوئی اور بولا۔  
”نہیں، یہ غلطی کہہ رہے ہیں۔ واقعی چوہدری صاحب کو یہ باتیں پہلے کر لینی چاہئے  
تھیں۔“ نسیم بیگم نے کہا۔

”تو سب کچھ جان کر تم اپنے بیٹے کا رشتہ یہاں کر لیتیں؟“ ان کے شوہر ب نواز نے  
ناگوار سے پوچھا۔

”نہیں، تب بھی ہماری جانب سے انکار ہی ہوتا لیکن کم از کم عزت تو رہ جاتی ان کی بھی  
تھی۔“

اور ہماری بھی، کم از کم یہ قماش تو نہ لگنا۔ خاصی صاحب بھی نکاح کے لئے آچکے ہیں اور انہیں واپس کوٹنا پڑ رہا ہے۔“

انہوں نے چند قدم کے فاصلے پر کھڑے اپنے بیٹے شاہ نواز کو دیکھا جو اپنے تاپا اور نکاح خواں کے ہمراہ ابھی ابھی آیا تھا اور ماتھے پر ہل کے کسی عزیز سے ساری تفصیل سن رہا تھا۔ وہ ماں ہونے کے ٹائپ سے جانتی تھیں کہ اب ان کے بیٹے کا رول کیا ہوگا۔

”چلیں ابو جان۔۔۔۔۔ واپس چلیں، بلکہ مجھے حیرت اس بات پہ ہے کہ آپ اب تک یہاں کھڑے کیوں ہیں؟“

شاہ نواز غصے سے آگے بڑھا۔ حق نواز نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو اس نے پلٹ کر اسے ٹوک دیا۔

”تم جگ میں مت بولنا۔“

شاید اسے اندازہ تھا کہ حق نواز کیا کہنے والا ہے اور حق نواز۔۔۔۔۔ جو اس ساری صورتو حال پہ حیران تو واقعی تھا جتنا کہ باقی سب۔ البتہ دوسروں کی طرح پیش میں آنے کے بجائے وہ اندر ہی اندر شرمندگی محسوس کر رہا تھا کہ یہ لوگ پہلے ہی اس دکھ کی وجہ سے ٹوٹے ہوئے ہیں، دنیا کی نظروں میں گرے ہوئے ہیں، ان بے چارے لوگوں کو آج ان کی وجہ سے ایک اور غم کا سامنا کرنا پڑے گا۔

”بھائی صاحب! آپ بھی بہن بنی والے ہیں۔ یوں اس طرح واپس مت جائیں۔ اس میں بچی بے چاری کا کیا قصور ہے، وہ تو معصوم اور پاک ہے۔“

سویا کے ماموں نے آخری کوشش کے طور پہ ان سے التجا کی۔

”بے شک آپ کی بچی بے قصور ہوگی مگر ہمارا کیا قصور ہے جو ہم مفت کی بدنامی مول لیں اور ہمارے بیٹے کا کیا قصور ہے جو اس کے حصے میں بیوی کی بجائے نرئی ذلت آئے۔“

رب نواز صاحب نے اپنے ہمراہ آنے والوں کو روک دیا کہ اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”اور بھائی صاحب! ابرامت مائیں۔“ تسنیم بیگم نے بھی چلیے چلیے کہا اپنا فرض جانا۔

”اپنی بچی کو معصوم اور بے قصور آپ بے شک کہہ سکتے ہیں لیکن پاک تو نہ کہیں۔ یہ تو انھوں میں حلال جمونے والی بات ہوئی۔ ایسی ہی بات ہوئی تو خاندان والے جو ہر دم بنے نہیں نصیحتیں کر رہے ہیں وہ خود نہ بیاہ کے لے گئے ہوتے۔“

سب ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے۔ بغیر کچھ کہے، بغیر پلٹ کے دیکھے۔

لڑکے والوں کی جانب سے آنے والے مہمانوں میں سے صرف رومیہ۔ اب تک

وہیں موجود تھی۔ اسے قدم آگے بڑھانا دو رہا مگر رہا تھا تو واپس جانا ایک سفاکانہ عمل تھا۔

”مگر میں یہاں کھڑے کھڑے کرکھی کیا کتنی ہوں۔“ بے بسی سے اس نے سوچا اور زندگی میں پہلی بار اس لڑکی کو اپنے ”لڑکی“ ہونے پہ افسوس ہوا وہ جو ہمیشہ خود کو مستفاد نازک میں شمار کرتے جانے پر فخر محسوس کرتی تھی۔

”کاش میں لڑکا ہوتی۔۔۔۔۔ تب ان بے درد لوگوں کے ساتھ واپس جانے کے بجائے میں فخر سے آگے بڑھ کے خود کو پیش کر سکتی تھی۔ ان جھگڑا انھوں میں زندگی کی رتق واپس لاسکتی تھی مگر کاش۔۔۔۔۔ کاش میں۔۔۔۔۔“

”مجھے۔۔۔۔۔ مجھے بہت افسوس ہے۔“

اس نے فی الحال وہ کیا جو وہ کر سکتی تھی۔ وہ سویرا کی والدہ ذکیہ کے سامنے کھڑی بچے دل سے اظہار افسوس کر رہی تھی۔

جواباً وہ ایک سرد آہ بھرتے ہوئے اٹھ گئیں۔ رومیہ نے ان کے تعاقب میں نظریں دوڑائیں، وہ تھکے تھکے قدموں سے اپنی بے ہوش بیٹی کی جانب بڑھ رہی تھیں۔

☆=====☆=====☆

سویرا اسی کمرے میں بیٹھی تھی جہاں سے کچھ دیر قبل اسے سہیلیوں اور بہنوں کے جھمرت میں بڑے چاؤ کے ساتھ باہر لے جایا گیا تھا۔ منٹ مس پہلے وہ اپنی ماں اور بہن کے کھارے خود کو کھینچتی ہوئی اس کمرے میں لائی تھی۔ وہ اس کو بیڈ پر لٹا کے، اس کے رخ بستہ ہاتھ پیر سہلانے کے بعد ابھی ابھی باہر لگتی تھیں۔

”میں۔۔۔۔۔ ذرا تمہارے لگاؤ کو بھیکوں۔“ ذکیہ نے نچنی نظروں اور دھیمی آواز کے ساتھ وہاں سے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔ انہیں فرش پہ اپنی بے تاثر آنکھیں گاڑے بیٹھی، اپنی بیٹی کی خاموشی سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔

”میں دودھ گرم کر کے لاتی ہوں تمہارے لئے۔“ سیرا نے بھی اٹھتے ہوئے کہا اور ایک پل کے لئے رک کے اس کے سفید پڑتے چہرے کی جانب دیکھا بھی۔۔۔۔۔ کہ شاید وہ کچھ کہے اور کچھ نہیں تو دودھ لانے سے منع ہی کر دے مگر وہاں تو کتنے کا ساما عالم تھا۔ سیرا کو اپنی ماں کی طرح سویرا کی خاموشی سے خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا بلکہ اسے یہ سکتہ قیمت لگ رہا تھا۔

ان دونوں کے جانے کے بعد اس کے ساکت وجود میں ہلکی سی حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے نظریں اٹھا کے کمرے کے بند دروازے کی جانب دیکھا پھر سر گھما کے چاروں طرف پھیلے اس سامان کو۔۔۔۔۔ رنگین چمک دار نقدوں میں لپٹے تھانف، موسیٰ کا نقدوں میں ملفوف وہ قیمتی

لمبوسات جو اس کے جیزر کے تھے اور جو اس کے سرال والوں کو دینے کی غرض پیش نے سارا دن بیٹھ کے خوبصورتی سے پیک کئے تھے۔ مشائیوں کے بڑے بڑے نوکرے..... مہندی کے سچے سچے تھال..... قالین پر ایک جانب لڑکھی ڈھولکی، اس کے نزدیک رکھی کون مہندی اور مہندی کے ڈیز انگوں والی کتاب جو پیش اپنے گھر سے لائی تھی۔

اچانک کمرے کا دروازہ ہلکی سی آواز کے ساتھ کھلا۔ سر جھکانے جتنی سے لب بھیجے پیش اندر داخل ہوئی۔ سورا کے لب کپکپانے لگے۔ وہ اس کے گلے گلے کے رونے کو بے چین ہو گئی۔

”تم مجھ سے جتنا بھاگتی ہو، میں اتنا ہی تمہارے نزدیک آتی ہوں۔ ایک طرف جذبت کا تو ساتھ بھر گئے تھے کہ میں تمہاری ایک طرف دوستی میں جھکا ہوگی ہوں۔“

پہلے پہل وہ انکڑا کر رہی تھی، جب سورا اس کی غلغلہ نش پیش کا جواب دیے نہیں دے پائی تھی، جیسے دینا چاہتا تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ پیش سے دوستی کر کے آخر کرے کی کیا..... اور آج اسے احساس ہو رہا تھا کہ ایک دوست زندگی میں کتنا ضروری ہے۔ دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے..... اپنے دکھ درد بانٹنے کے لئے۔

اس نے اپنی گود میں بے حس و حرکت بڑے بازوؤں کو دیکھا..... وہ انہیں پھیلاتا چاہتی تھی۔ پیش کے گلے گلے کے، اس کے کاٹھے پر سر رکھ کے روتے ہوئے اپنے سارے دکھ سنانا چاہتی تھی۔ مگر اس کے بازو بے جان ہی رہے۔ پیش کی لاشقی نے ان میں اٹھنے کی سکت ہی نہ پیدا ہونے دی۔ وہ جس طرح خاموشی سے اندر آئی تھی اب اتنی ہی خاموشی سے کمرے سے اپنا سامان اٹھ کر رہی تھی۔ دوش روم میں لٹکا وہ سوٹ اتار کے لائی جو اس نے رات کو پہنا تھا۔ بیڈ کے نیچے سے سمجھ کر اپنا بیگ نکالا، اس کی زپ کھول کر یہ سوٹ رکھا، دیوار پر بینکر کے لٹکے اس سوٹ کا تانارے دوکل شادی پہ پہننے کا ارادہ رکھتی تھی، ڈریسنگ سے اپنی چوڑی اٹھائی اور اس نے ایک بار بھی بیڈ پہ بیٹھی اپنی کھلی کونہ کھینا گوارا نہ کیا لیکن یہ بات سورا کو صاف محسوس ہو رہی تھی کہ پیش کی لاشقی میں ایک جبر تھا، ایسا جبر جو وہ خود پہ کر رہی تھی۔ اس کی وجہ بھی اس کی سمجھ میں آگئی۔ وہ بیگ کی زپ بند کر رہی تھی جب پیش کی ماما نے اندر جھانکا، اس کی فیملی ساری تقریباً تیر تیرات میں مدعو تھی اور آج ایک گھنٹہ قبل ہی وہ لوگ آئے تھے۔ اس سارے ڈرامے کے ہونے سے چند منٹ پہلے۔

”جلدی کرو پیش، نیچے تمہارے پاپا کا پارہ ہانی ہو رہا ہے۔“ انہوں نے ہلکی سی آواز میں اسے جھڑکا اور ساتھ ہی ایک تیز نظر سورا کے گھڑی بے وجود پہ ڈالی۔

”بس ماما! پیش کی آواز میں کپکپاہٹ تھی اور آنسوؤں کی نمی بھی۔“

”آج کل کے بچے سوچے سمجھے بغیر، کسی کو پرکے یا اس کی فیملی کا آگے بچھا جانے دوہتیاں تو کر لیتے ہیں، جیجکتا ان کے ماں باپ کو پڑتا ہے۔ اب دیکھو تمہاری وجہ سے تمہارے پاپا کی کتنی باتیں سننا پڑتی ہیں مجھے۔“ پیش کا بازو پکڑ کر باہر کی طرف دھکیلے ہوئے انہوں نے خاص طور پر اسے سنایا۔

”تم بھی چلی گئی پیش..... میرے متعفن ماضی کی بدبو سے گھبرا کے تم بھی بھاگ گئیں۔“ اس کے چہرے پر آنسو پھیلتے چلے گئے۔

”میں ایک بار پھر اکیلی ہو گئی ہوں اور مکی اکیلی ہوتی جاؤں گی، جیسے آج سے گیارہ سال پہلے ہو گئی تھی۔ سب نے میرے پاس آنا چھوڑ دیا تھا۔ سوائے امی کے۔ میری ماں کے، مگر امی کا میرے پاس آنا مجھے اور تکلیف دیتا تھا۔ وہ مجھے دیکھتی جاتی تھیں اور روتی جاتی تھیں۔ روتی جاتی تھیں اور میرا دکھنا ہوا جسم چوختی جاتی تھیں..... چوختی جاتی تھیں اور میرے پاؤں پکڑ پکڑ کے معافیاں مانگتی جاتی تھیں۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میرے ساتھ جو بھی ہوا، اس میں امی بے جاری کا کیا تصور جو وہ مجھ سے رو رو کے معافی مانگتی ہیں اور جب سمجھ میں آیا کہ ان کی کیا غلطی تھی تب تک ان کے آنسو میرے دل کو دھوکے اپنے لئے معافی لکھ چکے تھے۔ ویسے بھی ان سے ناراض رہ کے میں کیا کر سکتی جو میری خوفناک راتوں کی واحد پناہ گاہ تھیں۔ جن کی آغوش میں چھپ کر مجھے ان تینوں درندوں کے کمرہ چرے نظر آتا بند ہو جاتے تھے۔ وہ ماں جو کتنی ہی سال تک اکیلی میرے آنسو پونچھتی اور اپنے بہائی رہی۔ حالانکہ جتنی اذیت میں نے اٹھائی تھی، اس سے کئی گنا زیادہ تکلیف امی ان دنوں اٹھا رہی تھیں۔

داؤی کی موت..... حیرا باہی کی مکتی کا ٹوٹنا..... ابو کی ان سے طویل ناراضی اور سب سے بڑھ کے بھائی کی سزا..... ویسے بھی ان دنوں خوف اور دہشت کے علاوہ کسی دوسرے احساس نے مجھے اب تک نہ بچھوڑا تھا۔ میں صرف بدن کی تکلیف پہ چلائی تھی۔ میری ماں تو میری ہراس تکلیف پہ قائم رہی تھی جو میں نے آنے والے سالوں میں جھکتا تھی۔

ان سے میں کیا ناراض ہوئی۔ ان کے سوا تب میرا تھا ہی کون..... اور شادی اب بھی کوئی نہیں، وہ سب جو میری شادی کی تاریخ مقرر ہوتے ہی مجھے کوئی نئی سورا عابد سمجھتے ہوئے میرے پاس رفتہ رفتہ لوٹنا شروع ہوئے تھے وہ سب واپس چلی گئے۔ یہ جان کر کہ..... میں تو وہی بلی ہوں۔ وہی بلی جو..... اور جسے دیکھ کر لوگ تو یہ تو بے کر اٹھتے تھے۔ اس دن سے لے کر آج تک میں ایک عبرت حاصل کرنے والی چیز سے زیادہ حیثیت حاصل نہیں



آنسو بہا بیچاران کا چہرہ ہلکنے لگے تھے۔

”آج کل، ماہ گزر جانے کے بعد بھی جب لوگ میرے گھر آتے ہیں، کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بتلی کو دیکھتے ہیں، مجھ سے وہوری جانتے ہیں، تو اپنے سب بچوں کو لے کر یہاں سے بھاگ جانے کو بھی پتا ہے۔ میں نے سوچ لیا ہے، ہم یہ شہر چھوڑ دیں گے۔ یہاں رہے تو اس چھوٹے شہر میں یہ واقعہ بھی برائا نہیں ہوگا۔ بتلی بھی رات کو ڈراؤنے خواب دیکھنا نہیں چھوڑے گی۔ ہم لاہور چلے جاتے ہیں، یا کسی بھی اور بڑے شہر میں جہاں لاکھوں لوگوں کے جھوم میں ہمارا وجود کم ہو جائے۔ کوئی ہمیں پہچان نہ سکے۔“

انہوں نے یہ شہر چھوڑنے کا فیصلہ سنا دیا تھا۔

☆=====☆

عابد چودھری کا بھائی تو کوئی تھا نہیں..... باپ عرصہ ہوا گزر چکے تھے۔ اب ماں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ ایک بہن تھی بانو..... جس نے بتلی کے ساتھ ہونے والے حادثے پہ بھائی کی ڈھارس بندھانے کی بجائے حمیرا کی اپنے بیٹے کے ساتھ منگنی توڑ کے اس کی اور بھی کمر توڑ کر دکھ دی تھی۔ عابد چودھری نے بہن سے اسی وقت قطع تعلیق کر لیا۔ سو اب اس شہر میں اس کے لئے کچھ نہیں تھا۔

دوسری طرف ذکیہ کو بھی شوہر کا یہ فیصلہ درست لگا۔

بچہ وہ لاہور چلے آئے۔ عابد چودھری نے سالوں محنت کر کے جمع کئے ہوئے سرمائے سے کاروبار شروع کیا جو جلد ہی گم کیا۔ خوشحالی پہلے سے چار گنا بڑھ گئی تھی۔

سیر اور سویرا جیسے سکولوں میں داخل کرایا گیا۔ ذکیہ بھی اس حادثے کے بعد خاصی بدل چکی تھی۔ اب وہ ایک سلیمی ہوئی اور ذمہ دار خانوں خانہ کے روپ میں دخل چکی تھی۔ مگر کا جاحل اس نئے تجربے کے بعد کبیر بدل چکا تھا۔ عابد صاحب تو تھے ہی نمازی پر بیزار۔ ذکیہ کی تہجد بھی باقاعدہ اور کچھ طویل ہونے لگے۔ بیٹیاں باپردہ ہو گئیں۔ سیرانے تو ماں کے کہنے پہ..... اور سویرا نے نجات کا باعث سمجھتے ہوئے پروے کو اپنا لیا۔

پرانے محلے میں ہر نظر اسے اپنا جسم چیرتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ وہ لوگوں کی نظروں سے ڈرنے لگی تھی۔ حتیٰ کہ اس نے شہر میں آنے کے بعد انجان لوگوں سے بھی وہ گھبرانے لگا چھپنے لگی۔ بارہ سال کی عمر میں ماں نے چار اوڑھاکے سکول بھیجا تو اسے لگا جیسے اس کے گرد ایک حصار قائم ہو گیا ہو اور اس نے اس تحفظ کو مضبوطی سے تمام لیا۔

اور پھر سترہویں سال تک آتے آتے وہ اس بات سے باخبر ہو چکی تھی کہ وہ کیا کھوپٹلی

کر پائی۔ یا بھر میرے وہ اپنے جو مجھے دیکھ کر اور بھی اذیت کا شکار ہو جاتے تھے اور اسی لئے انہوں نے میرے پاس آنا تک چھوڑ دیا تھا جیسے اب.....“

اسے اپنے باپ کا کل رات اپنے کمرے میں آنا یاد آیا۔ وہ کتنا خوش ہوئی تھی انہیں اپنے سامنے دیکھ کر عرصہ ہوا انہوں نے اسے مخاطب کرنا، اس کے سامنے آنا ترک کر دیا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ دوسرے لوگوں کی طرح عابد چودھری بھی اپنی بیٹی کے وجود سے گمن کھانے لگے تھے۔ انہیں آج بھی اپنی اس سب سے چھوٹی بیٹی سے اتنی ہی محبت تھی۔ ہاں مگر وہ اس کا سامنا کرنے سے گھبرانے لگے تھے۔ اس کا ساہا ہوا چہرہ دیکھ کے، اس کے بدن کے نثل دیکھ کے ان کا شرم سے ڈوب مرنے کو دل چاہتا تھا اور کسی پہ بس نہ چلتا تو وہ ذکیہ سے لڑنے بیٹھ جاتے۔ حالانکہ کئی سال انہوں نے آپس میں ڈرانے بچنے کے باوجود بڑے مبرور دل سے گزار دیئے تھے، لیکن یہ ظلمی صاف کرنے پہ وہ تیار نہ تھے۔

”بیٹی کی ماں بنا آسان بات نہیں ذکیہ! بیٹی کی ماں ہونے کے ناطے تمہارا فرض تھا کہ تم اسے اپنے پردوں میں چھپا کر رکھیں تاکہ کسی کی نظر بھی اس پہ نہ پڑے..... نہ کہ تم اسے سارا سارا دن گھر سے باہر نکالے رکھو۔ ہر اچھی بری جگہ اسے تمہا بھیجو۔ ہر ایرے سے غیرے کی دکان سے سو والا نہ بھیجو، تمہیں ایسا کرتے ہوئے ڈر نہیں لگتا تھا ذکیہ؟“

”مجھے کیا پتہ تھا، کیا پتا تھا مجھ نصیب جلی کو۔ پتہ ہوتا تو کیا میں اپنی بیٹی کو جان بوجھ کے باہر نکالتی؟؟ میرا تو خیال تھا کہ وہ بیٹی ہے۔ کوئی بات نہیں اگر چلی جائے۔ جب بڑی ہوگی تو.....“

”بیٹی ہے، اسی لئے تو ہمیں خیال رکھنے کی زیادہ ضرورت ہے۔ بچہ اپنا خیال رکھتے اور بھلا برا سوچنے کے قابل نہیں ہوتے۔ اسی لئے ان پہ خود نظر رکھنا ہوتی ہے۔ ایک باشعور ہوئی لڑکی تو خود کسی حد تک برے بھلے میں تیز کر سکتی ہے۔ یہ اندازہ لگا سکتی ہے کہ خطرہ کہاں ہے اور نقصان کہاں۔ زیادہ محتاط کی ضرورت تو انہی معصوم اور کچے ذہنوں کی بچیوں کو ہوتی ہے جو ہر بھلائے پہ بھلانے والے کو ”اٹکل“ جان کے اس کے پیچھے چل پرتی ہیں، ذکیہ! تمہاری عاقبت نااندیشی نے آج یہ دن دکھایا ہے کہ میری معصوم نو سال کی بیٹی اپنی ذات پہ کبھی نہ مٹنے والا داغ لے، گھر کے پچھلے کونے میں غبرموں کی طرح منہ چھپائے بیٹھی ہے۔ آجی رات کو نیند میں ڈرے مارے جب وہ جیتی ہے تو..... تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں تمہارا گلا بادوں۔ جب میرا پچہ پیرا بیٹا جس نے میرا بازو دبنا تھا اسے میں سلاخوں کے پیچھے دیکھتا ہوں تو میرا دل چاہتا ہے اپنا سر ان سلاخوں سے ٹکرا کر اسے خود کو ختم کر لوں۔“

”تو کیا ہوا اگر وہ مجھ سے نفرت محسوس کرنے لگیں گے۔“ اس نے حقیقت پسندی سے سوچا۔ ”ٹھیک ہی تو ہے۔ میں نے ان کو بدایا کیا ہے، سوائے ذلت اور بدنامی کے۔ ان کی عمر بھر کی نمازوں کے نشان عراب کی صورت ان کی پیشانی پر اس قدر واضح نہیں ہوتے جتنے کہ میری ذات کے حوالے سے ملنے والے ٹکرات کے عکس..... انہیں مجھ سے تنگ آنا ہی تھا۔ اگر وہ مجھ سے جردے کر مارنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں تو غلط نہیں۔“

”ابو حمی!“ نہ جانے کتنے عرصے بعد اس نے انہیں مخاطب کیا۔ یہ ہمت وہ بہت مشکل سے مجتمع کر پائی تھی۔ اس پکار پر بھی عابد چودھری نے نظر اٹھا کے سامنے نہ دیکھا۔

”ابوئی! آپ میرے سامنے مت آیا کریں۔ حیران مت ہوں ابوی!.....! میں نمیک کھڑی رہی ہوں۔ جتنا مشکل آپ کے لئے میرا سامنا کرنا ہے، اتنا ہی تکلیف دہ میرے لئے آپ کو یوں دیکھنا ہے۔ باپ بٹی کے سامنے سر اٹھا کے آئے تو اچھا لگتا ہے۔ میں جانتی ہوں آپ بھی میرے سامنے سر یا نظر اٹھا کے نہیں آ سکتے۔ میں جانتی ہوں، میں ان بیٹیوں میں سے نہیں جن کو کد کد کر باپ کا سینہ فخر سے چھڑا اور انھیں غرور سے چمکاتھی ہیں۔ میں جانتی ہوں مجھے دیکھ کر کبھی بھی آپ کو فخر کا احساس نہیں ہو سکتا۔ میں..... میں بد نصیب، اس دنیا میں آپ کا سر جھکانے آتی ہوں۔ آپ مت آیا کیجئے میرے سامنے..... کم از کم آپ کو اس طرح سزا نہیں جھکانا پڑے گا۔ حرام موت مر کے گناہ کا بھی نہیں ہونا جانتی ورنہ میں خود بیٹھ کے لئے آپ سے دور ہو جاتی۔

”بیلی!“ عابد چودھری تڑپ کر آگے بڑھے۔

”ابو جی..... کوئی بیٹی اپنے باپ کی شرمسار نظریں، ڈھلکے ہوئے شانے اور جھکا ہوا سر نہیں دیکھ سکتی۔ مجھے بتائیے ابو جی! خود کئی کئی علاوہ کوئی اور راستہ بتائیے جس سے میں آپ کی ذلت کا سامان نہ پیدا کر سکوں۔ مجھے بتائیے ابو جی۔“ وہ ہلک اٹھی۔

”بلی!..... میری بچی۔ کس نے کہا ہے کہ ٹو اس ڈانم میرے لئے ذلت لے کر آئی ہے، دوسرے دیکھ۔ میرا سینہ فخر سے چڑا نہیں تو کیا ہوا، تیری محبت سے بھرا ہوا تو ہے۔ میری نظریں تجھے سامنے پا کے جھک ضرور جاتی ہیں۔ مگر اس احساس سے کہ میں ہاپو کی طرح لے کر نہ کر سکا۔ اپنی جمہوری، اپنی بے شرمسار رکھتی ہے۔ ٹو نے کیا کیا ہے۔“

انہوں نے اپنی بیٹی کی شفاف پیشانی چوم لی، جس سے اہٹن کی مہک پھوٹ رہی تھی۔

ہے۔ اس میں اوداس کی دوسری ہم عمر لڑکیوں میں کیا فرق ہے۔ محض نو برس کی عمر میں وہ نہ صرف اپنے بچپن کی مصومیت بلکہ لڑکپن کا الہ پن اور بے فکری..... اور جوانی کی آمنگ..... سب کچھ کھو چکی ہے۔ وہ اس عمر میں ان عجیب حقیقتوں سے زبردستی روشناس کرادی گئی تھی جب دوسری لڑکیاں گمڈی گمڈی کے کچھ رچا رہی ہوتی تھیں۔ اسے اپنا آپ دوسری لڑکیوں کے مقابلے میں بہت کم تر..... بہت نیچ محسوس ہوتا تھا، مگر اس لئے وہ کسی کے قریب بھی نہ آسکتی تھی۔ سوائے بیٹش کے۔

★=====★=====★

”اور اب تم بھی جا رہی ہو؟“

سویرانے اسے الدوار کچھ کہے کہ آنکھیں موند لیں۔ وہ جانتی تھی اس بار کمرے میں پہلے کی طرح سوائے اس کی اسی کے ادور کوئی نہیں آئے گا۔ محرا گلے یں ہل ایک آہٹ نے اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا اور اس کی آنکھیں ضرورت سے زیادہ یں پھیل گئیں، اس بار اعدا آنے والے عابد چودھری تھے۔

وہ اندر ہی اندر لرز گئی۔

”ابو.....!“ اس کے لب آہستگی نے پہلے، مگر آواز اندر ہی دم توڑ گئی۔ عابد چودھری دروازے کے پاس کھڑے جیسے سوچ رہے تھے کہ وہ یہاں کیوں آئے ہیں۔

سوہرا اپنے باپ کی خاموشی کی عادی ہو گئی تھی۔ اگرچہ یہ خاموشی..... یہ گریز..... اسے کبھی بکھار بری طرح کلکنا تکلیف نہ دے وہ اس پر حیرت زدہ ہونا چھوڑ چکی تھی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں رہی تھی، مگر آج اسے اپنے باپ کے رویے میں غیر عادی معمولی پن نظر آ رہا تھا۔ اسے خوف محسوس ہونے لگا۔ زندگی میں پہلی بار وہ اپنے باپ سے ڈرنے لگی۔

بچپن میں اس نے ماں اور دادی سے ساتھ کا وہ اپنے ابو کی بہت لاڈ لی جی ہے۔ مگر  
دش سنبھالنے کے بعد جب اس نے انہیں واپس پاکستان میں اپنے پاس پایا تو ہمیشہ اپنے  
آپ سے دور اور لائق۔ اسے یاد نہیں تھا کہ اس کے باپ نے کبھی اسے گود میں لیا ہو یا سر پہ  
پیار سے ہاتھ پھیر کے اس کی کوئی فرمائش نہ ہو۔ ایک باپ ہونے کے ناطے انہوں نے اپنے  
سارے فرائض پورے کئے۔ اسے ہر آسائش، ہر سہولت مہیا کی۔ اعلیٰ تعلیم کے مواقع فراہم  
کئے۔ اس کے دینی رجحان کو دیکھتے ہوئے اسے قرآن حفظ کرایا۔ اب ایک اچھے گھر میں بیاہ  
رہے تھے، پوری شان و شوکت کے ساتھ۔ اس سے یہ اعزاز تو ہوتا تھا کہ انہیں سویرا سے  
نفرت بہر حال نہیں تھی۔ یہ عداوت بہت جلد ہی اس کے دل کے لئے۔

☆=====☆=====☆

”تم کیا سمجھتی ہو، میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش نہیں کی ہوگی؟“  
حق نواز نے رومیصہ کو ناراضی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اور کیا تمہارا خیال ہے کہ صرف میرے سمجھانے بجائے پتہ حق نواز بھائی بارات لے جانے پہ تیار ہو جائیں گے؟ ایسا وہ کبھی نہیں کریں گے۔ میں جانتا ہوں انہیں۔“  
”میں انہیں نہیں جانتی۔“ رومیصہ نے شانے اچکائے۔ ”میں صرف تمہیں جانتی ہوں اور جتنا بھی جانتی ہوں اس کے بعد مجھے یہ بات ہضم نہیں ہو رہی کہ تم بھی اپنے گھروالوں کا ساتھ دو گے۔“

”میں ان کا ساتھ نہیں دے رہا ہوں، بات کو سمجھ کیوں نہیں رہی۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”میں ان کا ساتھ نہیں دے رہا۔ لیکن میں انہیں اپنا تم خیال بھی نہیں بنا سکتا۔ وہ اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ بڑے بھائی ہیں میرے، زبردستی کیسے میں ان کا ٹکڑا پڑھوا دوں اس لڑکی کے ساتھ اور پھر انہیں اسی لڑکی کی حمایت بھی حاصل ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ امی ابو اس بات پر متفق ہیں کہ لڑکی بے چارے بے قصور ہے اور نادانگی میں ان کی وجہ سے اس کے اور اس کے والدین کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ عظمت خاں یہی بات اکیلے میں جا کے آرام سے بتا دیتیں تو معاملہ عزت سے نہٹ جاتا۔“

”بھئی تو میں سوچ رہی ہوں حق نواز اس لڑکی کی میں نے ایک ہی جھلک دیکھی ہے۔ مگر اس کا چہرہ بھول نہیں پاری۔ میں اس کی ہم صنف ہونے کے ناطے اس کی اذیت کو بخوبی محسوس کر سکتی ہوں۔ بہت غلط ہوا۔ اس کے ساتھ بھی۔ اور اس کے گھروالوں کے ساتھ بھی۔ پرسوں اس کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ کبھی بھی طرح اس سے کم نہیں کہلایا جاسکتا جو گیارہ سال پہلے ہوا تھا۔ وہ دوبارہ مجروح ہوئی ہے حق نواز۔“

رومیصہ کے لیے جس درد ہی درد رہتا۔

”مگر اب کیا کیا جاسکتا ہے۔“

”ابھی نہیں گتیں تمہارے منہ سے ایسی جھکی ہوئی باتیں۔“ اس نے تیزی نظروں سے اسے دیکھا۔

”مجھ بے حس انسان ہوں۔ تمہیں ذرا احساس نہیں کہ تم لوگوں کی کم ظرفی کی وجہ سے ایک لڑکی کی پوری زندگی تباہ ہوگی۔ جو بات چار لوگ جانتے تھے وہ تمہاری ایک رشتے دار خاتون نے چار سو لوگوں کے درمیان بتا دی اور یہ چار سو لوگ اب تک چار ہزار افراد تک

www.pdfbooksfree.pk

یہ اطلاع مع ملک مروج کے بیان کر چکے ہوں گے۔ ذرا سوچو، اس کا قصور ہی کیا ہے۔ وہ کوئی برکدار، بطلان آوارہ لاکی نہیں ہے، جس کے بارے میں کوئی انکشاف تمہارے بھائی کو مشتعل کر گیا ہو۔ ایسا ہوتا تو وہ اسے ٹھکانے میں حق بجانب ہوتے۔ وہ ایک سیدھی سادی، شریف اور مطمئن لڑکی ہے۔ تمہارے بھائی اسے اپنا کر نہ صرف ایک مثال قائم کر سکتے تھے، بلکہ ثواب بھی کما سکتے تھے۔“

”کر سکتے تھے تا۔۔۔ اب تو نہیں کر سکتے۔۔۔ نہ ہی کریں گے۔ مجھے اس لڑکی کی مصیبت اور پاک دامن پر ہرگز ہرگز کوئی شہ نہیں۔ مجھے اس کے ساتھ وہ نالے حادثے پہ جتنا انصاف ہے اس سے زیادہ اپنے بھائی اور والدین کے بدصورت رویے پہ شرمندگی ہے۔ میں بھی چاہتا تھا کہ شاہ نواز بھائی اپنے دل کو وسیع کر لیتے۔۔۔ اس لڑکی کو عزت دے کر اپنا لیتے۔ کسی کی دعا نہیں ہی بتائیں ہمارے پورے خاندان کو، مگر اب۔۔۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا، میں انہیں مجبور تو نہیں کر سکتا۔“

”مجبور نہیں کر سکتے، مگر کچھ نہ کچھ تو کرنا چاہتے ہو نا؟“ رومیصہ نے اپنی سوالیہ نظریں اس پہ گاڑ دیں۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ حق نواز صاحب کہ یہ دعائیں آپ بھی لے سکتے ہیں، اس غریب کا گھر بے گھر کے۔ اسے معاشرے میں عزت دے کر۔ آپ بھی ثواب سمیٹ سکتے ہیں۔ بلکہ اپنی فیملی کی جانب سے ہونے والی اس کی تہلیل کا ازالہ بھی کر سکتے ہو۔ سینکڑوں افراد کی موجودگی میں اسے بے عزت کر دینے کی طمانی بھی کر سکتے ہو۔“

”کیا بھوسا کر رہی ہو رومیصہ۔۔۔!“ وہ اس کا مقصد بھانپتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

”کبھی تو سوچ سمجھ کے بات کیا کرو۔“

”سوچ بھی لیں گے، میں کون سا تمہیں کھڑے کھڑے سر پہ سہرا باندھنے کو کہہ رہی ہوں۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ جیسے تم اپنے بھائی کو زبردستی مجبور نہیں کر سکتے، میں بھی تم پہ دباؤ نہیں ڈال سکتی، ہاں مجھے تم سے یہ امید ضرور ہے کہ تم ان کی طرح شقی القلب نہیں ہو، نہ ہی کم ظرف۔ اس لئے مشورہ دے رہی ہوں کہ۔۔۔ تم اس لڑکی سے شادی کر لو۔“

☆=====☆=====☆

”میں۔۔۔؟ میں شادی کر لوں؟“

حق نواز حیرت سے اس کے الفاظ دہرا رہا تھا۔

”اور وہ بھی سویرا ہے؟“

”کیوں، کیا برائی ہے سویرا میں..... سوائے اس کے کہ وہ ایک عجیب حادثے سے گزر چکی ہے لیکن یہ نہ تو اس کی برائی ہے، نہ خدائی، نہ ہی یہ اس کا قصور ہے۔“

”میں اس وقت یہ بحث نہیں کر رہا کہ اس میں کیا اچھائیاں ہیں اور کیا برائیاں۔ تم کوئی بھی حینہ عالم بھی میرے سامنے لے آؤ گی تب بھی میرا سوال یہی ہوگا کہ کیوں؟ کیوں کہ میں اس سے شادی؟“

”تا جوتائی ہوں کہ ازالے اور طحانی کی یہی ایک.....“

”کیسی طحانی رومیہ! اور کیا گناہ مرد ہوا ہے مجھ سے جس کا ازالہ مجھ پر فرض ہو گیا ہے۔ مانا کہ میری ٹہلی نے اس کے ساتھ کچھ اچھائیاں کیا۔ مگر میرا اس میں قطعی کوئی رد نہیں۔ نہ ہی میں اپنی ذات کے حوالے سے کوئی غامت غموں کر رہا ہوں۔ تمہیں مجھے یہ مشورہ دینے سے پہلے اتنا سوچنا چاہئے تھا کہ.....“

جوابات وہ کہتے جا رہا تھا، اسے کہنے کی خواہش عرصے سے تھی۔ مگر فی الحال نہ تو موقع مل تھا اور نہ ہی اس کا موڈ ایسا تھا کہ وہ یہ بات اچھے ذہن کا یا الفاظ میں کہہ پاتا۔ اس لئے کہتے کہتے رک گیا۔

”کہ تم..... حق نواز..... اعلیٰ تعلیم یافتہ..... پینڈ سم، اچھے خاندان کے چشم و چراغ..... مشہور صحافی اور سویرا جیسی لڑکی سے شادی کرو گے۔ جس کی رسوائی پورے شہر میں پھیل چکی ہے۔ جس کی شادی ہوتے ہوئے ٹوٹ گئی ہے اور کسی زمانے میں جس کے ساتھ گزرنے والے سامنے کی خبریں اخباروں کی زینت ہوا کرتی تھیں۔ واقعی ایسا کہنے سے پہلے مجھے سوچنا چاہئے تھا۔“

رومیہ نے غصے سے نظروں سے اڑے دیکھا۔

”شٹ آپ رومیہ! جان لو مجھ کے انجان مت ہو۔ تم بھی اچھی طرح جانتی ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور کیا کہنا چاہتا ہوں۔ میں اس لڑکی سے شادی کیوں کروں، جب کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔“

وہ یہ بات استے فیسے سے اسے گھورتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ باوجود بے حد بخیدہ ماحول کے، رومیہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔

”تم اسے مذاق سمجھ رہی ہو؟“

”نہیں، جواب تم آج کہہ رہے ہو میں پہلے سے جانتی ہوں۔“ اس نے بخیدہ ہوتے

ہوئے کہا۔ ”اور مجھے حیرت اس بات پر نہیں کہ تم نے یہ مجھ سے آج کہا، بلکہ حیرت اس بات پر ہے کہ اتنی دیر سے کیوں کہا؟“

”یعنی تمہیں انتظار تھا؟“ وہ خوش فہم ہوا۔

”ہاں انتظار تو تھا کہ..... دیکھو کب ملی تجھے سے باہر آتی ہے۔ تمہارے جیسا انسان اتنے صبر اور برداشت کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔ اس پر اتنی بھی محبت ہوتی ہے۔ نہیں، ہے نہیں، جی۔“ اس نے خود ہی اپنے فقرے کی تصحیح کی۔ ایک انتہائی بخیدہ مسک جھپڑ کے اسے ڈسٹرب کر دینے کے بعد وہ خواب بٹکے پھٹکے موڈ میں تھی یا شاید دانستہ ایسا کر رہی تھی تاکہ اس کے مشورے کا حق نواز پر جوش ہوا ہے اس کے تحت اثرات ڈراما ہو جائیں۔ تو وہ دوبارہ اسے اس جانب ہٹنے سے دباؤ سے سوچنے پر مائل کرے۔ مگر وہ رومیہ کے اس طرح بات پھلنے پر ایسا تپا کہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔

”حق نواز، حق نواز..... میری بات تو سنو.....“

رومیہ نے آواز دی مگر اس نے پلٹ کے نہ دیکھا۔

”میں تمہیں دوسرے سے الگ سمجھتی تھی حق نواز! اس لئے یہ مشورہ دے بیٹھی۔ مجھے یہ یقین بھی نہیں تھا کہ تم میری بات مان بھی لو گے۔ صرف یہ امید تھی کہ کم از کم دھیان سے سنو گے تو کسی لیکن تمہارا اس پر بھڑکانا..... ظاہر کرتا ہے کہ تم عام مردوں سے الگ نہیں۔“

☆=====☆

”لغت سے تم پہ حق نواز..... چپ رہو کہ بات گموائی، لب کھولے تو ذات.....“

حق نواز نے ایک بار پھر اسٹیزنگ پر مکا کرتے ہوئے خود پر غصہ نکالا۔

”جب اتنا عرصہ دل کی بات دل میں رکھ کے عزت سے گزارا کر لیا تو اب اگلے ذیل ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ میں تو اب بھی نہ کہتا اور وہ بے نیکی تجویز میرے سامنے نہ رکھتی۔ مجھے کسی بھی ایسا لگتا ہے جیسے..... جیسے وہ ہر بائیر می حوصلہ شکنی کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی طریقہ ڈھونڈ نکالتی ہے اور اس باسویرا سے شادی کا مشورہ، اس پر یہ ناراضی الگ جتنا کی جارہی ہے کہ میں بھڑکا کیوں؟ کیا وہ اتنی ہی نادان ہے جو میرے بھڑکنے کی اصل وجہ نہ جان سکے۔ میں اتنا کم ظرف نہیں کہ سویرا کے ساتھ شادی سے صرف اس کی بدنامی اور اپنی جگہ ہسانی کے خوف سے انکار کروں۔ مگر اتنا ہی ظرف بھی نہیں کہ ہوری دی اور خدا ترسی کے نام پر اپنے دل کی اس اولین ترنا کو بالوں۔ کاش تم مجھے سمجھ پاؤ رومیہ! کاش تم میرے جذبات اور میری محبت کو بھی سمجھ پاؤ۔“

”چپ کر جاؤ حمیرا!.....“ عابد چودھری نے پہلی بار زبان کھولی مگر ان کی آواز میں گرج نہ تھی۔ حمیرا اس کمزوری تنبیہ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے مسلسل زہرا انگلی رہی۔

”یا کم از کم تب تو اسے زہر دے دینا یا گھونٹ دینا تھا، جب اس نے ہمارے نصیبوں میں کالک لیٹی تھی۔ ماسور کی طرح اسے پالتے رہے آپ دوں۔ اس کی وجہ سے ہم سب کو کیا کیا نہ دیکھنا پڑا، پھر بھی میرے سب کی لاڈ لیتی رہی اور اس بد ذات کا گھر سنانے کی کوشش میں آپ نے میرا ابا بپا گھر اجڑا ڈالا۔“

وہ یوں تڑپ کے آگے بڑھی جیسے سویرا پہلی بڑے گی۔ ذکیہ نے اٹھ کے اس کا بازو تھام کے اسے کھل میں دیکھی سویرا کی جانب جانے سے روکا تھا۔ سویرا کانپتے ہوئے سمیرا کی اوٹ میں ہو گئی۔ اس کے آسویسمیرا کی پشت کو بھگور رہے تھے۔

”ہوش کر تمیرا۔“ ذکیہ نے اسے جھنجھوڑا۔

”اب بھی میں ہی ہوش کروں؟“ وہ پاگلوں کی طرح اپنا چہرہ پٹینے لگی۔

”میرا کمر اڑ رہا ہے، میرے میاں نے مجھے ایک ہزار طیعے دے کر کمر سے نکال دیا ہے۔ میرے بچے..... اب میں اپنی اولاد کی شکل تک دیکھنے کو ترسوں گی۔ وہ اپنی اولاد کا تعلق اس گھر سے رکھنا ہی نہیں چاہتا، جس پر بدنامی کے اتنے سائے ہیں، ایک بار پہلے اس کی وجہ سے میرے بچہ کی معقوفی ٹوٹی۔ جو میری شادی کی عمر تھی وہ اس کی وجہ سے منہ چھپاتے چھپاتے گزر گئی۔ تین سال کی عمر میں خاندان نصیب ہوا تو عمر سے دگنا، میں نے آپ لوگوں کی عزت رکھنے کی خاطر اس بوڑھے کے ساتھ مجھے صبر کے ساتھ نباہ کیا۔ اپنے سرال والوں کا ہر کلمہ غلط سمجھا، لیکن مجھے اپنی اتنی قربانیوں کا کیا حلاوا؟ اس منہوں کی وجہ سے میرے پانچ سال کی گھر ہستی، میرے بچے سب کچھ میرے ہاتھوں سے چلا گیا۔ میں ایک بار بھر خالی ہاتھ ہو گئی ہوں۔ اب تو میں اسے بالکل بھی نہیں چھوؤں گی۔ کبھی نہیں جسے۔“

بولتے بولتے اس نے ایک دم خود کو ماں کی گرفت سے آزاد کر لیا اور سویرا پہلے پڑی۔  
جیلتا اتنا اچانک تھا اور شدید تھا کہ بالکل قریب بیٹھی میرا بھی اسے ان وحشیانہ دھموکوں سے  
نور نہ بچا سکی۔

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے باجی!“ میرا نے حمیرا کی گرفت سے اس کے بال پھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”اس بے چاری کا کیا قصور ہے اس میں۔ وہ تو خود سالوں سے.....“ کہتے کہتے اس

★=====★=====★

”بس خوش ہو گئے آپ، پڑ گئی کلیجے میں شندک۔“

حمیرا نے آتے ہی اپنا بیگ ایک کونے میں پھینکا اور چلا چلا کے ماں پہرے پر سنے لگی۔

”کہتا کہہا تھا میں نے کہ یہ ضد چھوڑ دیں۔ کیا کریں گی اس کی شادی کروا کے۔ مگر آپ نے ضرور گڑے نرد سے اکھاڑتے تھے۔ میں تو پہلے ہی جانتی تھی کہ یہ سب ہوگا۔ کتنا وقت لگا تھا یہاں آکر سنے سنے سے زندگی شروع کرنے میں اور آپ دونوں کی بیماریاں ختم کرنے ساری بنی بنائی عزت ایک بار بھڑکی میں ملا دی۔“

وہاں، آپ کو اجازت دیتی۔ اب صوفے پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں سر گرائے اور پچھلے  
آزاد میں روبرو بیٹھی۔ سویرا اسی کرے میں مکمل میں کئی میرا کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس نے پچھلے  
سے یہاں سے ٹھٹھا کا ہاتھ میرا نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے روک لیا۔ وہ بے بسی سے اسے  
دیکھ کر رہ گئی۔ اسی بے بسی کے ساتھ جس بے بسی سے اب زید اور عابد چودھری اپنی سب  
سے بی بی جمیرا کو اور آپ آزادی میں روئے اور ناراض ہوتے دیکھ رہے تھے۔

”آپ کو کبھی سب کا ناقص پتہ چانتے تھے کیا یا ضرور ہوگا پھر میری باز نہیں آئے اپنی کرنے سے۔ اسی لئے تو جب چاہے میری برادری کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔ اتنی توقع نہیں ہو رہی ہے کہ کو کچھ سے بچنے کی زحمت ہی کر لیں کہ کچھ بے آخر گزری کیا؟ کس کا نام کر رہی ہوں میں؟ شام کے وقت اکیلا ادھر کیا کرنے آئی ہوں.....؟ میرے بچے اور ماماں ساتھ کیوں نہیں ہیں؟“

”تم پوچھنے کا موقع دو تو میں پوچھوں۔“ ذکیہ نے ہمت کر کے کہنے کی کوشش کی۔ ”ہوا کیا ہے؟“

”کیا ہوتا ہے..... وہی ہوا ہے جو نصیبوں میں لکھا گیا ہے۔ لوگ برا کر کے پاتے ہیں، میں تو سیدھے نہیں کس کے برا کرنے کا عذاب سہہ رہی ہوں۔ آخر میں نے کیا کیا تھا جو میری پوری زندگی برباد ہوگئی، صرف اور صرف اس بد ذات کی وجہ سے۔“ اس نے روتے ہوئے سو راکھ کی جانب اشارہ کیا۔

سورانے ایک بار پھر منظر سے غائب ہونے کی کوشش کی۔ مگر میرا کی گرفت اس کے ہاتھ۔ اب بھی مضبوط تھی۔

”یہ کھا گئی ہے سارے خاندان کی خوشیاں..... یہ ذائقہ، یہ مکمل مہیری..... اچھا ہوتا اگر ای اسے پیدا ہوتے ہی مار ڈالتیں۔“

نے پلٹ کے باپ کی جانب دیکھا جیسے ابھی اس کی موجودگی کا احساس ہوا ہو۔ عابد چوہدری کی حال قدموں سے اپنے شکستہ و شرمندہ وجود کو گھنٹنے پارے لگے۔

کمرے کے ہولناک سکوت میں حیرا کی بھجری وحشتناک سانسوں اور سیریا کی دہلی دہلی سکیموں کی آواز ابھر رہی تھی۔ سیرا نے ایک بار پھر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ سیرا نے روٹی روٹی سرخ آنکھیں اٹھا کر ذکیہ کی جانب دیکھا۔ وہ نظریں چراگئیں۔ جہاں ایک جانب اسے لگے سے لگا کر تپتی دینے کو دل چاہ رہا تھا وہیں دوسری جانب حیرا کی ناراضی سے بھی خوفزدہ تھیں کہ کہیں بڑی بیٹی مزید نہ بچھڑ جائے۔

اس کے برعکس سیرا نے بھی اس معاملے میں غیر جانب داری سے کام نہ لیا تھا۔ وہ ہمیشہ سے حیرا کے متاب کے سامنے ذہال بنی آتی تھی۔ جب آصف کی ماں نے کانوں کو ہاتھ لگا کر تو بے ہوش ہوئے ان کی پہنائی ہوئی انگلی ذکیہ کی گود میں پھنسی تھی اور بے دردی کے ساتھ پھنسی کی انگلی سے مٹھنی کی انگلی کو بھی بکتے ہوئے تو پھنسی کر۔

”میرا لڑکا ہی رہ گیا ہے بدنامی کی گھڑی اٹھانے کو۔ رشتے دار کی الگ چیز، کوکھ کے بنے سے آگے کچھ نہیں ہوتا ماں! اچھے تمہیں آج اپنے بیٹے کی بربادی کا غم سٹارہا ہے، ایسے ہی میں بھی اپنے بیٹے کو روکا نہیں چاہتی۔ بار دوست لگے لگے کی باتیں سنائیں گے اسے۔ سالہا تو وہ قاتل..... ناماں! میرا بیٹا قاتلوں کیسے جوتم اپنی آوارہ رو تپوں پر قربان کرتی بھڑو۔“

”خدا کا خوف کرو بانو! مانا کہ تیری کوئی لڑکی نہیں مگر یہ بھی تیرے ہی بھائی کی بچپاں ہیں۔ یوں منہ بھر کے انجیل آوارہ کہنے سے پہلے کچھ تو سوچ۔“

دادی تو صدمہ کے مارے قوت کو پانی کی ٹوکھی تھی، البتہ ذکیہ نہ پڑے۔ الٹ پڑی۔ سیرا اب تک ہسپتال میں تھی اور سیرا کی اہل حال صورت حال کو اپنے طور پر سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی کم سن اس معاملے کو کھل کے واضح نہ ہونے دے رہی تھی ہاں مگر بھائی کے ہاتھوں ایک لڑکے کا قتل ہو جانا، محلے داروں کی چٹکھوں، ماں اور دادی کا ماتم اور اب پھو پھو کا آکر مٹھنی توڑنا اسے تیار رہا تھا کہ اس کی چھوٹی سی بہن بلبل کے ساتھ کچھ بہت غلط، بہت سنگین ہو چکا ہے۔ وہ کھرکھر پھو پھو کا پھرتا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”ج ہمیشہ کڑا ہوتا ہے ذکیہ! خود گلی کی گور لور پھرنے والی عورت۔ تیری بیٹیاں کون ہر دوہ کی دھلی ہوں گی۔ اس شہر، اس محلے میں بہتری بچپاں ادھر ادھر آتی جاتی ہیں۔ سودا سٹلہ بھی لاتی ہیں اور کسی کی بچی پو پھو بھی کسی نے نہیں ہاتھ ڈالا۔ آخر تیری بیٹی میں کیا نظر آئی۔“

”دفع ہو جانا تو..... دفع ہو جانا یہاں سے اپنی کالی زبان اور گندا دماغ لے کر۔“ بلا غ

بڑھی دادی چلا بھی تھی اور وہ شاید اس کی آخری چٹھ تھی۔

ماں کی تدفین کے لئے آئے عابد چوہدری کو جب ساری صورت حال کا پتہ چلا تب مگر میں ایک انگ بی قیامت تھی تھی۔ جسے اس نے بھی کسی سے دے نہ دیکھا تھا، وہ بالکل کم صم ہو گئی تھیں۔ سر جھکا ہے، چپ چاپ آنسو بہاتے وہ ہر اڑام سنی رہی تھیں اور وہ..... وہ جس کی وجہ سے یہ سارا فساد کھڑا ہوا تھا۔ اس پر توجہ دینے کا وقت کسی کے پاس نہیں تھا۔ ایسے میں صرف سیرا ہی تو تھی جو اس کے ساتھ لپٹ کر سوتی تھی تاکہ وہ راتوں کو بچھیں نہ مارے۔ وہی تھی جو اس کے منہ میں نوالے بنا بنا کر ڈالتی تھی، ورنہ اس حیران پریشان خوف زدہ بیٹی کو نہ کھانے کا ہوش تھا، نہ پینے اور نہ کھانے کا۔ حالانکہ سیرا کی اپنی عمر کا بھی، بھلے بیارہ سالہا۔ ہاں۔ مگر وہ اپنے سے ڈھائی سال چھوٹی بہن سے بے حد محبت کرتی تھی۔ یہ محبت حیرا کے سنگدلانہ رویے کے عمل کے طور پر بھی زیادہ ابھر کے سامنے آتی تھی کہ اسے بچپن کی مٹھنی ٹوٹ جانے کی ذمہ دار وہ بھی کہتی تھیں اور وہ تو قاتل اس کی بھڑا اس پر نکال رہی تھی۔

لاہور شفٹ ہونے کے بعد رنجنا بہتر ماحول میں آئے اور اچھے سکول میں داخل ہونے کے بعد سیرا کی عادات میں مزید تبدیلی آتی تھی۔ اب وہ بھلے بلی کا خیال رکھنا ہی کافی نہیں سمجھتی تھی بلکہ اسے زندگی کی طرف لانے کی اپنی عمار اور کچھ کے مطابق کوشش بھی کرنے لگی تھی لیکن حیرا کو اس کا یوں بھلا کر وہ زندگی کی طرف لانا بالکل پسند نہ آیا تھا۔

”مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا تیرا اس کے ساتھ بیٹھنا۔ یہ تجھے بھی خراب کر دے گی۔“ اس نے سیرا کو کھینچ کر اٹھانا چاہا۔

”اگر تم نے دوبارہ بلی کے بارے میں ایسا کہا نا باجی! تو میں اکی کو جاکے بتا دوں گی۔ وہ بے چاری تمہیں کیا کہتی ہے۔ تمہیں اچھی نہیں لگتی تو نہ کہی، مت بات کرو اس سے۔ مجھے روکنے کی ضرورت نہیں۔“

یہ جھڑپ آئے دن کا معمول تھی۔ یہاں تک کہ سیرا، حیرا کے ساتھ سکول جانے لگی۔ نیا ماحول۔ نئے لوگ۔ نئے دوست۔ بلی آہستہ آہستہ کہیں بہت پیچھے رہ گئی۔ اب یہ صرف سیرا ہی تھی جو اگر بہت زیادہ با اعتماد، بہت زیادہ مضبوط شخصیت نہ تھی لیکن اتنی سبھی ہوئی، اتنی کا پختہ ہوئی بھی نہ تھی جتنی وہ نو دس سال کی بلی۔ اس بات نے سیرا کو بھی بہت حوصلہ دیا۔ اس کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی تھی کہ سیرا اس کے سہارے کے بغیر بھی جینا سیکھ لے اور رفتہ رفتہ یہ ہو رہا تھا، یہاں تک کہ اس کی شادی کا ذکر ہونے لگا۔ اس موقع پر وہ ایک بار پھر گہرائی گہرائی نظر آنے لگی۔ یہاں بھی سیرا نے اس کی مدد کی۔

”تمہیں ایک نارمل زندگی جینے کا حق ہے، تم کسی سے کم نہیں بلکہ میں تو کہتی ہوں تم مجھ سے اور باقی سے بھی لاکھ دوپے بہتر ہو۔ نہ صرف عمل و صورت کے لحاظ سے بلکہ کردار و سیرت، تعلیم و ذہانت اور سلیقہ اور گھر ہستی کے لحاظ سے بھی۔ الحمد للہ تمہیں دین کی بھی سمجھ ہے اور دنیا کا بھی شعور ہے۔ تم بچہ وقت نمازی ہو۔ قرآن کی روح کو سمجھتی ہو۔ مجھ سے زیادہ بہتر اس بات کو جانتی ہو گی کہ اللہ کسی کو بھی اس کے جائز حق سے محروم نہیں رکھتا۔ زندگی کی خوشیوں پہ تمہارا بھی حق ہے۔ انہیں بے ججج وصول کرو اور اپنے دل میں کسی قسم کے دوسلوں کو جگہ مت دو۔“

لیکن سویرا اس ہدایت پہ مکمل طور پہ عمل نہ کر سکی۔ اس نے ماں باپ کی مرضی کے آگے سر ضرور جھکا دیا تھا لیکن وہ ان دوسلوں کو دل سے دور نہ کر سکی جو نہ پھانڑے اس کے سامنے کھڑے تھے اور وقت نے ان کے بدترین اندیشوں کو بچ کر دکھایا۔ ایک بار پھر اس کی زندگی ناقابل برداشت ذلت کی زد میں تھی۔ ایک بار پھر اس کی ماں کا سر جھکا ہوا تھا۔ ایک بار پھر باپ اندر سے کمرے میں منہ چھپانے رو رہا تھا۔ ایک بار پھر اس کی بہن اس پہ اپنے اجر نے کا اصرام کا منہ کر رہی تھی اور اس بار سہرا سوا لے اسے اپنے بازوؤں میں بچھنے کے اور کچھ نہ کر سکی تھی۔

پہلے کی طرح تسلی کے دو بول..... حوصلے کی کوئی کمک..... امید کی کوئی کرن اس کے پاس نہ تھی۔

☆=====☆

”کھانا گاؤں بیٹا!“ حق نواز گھر آیا تو تنہم تنگم نے پوچھا اور پھر اس کے انکار کے بعد گہری سانس بھر کے رہ گئیں۔

”جنا نہیں سب کی بھوک کو کیا ہو گیا ہے۔ فوزی بھی صبح بغیر ناشتے کے اپنے گھر لوٹی ہے۔ تمہارے ابا ہیں تو علاوہ دو کپ چائے کے اور کچھ معدے میں نہیں آتا۔ شاہ نواز بھی، کھانے سے منع کر رہا ہے۔ لودیکھو، چار بج رہے ہیں دوپہر کے اور ابھی تک ہمارے گھر میں کسی نے کھا نہیں کھایا۔ میں پوچھتی ہوں ابھی بھی کیا آفت ٹوٹ پڑی۔“ وہ کچھ ناراض ناراض سی بولیں۔

”نمیک ہے اچھی، پہلی شادی ہوتے ہوئے رہ گئی۔ کیا مجھے افسوس نہیں اس بات کا میں ماں ہوں، میرے اور ماں بھی تو پورے ہونے سے رہ گئے لیکن اب اس کا اتم عمر بچہ مٹایا جائے گا۔ مرد ذات ہے، آج نہیں تو نہ کسی۔ کل دوجی جگر رشتہ ہو جائے گا، اسی وجہ دھام سے بارات نکال لے جائیں۔ اب چھوڑ دو بھی اس بات کا چچما۔“

”ہاں وہ تو مرد ذات ہے، آج نہیں تو کل دو بجے رشتہ ہو جائے گا اور دھم دھام سے بارات بھی جائے گی تم تنگم تنگم! رو رہو کہ اس بچی کا رھبان آتا ہے جس کی اگلے دن بارات آتی تھی مگر.....“ رب نواز نے دھمی لہجے میں کہا۔

”ہاں اباجی! ابھی میں یہی سوچ رہا ہوں کہ ہم لوگوں پہ اس واقعہ کے اتنے دیر پا اور بدترین اثرات نہیں ہو سکتے۔ اس کے باوجود ہم اسے بھلا نہیں پارے۔ ہمارے گھر کے ماحول سے اس فرد کی اور دلوں سے رنج نہیں جا رہا تو اس گھر میں اس وقت کیا ماحول ہوگا۔ وہ لڑکی..... اس کے ماں باپ..... اس کے بہن بھائی.....“

”تو یہ سب کرنے سے پہلے انہیں سوچنا چاہئے تھا۔ ہمارا کیا قصور ہے؟ ہم کیوں مجرم بنیں اپنی نظروں میں؟“ تشیم تنگم نے حق نواز کی بات کا ڈی۔

”قصور تو ان لوگوں کا بھی نہیں تھا! اعلیٰ خالہ نے بغیر سوچے کچھ اتنا بڑا تماشا کھڑا کر دیا۔“

”تم تو چپ رہو۔ زیادہ انقلابی بننے کی ضرورت نہیں۔ قصور کیسے نہیں ہے ان کا۔ اگر اللہ نے ان کا پردہ رکھ لیا تھا تو کیا ضرورت تھی ایک بار پھر اپنا اشتہار لگوانے کی۔“ دافی، لڑکی کی شادی کرتا تو دھوکا دینا ہوتا ہے۔ عظمت بی بی نے ہمیں دھوکا کھانے سے بچایا ہے، کچھ غلط نہیں کیا۔“

”شاہ نواز! تم کیوں خاموش ہو، کچھ بولو گے نہیں۔“ حق نواز نے یہ ساری گفتگو ایک گہری چپ کے ساتھ سنتے ہوئے اپنے بھائی سے پوچھا۔

”کیا تمہارے خیال میں عظمت خالہ کا طرز عمل درست تھا؟“

”جنا نہیں..... شاید..... نہیں۔ انہیں اکیلے میں ہمیں یہ بات بتا دینی چاہئے تھی۔“

”جب..... جب تم کیا کرتے؟“ حق نواز نے بے تابی سے پوچھا۔

”مگ لوگ اتنا تماشا کھڑا نہ ہونے دیتے اور خاموشی سے واپس آ جاتے۔ دنیا کے سامنے بہانا بنایا جاسکتا تھا، ان کی بھی عزت رہ جاتی، ہماری بھی۔“

اس جواب پہ حق نواز کا سارا اشتیاق دھرا کا دھرا رہ گیا۔

”میں تو تم کو کہہ رہا تھا۔“ رب نواز نے تائید کی۔ ”دل پہ اس بات کا تو بوجھ ہے کہ ایک مظلوم بچی کا عیب ہماری وجہ سے ساری دنیا پہ لگ گیا۔ یہ عورتیں ہوتی ہی جلد بڑی ہیں۔“

”بس..... بس یہی ایک بوجھ ہے؟“ اس نے خطرے انداز میں باری باری دونوں کے حاسف چہرے دیکھے۔

”پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نہ تو اس لڑکی کو قبول امی کے ”داعی“ مانا ہوں، نہ ہی مجھے آپ کی اس بات سے اتفاق ہے کہ اس کے ساتھ گزرنے والا حادثہ اس کا عیب ہے اور مجھے آپ دونوں کی اس نرم دلی، اس ہمدردی اور خدا ترسی نے بھی رتی جھڑپ نہیں کیا۔ اگر آپ دونوں کے دل پہ کوئی بوجھ ہے بھی تو اصل میں آپ اس بوجھ کو کھینچیں پار ہے۔ یہ بوجھ تاسف میں سر ہلا کے اور اس لڑکی اور اس کے گھر والوں سے ہمدردی جتا کے یا عظمت خالہ کے سر پر سارا الزام ڈال کے ہلکا نہیں ہو سکتا۔ اس بوجھ کو جتانے کے لئے آپ کو حقیقی معنوں میں کوئی جرأت مند نہ قدم اٹھانا ہوگا۔“

”میں جانتا ہوں، تم کیا کہنا چاہتے ہو۔“ شاہ نواز کھڑا ہو گیا۔ اس کے انداز سے اضطراب ہو رہا تھا۔ ”بہتر ہوگا کہ تم اپنا منہ بند ہی رکھو۔ ہم میں سے کوئی بھی اس کا تحمل نہیں ہو سکتا۔ ایسی باتیں میں فکروں اور نادلوں تک میں پڑھنا پسند نہیں کرتا، اس لئے مجھ سے یہ امید نہ رکھنا۔“

”وہ لوگ اور ہوتے ہیں میرے بھائی! جن سے کوئی امیدیں رکھتا ہے۔“ شاہ نواز کے کورے جواب پر وہ تلخ ہو گیا۔

”چلو چھوڑو یہ باتیں، بلا وجہ بھائی بھائی کیوں اچھٹے ہو۔“ تنہیم بیگم اپنے چھوٹے بچے کی حراج آتشیں۔ اس کے چہرے کے تاثرات اور لمبے کے اتار چڑھاؤ میں کوئی غیر معمولی بات محسوس کر کے ٹھنک گئیں اور موضوع بدلنا چاہا۔

”اُمّ بھین ہی تو ختم کر رہا ہوں، اب اپنی امی اس لڑکی سے شادی کرنے پہ تیار ہوں۔“ وہ خود نہیں جانتا تھا کہ اس نے یہ فیصلہ کب اور کیسے کیا پھر کرنے سے پہلے ہی سنا ڈالا۔ جتنا باپنی سب اس اچانک دھماکے پر حیران تھے، اتنا ہی ششدر وہ بھی تھا۔ ابھی کچھ دیر قبل وہ اسی مسئلے پر تو رویہ سے ناراض ہو کر آیا تھا۔ راستے بھر دل میں اس سے گلے شکوے کرتا رہا تھا کہ کیا سوچ کے اس نے یہ تجویز اس کے سامنے رکھی اور اب وہ خود ہی.....

”تمہارا دامع خراب ہو گیا ہے حق نواز!“ شاہ نواز باہر نکلتے نکلتے پلٹا تھا۔ ”بیٹا! بات سوچ سمجھ کر کرنا چاہئے۔“ رب نواز جو کچھ دیر قبل غدا مت کا اظہار کر رہے تھے، اب ان کے چہرے سے ناگواری واضح تھی۔

یہ وہ بھی جانتا تھا کہ وہ یہ بات بغیر سوچے سمجھے کہہ گیا ہے مگر جب واقعہ تو یہ تھا کہ بہت سی سوچی سمجھی باتوں کے برعکس یہ بات کہہ دینے کے بعد وہ خود کو مطمئن محسوس کر رہا تھا۔ پچھلے دو تین دنوں سے ایک بے نامی غلطی نے اسے گھیرا ہوا تھا۔ اب وہ غلط کہیں نہیں تھی۔

”جب سے یہ اس اخبار کی نوکری کرنے لگا ہے، ایسی ہی ایسی سیدھی بکواس کرتا رہتا ہے۔ آپ تو جی سب سے پہلے اس کی یہ نوکری ختم کر لیں اور میں اتار لی ہوں اس کے سر سے یہ شادی والا بھوت۔“ وہ شخصیں نظروں سے اسے گھورتے ہوئے دیکھیں۔

”میں اس کی ساری چال سمجھ گئی ہوں۔ اصل میں تو یہ شادی کرنا چاہتا ہے اپنے ساتھ دفتر میں نوکری کرنے والی اس مرد مارعورت سے جس کی کبھی تصویریں اخبار میں چھپی ہوتی ہیں تو کبھی لی ڈی پی مردوں کے درمیان بیچ کر تقریریں کر رہی ہوتی ہے۔ اسے پتہ نہ ہوا کہ میں نے مر کے بھی ہاں نہیں کر لی، اس لئے دوسرا پتہ چھینک رہا ہے۔ ایسی جگہ شادی کرنے کی دھمکی دے رہا ہے کہ میں مجبور ہو کے خود کبہ دوں کہ نہ بیٹا! یہاں کا نام نہ لینا، اس سے اچھا ہے میں تمہاری شادی تمہاری پسند کی جگہ پر کرا دیتی ہوں مگر اس غلطی میں مت رہنا۔ میں ان بھوتوں ماؤں میں سے نہیں ہوں جو ایسی چالوں میں آکر ہلکے میل ہو جاتی ہوں گی۔“

”میرے خدا.....“ وہاں کوئی دوسری کوئی لانے پہ حیران رہ گیا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں۔“

”ایسی ہی بات ہے۔ کان کھول کر سن لو، نہ میں تمہاری شادی اس حرافہ سے ہونے دوں گی جو مردوں کے بھی کان کھرتی ہے اور نہ وہاں، جدر سے یہ ایک بار پھیلے ذلیل ہو کے آئے ہیں۔“

”اپنے خیال کی تصحیح کر لیجئے۔ آپ ذلیل ہو کے نہیں بلکہ ذلیل کر کے آئی ہیں اور میں اس غلطی کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ میں سے کوئی میرا ساتھ دے گا تو وہ مجھ پہ احسان نہیں کرے گا بلکہ اپنے جرم کا کفارہ ہی ادا کرے گا اور جو ساتھ نہیں دے گا، وہ یہ مت سمجھے کہ اس کے ایسا کرنے سے میری ہمت کمزور پڑ جائے گی۔“ وہ واضح الفاظ میں کہتا ہواں سے نکل گیا۔

تنہیم بیگم دیر تک غصے سے کھینچی ہوئی پروا میں تو کبھی بلند آواز میں سواری کو کوئے لگتیں۔ کبھی رومیہ ان کے عتاب کا نشانہ بنتی۔ رب نواز انہیں خاموش کراتے ہوئے یہ کہنا چاہ رہے تھے کہ یہ سب حق نواز کی وقتی جذباتیت ہے اور وہ حقیقت میں ایسا کچھ نہیں کرے گا جس سے اس کے ماں باپ کو گھٹیں پیچنے والوں سے الگ..... شاہ نواز بہت خاموش کھڑا تھا مگر اس کا چہرہ ہر بلر بلر بدل رہا تھا۔

کبھی وہاں خوف نظر آتا..... کبھی ملیش..... کبھی غم اور کبھی بے بسی۔

☆=====☆

”یہ تو ایک بہت معمولی واقعہ ہے رومیہ! حیرت ہے تمہارے جیسی لڑکی جو عملی صحافت میں اتنے عرصے سے ہے، وہ اس واقعے سے اتنی متاثر نظر آ رہی ہے۔“



فرخندہ لودھی نے اسے اتنا دسرب دیکھ کر کہا۔ رومیہ شاکی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔  
 ”آپ اسے معمولی واقعہ کہہ رہی ہیں فرخندہ! ایک لڑکی کے لئے وقت سے پہلے آپ کی  
 اور وہ بھی اس بے درد انداز میں حاصل ہونا عذاب نہیں۔“  
 ”نہیں! تو بہت بڑی بات ہے معمول بات تو وہ بھی نہیں ہوتی جب کوئی بد قریش لنگھا  
 قریب سے گزرتے ہوئے بد قیزی سے چھو کر گزرتا ہے۔“  
 ”آپ اس سلسلے میں کچھ کرنی کیوں نہیں؟“

”جس حد تک ہو سکا ہے میں اور میرے ساتھی کرتے ہیں مگر اس کے لئے ہمیں  
 والدین اور اساتذہ کا تعاون درکار ہے جو بد قسمتی سے ہمیں میسر نہیں۔ میں نے پچھلے دنوں ایک  
 ٹیچر زور کشاپ میں لیکچر کے دوران بے تحاشہ بیچش کی تھی کہ ٹیچر زور بھری لیول تک کے بچوں  
 کو مناسب الفاظ اور دوستانہ انداز میں یہ بتانا چاہئے کہ انہیں ایجنٹی لوگوں سے کس حد تک گریز  
 برتنا چاہئے۔ یہاں تک کہ اگر ان کے جاننے والے لوگ بھی اگر زیادہ سے زیادہ تکلفی دکھاتے ہیں تو  
 انہیں حراست کرنی چاہئے، اپنے والدین کو بتانا چاہئے لیکن میری اس بات کی بڑ زور مخالفت  
 ہوئی۔ خاص طور پر سکولوں کے مالکان کا یہ کہنا تھا کہ بچوں کے والدین اس ”سیکس ایجوکیشن“  
 پر اعتراض کر سکتے ہیں۔ اب تم ہی بتاؤ کیا اسے ”سیکس ایجوکیشن“ کے ڈمرے میں لا کر قابل  
 اعتراض ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ اس طرح تو سکول لیول تک سائنس کے مضامین میں سے بالوجہ  
 کو قسم کر دینا چاہئے اور گہروں میں بی بی، کیبل اور انٹرنیٹ کے ذریعے وہ اپنے بچوں کو جس  
 قسم کی ایجوکیشن دے رہے ہیں وہ کیا ہے؟ حقیقت تو یہ ہے رومیہ بی بی! کہ بچوں سے زیادہ  
 ان کے والدین کو شعور دینے کی ضرورت ہے۔ اس معاشرے میں بچوں کے ساتھ زیادتی کے  
 واقعات میں نوے فیصد ذمہ داران کے والدین ہوتے ہیں۔ ان کا اپنے رشتے داروں پہ حد  
 سے زیادہ اعتماد بھی یہ دن دکھاتا ہے تو کبھی اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف چاکے بڑھتے  
 ہوئے بچوں کو ”معصوم اور بے ضرر“ سمجھتا۔ وہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ان کے چندرہ سولہ  
 سال کے بھانجے جیسے ان کے بچوں کو خواہاں بھائی بھائی سمجھنے کے علاوہ کوئی اور خیال بھی دل میں  
 لاسکتے ہیں اور اس طرح بہت سے بچے کزنز کے ہاتھوں تباہ ہو جاتے ہیں۔ کبھی والدین کی  
 لاپرواہی یہ دن دکھاتی ہے۔ بچے دن کا بیشتر حصہ کہاں گزارتے ہیں، کس کے ساتھ رہتے  
 ہیں، کیوں رہتے ہیں، یہ جاننے کی ذمیت ہمیں تک نہیں کی جاتی۔“

”اوہ میرے خدا! رومیہ نے جھرجھری بی۔ بی معافی ہونے کے ناطے یہ خبریں اس کے  
 لئے معمول کا حصہ تھیں۔ اب تو ہر چہوڑنے بڑے شہر میں آنے والے واقعہ کی خبر آتی رہتی تھی

مگر ایک عورت ہونے کے ناطے وہ ہر بار اپنے دل کو کانپ اٹھنے سے روک نہیں پاتی تھی۔  
 ”نہیں رومیہ! یہ صرف نچلے طبقے کا ہی اہل نہیں، یہ رست ہے کہ جرائم کی شرح نسبتاً  
 اس طبقے میں زیادہ ہے۔ نشہ آور اشیاء کا استعمال بھی زیادہ نہیں ہوتا ہے مگر بچوں کا  
 استحصال..... یہ واحد مسئلہ ہے جو ہر طبقے میں یکساں اہمیت کا حامل ہے۔ ہائی فائیڈ پر کلاس  
 سے لے کر ڈل اور لوئر کلاس تک بچے ہر جگہ گن رہے ہیں۔ لوئر کلاس میں خاص طور پر بچی  
 آبادیوں اور جمہوریتوں کے رہنے والوں میں کم عمر بچوں کو ان کی تشہ آرزوئیں ایک چاکلیٹ،  
 ایک لالی پاپ یا دو تین روپے کے لالچ میں نشے کے عادی اور ہوس کے پجاریوں کے تحفے  
 زدہ کارڈز اور جمہوریتوں تک لے جاتی ہے تو مل کلاس میں خاص طور پر جوانیت فلیکس سسٹم  
 میں ماڈل کی بے توقیری انہیں برباد کر ڈالتی ہے۔ کام کا بوجھ اور فرائض کی زیادتی انہیں مجبور  
 کرتی ہے کہ وہ بچوں کو رشتے کے بھائیوں، چچاؤں، پھوپھاؤں اور خالوں کے سپرد کر دیں۔  
 اب اگر گھر میں تانیاں دادیاں موجود ہوں تو بچت ہو جاتی ہے، ورنہ زیادہ تر میڈیا کی کرم  
 نوازی کے باعث وقت سے پہلے جہان ہو جانے والے کزنز خود چاقو نہیں رکھ پاتے اور بے  
 چارے معصوم بچے اپنے ہی گھر میں لٹ جاتے ہیں۔ اپر کلاس میں یہ کام ملازموں اور  
 ڈرائیوروں نے سنبھال لیا ہے۔ ماں باپ دونوں جا ب کرتے ہیں یا ماں بے حد شغل ہے،  
 گھر میں کوئی بزرگ نہیں ہے، بچے دن کا بیشتر حصہ گھر یا اسکول کے ملازم کے ساتھ گزارتے ہیں۔  
 وہاں ان واقعات کا ہونا معمول کی بات ہے۔ باپ کرڈوں کی ذلیل کرتا اور ماں تقریبات  
 کے رتب کا قیدی رہ جاتی ہے اور بندہ کروں میں بچوں کی معصومیت تار تار ہوتی رہتی ہے۔“  
 ”اس فیصلہ میں آنے کے بعد میں نے اکثر سوچا ہے فرخندہ! کہ میں حیران ہونا چھوڑ  
 دوں مگر..... مگر میں اب نہیں کر پاتی۔“

”حیران ہونا کبھی موت نہیں رومیہ! جو لوگ حیران ہوتا ترک کر دیتے ہیں، ان پہ  
 بڑے سے بڑا، عقلمند سے عقلمند تر واقعہ بھی اثر نہیں کرتا۔ جب دل پہ کوئی چیز اثر نہیں کرے گی  
 تو دل، دل کب رہے گا، اس لئے حیران ہوتی رہتا۔ حیران ہوگی تو پریشان بھی ہوگی۔ پریشان  
 ہوگی تو کسی کے لئے کچھ کرنے کی خواہش پیدا ہوگی۔“ فرخندہ نے اس کا ہاتھ دبا دے  
 ہوئے کہا تھا۔

☆=====☆

اس نے تیسری بار رومیہ کی کال ڈس کنیکٹ کی تھی۔ وہ اس سے بات نہیں کرنا چاہتا  
 تھا۔ وہ اس کا سامنا بھی نہیں کرنا چاہتا تھا، اس لئے کل سے آفس بھی نہیں گیا تھا۔

”تم بیکار کی خدمت کر رہے ہو، جانے بھی ہو کہ اس سے ہمارے خاندان کو ناقابلِ حلانی نقصان پہنچنے والا ہے۔“

”میں اپنے خاندان اور اپنے خاندان کی آنے والی نسلوں کو ایک ناقابلِ حلانی نقصان سے بچانا چاہ رہا ہوں۔ میں نہیں چاہتا ہماری آنے والی نسلیں کسی بددعا کے اثر میں ہوں۔“

شاہ نواز خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھیں بجھ چکی گئیں۔ وہ ڈھسے جانے والے انداز میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔

”بددعا؟ مگر میں نے..... میں نے کچھ نہیں کیا اور ہم سب..... میرا مطلب ہے ہمارے خاندان کا کیا قصور ہے؟“

”تم نے کیسے کچھ نہیں کیا شاہ نواز! تم مرد ہو، خود بخود سب کچھ تمہارے ہاتھ میں تھا مگر تم روایات کے گمبے بے بس ہو گئے۔ کیا یہ تمہارا قصور نہیں ہے؟ کیا تم نے بددعا لینے والا کام نہیں کیا؟ کم از کم میں اتنی آسانی سے اس معاملے سے الگ نہیں ہو سکتا۔“

”لیکن تم..... حق نواز بات کو سمجھو، اس سے شادی نہیں کر سکتے۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔“

”تھوڑی بہت واقفیت اپنے دین سے مجھے بھی ہے اور میرے محدود علم کے مطابق کسی ایسی لڑکی سے نکاح کرنا کسی بھی طرح غلط نہیں قرار دیا جاسکتا جو کم عمری میں کسی کی جبری زانیہ یا شکار ہوئی ہو۔ جب اسلام کی رو سے یہ غلط نہیں، تو تم اور اس حوالے سے اسے غلط ثابت کرنا چاہتے ہو؟“

”تم سمجھتے کیوں نہیں، سب تباہ ہو جائے گا۔ مٹی میں مل جائے گا۔ کیوں نہیں مان جاتے تم۔ کیوں سب کچھ براہ کرنے سے تپے ہوئے ہو۔“ وہ اپنے بال دونوں ٹھٹھوں میں جکڑے مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔ حق نواز کو اس کا یہ الجھا ہوا انداز چونکا گیا۔ وہ اپنی منوانا جانتا تھا اور حق نواز پہ تو اکثر ہی اپنے بے پرن کارعب ڈال کر زبردستی اپنی مرضی چلا لیا کرتا تھا لیکن آج اس کے انداز میں محکم اور عرب کی بجائے بے بسی تھی۔ ایک عجیب طرح کی بے بسی تھی۔

”کیا براہ ہو جائے گا، کیا سمجھنا چاہتے ہو تم؟“ وہ آہستہ آواز میں کہتے ہوئے۔ اس کے بالکل سامنے ٹھٹھوں کے تل بیٹھ گیا۔

”سب..... سب کچھ..... یہ عزت..... یہ بھرم..... یہ نام اور..... اور یہ رشتے..... سب براہ ہو جائیں گے۔ اگر تم نے اس سے شادی کر لی تو..... وہ..... وہ بھر یہاں آجائے گی

”کیا کروں گا میں تم سے مل کے؟ کیا کہوں گا تمہیں کہ تمہارے جس مشورے پر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی اور میں تمہیں ہزار باتیں سناتا ہوں اسے اٹھ آیا تھا، یہ اعلان کر آیا تھا کر میں..... حق نواز..... دوسرے شمارے کے علاوہ کسی دوسری لڑکی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا، چند ہی گھنٹے بعد میں اپنے گھر میں ایک اور اعلان کر دیتا ہوں، سو میرا عابد سے شادی کرنے کا اعلان..... کیسے بتاؤں اسے اور بھلا اس کا ردِ عمل کیسا ہوگا؟ کیا وہ خوش ہوگی کہ میں نے اس کی بات مان لی یا پھر وہ حیران ہوگی کہ میں نے یہ بات کیسے مان لی یا پھر..... یا پھر دھکی ہوگی کہ میں نے یہ بات کیوں مان لی۔ اگر میں اس کے کہنے پہ فوراً یہ بات مان جاتا، تب شاید وہ خوش ہی ہوتی لیکن اس سے وہ سب کچھ دینے کے بعد، اس پہ اپنے سارے جذبے آشکارا کر دینے کے بعد اب میرا اتنی جلدی کسی اور سے شادی کا فیصلہ کر لینا کیا اسے دیکھ نہیں کرے گا۔“

یہ سوچتے ہوئے اس نے اپنا دل ٹٹونا چاٹا کر کیا وہ دیکھی ہے اپنے اس فیصلے پہ۔

دھکے کے بجائے ایک ہلکی سی کھک اور ٹھٹھا سا درد چھپا ہوا محسوس ہوا۔ دل کا وہ کونا جہاں اس نے بہت دنوں سے ایک خواب پیٹ پیٹ کر رکھا ہوا تھا، بہت اجڑا اجڑا کر رہا تھا مگر باقی کے حصے پہ اطمینان کا راج تھا۔ اسے اپنی جلد بازی پہ نفوس نہیں تھا، اسے اپنے اگلے فیصلے کے بے دھڑک اظہار پہ پچھتاوا بھی نہیں تھا، اس نے کوئی ایسا کام نہیں کیا تھا جس پہ اس کا ضمیر اسے صدمت کرتا یا اس کی محبت بے وفا کی کا اصرار عائد کرتی۔ حتیٰ کہ اسے تو یہ ڈر بھی نہیں تھا کہ دوسرے یہ سب جاننے کے بعد اس سے دور ہو جائے گی۔ وہ جانتا تھا اس کے اس فیصلے پہ سب سے زیادہ اہمیت بندھانے والی وہی ہوگی۔ اس کے باوجود اس کا سامنا کرنے سے کترا رہا تھا۔

”مجھے تم سے ایک بے حد ضروری بات کرنی ہے حق نواز!“ شاہ نواز نے اندر آ کر دروازہ لاک کرتے ہوئے پوچھا۔

حق نواز نے اسے غور سے دیکھا۔ دوسری ہوئی شیو، رت جیکے کا اشتہار بنی آنکھیں اور بے ربط لہجہ۔ اس نے اپنا سائل فون آف کر کے بیڈ پہ پھینکا اور اس کی بات سننے کے لئے تیار ہو گیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اسے کیا کہنا تھا۔

”تم نے گھر میں کیا فساد کھڑا کر رکھا ہے ختم کرو یہ فحاشا۔“

”مجھے تمہارے کہنے پہ میں کچھ بھی ختم نہیں کر سکتا۔ کیا میرے کہنے پہ تم دوبارہ میرا گھر کے نکاح کرنے چلو گے؟ نہیں نا۔ تو میں تمہارے کہنے پہ کیوں اپنا فیصلہ بدلوں؟“

رومیہ فوراً سب بھول بھال کے فرخندہ لودھی کے ساتھ ”معموم نگر“ جانے کو تیار۔

”مجھے اس قسم کی نہ تو کوئی امید ہے نہ خواہش اور نہ ہی آپ کا بیٹا محض مجھے خوش کرنے کے لئے سویرا سے شادی کرنا چاہ رہا ہے۔ ہاں ہو سکتا ہے، وہ ایسا صرف اللہ کی خوشنودی

تھی۔ شہر میں موجود دوسرے بہت سے عظیم خانوں اور دارالامانوں سے بالکل مختلف ماحول تھا یہاں کا۔ یہاں ایسے بچوں کو اخلاقی سدھار کے لئے خاصی طور پر رکھا جاتا تھا جو حالات کی وجہ سے بچپن کی مصعوبیت کو ترک کر کے جرائم کی راہ پر چل پڑتے تھے۔ یہاں رکھ کے انہیں معاشرے کا کارآمد اور فرض شناس افراد بننے کی تربیت دی جاتی تھی، اس کے بعد وہ اپنی راہیں منتخب کرنے میں آزاد ہوتے تھے۔ یہاں ایسے لاوارث بچے بھی ہوتے تھے جن کے ماں باپ انہیں قبول کرنے سے انکاری تھے اور بھر پور اپنی جگہ ایک کہانی تھا اور روپیہ انہی کہانیوں کو ترتیب دے کر آج کل وہ سلسلہ وار بیچ کر رکھی تھی جو عوام میں تھمک چکا رہا تھا۔

”مقامی پولیس نے بچوں کا ایک گروہ پکڑا ہے جو جسم فروشی کے مزدور پشے سے منسلک ہیں۔ اس گروہ میں چھ سال سے لے کر سولہ سال تک کے بچے شامل ہیں۔“

”اسے تم کو میرے... یہ بچے اپنی مرضی سے تو اس دھندے سے وابستہ نہیں ہوں گے۔“

”یقیناً ان کے پیچھے کوئی بڑا ہاتھ ہے مگر ان بچوں میں سے اکثریت کو کچھ کرایا نہیں لگتا کہ وہ زبردستی یا مجبوراً یہ کام کر رہے ہیں۔ شاید ان کی برین واشنگ کی گئی ہے یا پھر نشتے کی زیادتی نے ان سے کسی بھی اچھائی برائی کی تمیز کرنے کی صلاحیت چھین لی ہے۔ میرے وکیل نے ان بچوں کی سکڑی حاصل کر لی ہے، کیونکہ مجھے خطرہ ہے اس گروہ کے پیچھے جو بھی ہے، وہ ان بچوں کو جان سے مارنے کی کوشش ضرور کرے گا۔ جس بچے کی وجہ سے پولیس اس گروہ کو قابو میں کر پائی ہے، وہ ایک چودہ سال کا لڑکا ہے۔ سو یہ سرحہ سے کچھ دن قبل آئی ہے اور نشتے کی حالت میں اپنے لئے کاہک تلاش کر رہا تھا۔ آؤ میں تمہیں ان بچوں سے ملوانی ہوں۔“

روپیہ فوراً فرخندہ کے ہمراہ ان لڑکوں سے ملے انہی تھی، مگر وہاں اس کے چہرے ایک ایک کے بعد ایک دیکھتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ یہ کس قدر مشکل کام تھا۔

ان چہروں پر کیا کچھ نہیں تھا۔ بھوک، افلاس، جبر... نفرت... کراہیت، مظلومیت سب تھا۔ اگر نہیں بھی تو مصعوبیت، جو اس عمر کا امتیاز ہوتی ہے۔ اسے ان ”بالغ آنکھوں“ میں جھانکنے سے خوف آ رہا تھا۔

”اور یہ گل شاہ... عمو چودہ سال مگر نشتے کی زیادتی اور جسم فروشی نے جس کے اندر چودہ دنوں کی زندگی بھی باقی نہیں رہنے دی۔“

وہ اس وجود کے آگے ہنسنے لگی۔ وہ دبا ہوا چٹا، لمبا سا اور بکھرے ثیالے بالوں والا لڑکا

ٹھنڈے فرش پر ہاتھ پر موڑے، نیکر حائیز ہار سا پڑا تھا، اس کا سر دیوار سے لگا ہوا تھا۔ پتہ نہیں کیوں روپیہ کا شہادت سے جی چاہا، وہ اس کا چہرہ دیکھے۔ حالانکہ اس سے پہلے چار چہرے دیکھ کر اس نے دلی دل میں سوچا تھا کاش وہ یہ چہرے نہ دیکھتی۔

مگر اس چہرے کو دیکھنے کی چاہ اتنی بڑھی کہ وہ کھٹنوں کے ٹل بیٹھ گئی۔

”سنو...! اصرہ دیکھو۔“

پتہ نہیں اس کی آواز روپیہ تک پہنچی یا نہیں۔ وہ اپنے دھیان میں دیوار پر اپنی سوکھی زرد انگلیوں سے کچھ لکھ رہا تھا، روپیہ نے غور سے دیکھا چاہا کہ اس کی انگلیوں کی حرکت کیا لفظ بن رہی ہے اور جب وہ چونک سی گئی۔ اس کی کٹھالی پر ایک گہری چوٹ کا نشان اسے بہت کچھ یاد دلایا تھا۔ وہ بے چین ہو کر کھڑا اور آگے ہوئی۔ اس لڑکے کے شانے پکڑ کے اس نے اس کا رخ اپنی جانب کیا۔ وہ شہد سے بندھوتی آنکھیں... رال دیکھتے سفید لب... اتھے سے جڑی گھٹی جھنوس... ستواں ناک اور اس کے عین اوپر سرخی مائل مجبور اس۔

”علی...“ روپیہ کے حلق سے کراہ نکلی۔ اس سے چند قدم آگے چلتی فرخندہ ٹھک کے ٹپٹی تھی۔

”تم علی ہونا... میرے علی... ماما کے علی...“

”پانچ سو روپیہ صاحب، صرف ایک ٹھنڈے خوش کردوں گا صاحب... بس پانچ سو روپیہ...“ وہ بڑبڑا رہا تھا۔

”علی...“ وہ جھپٹی۔

☆=====☆

دس سال کے اس صحت مند، گورے چٹے اور بس کچھ بچے پہ الفت خان کی نظر عرصے سے تھی لیکن وہ اپنی نوکری خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ علاقہ غیر میں اس کا خاندان چار لاکھ روپے کا مقروض تھا۔ ایسا قرضہ جو بٹلوں سے اترنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ البتہ، سود بڑھاتا جا رہا تھا۔ وہ اور اس کے دونوں بھائی لاہور اور کراچی میں دن رات جانا تو ذمہ دت کے بعد سود کی اس بھاری سبیل کو ذرا سا پرے سرکے کٹے کو کوشش کرتے۔ چالیس سال کے قریب عمر ہونے کے باوجود اب تک الف خان کی شادی بھی نہ ہو سکی تھی۔ وہ وہی قرضہ... اپنی فطری اور جائز خواہشات کی تکمیل کے لئے اس نے اپنے ہی جیسے دوستوں کا بتایا، ناجائز اور غیر فطری راستہ تلاش کر لیا تھا لیکن اس ایسے علاقے میں موجود ہونے کے لیے سرکاری افسروں اور کاروباری افراد کی یہ رہائش بلڈنگ... اس میں نوکری ملنے کے بعد اس کی تسکین کا وہ مکر وہ

”آہستہ بولو۔ چلانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ سوائے اس کے لڑائی لہو کھینک پڑ جائے گی اور جو سال لے کر میں تمہارے سامنے کھڑا ہوں، ان کے لوں پہ بھی یہی سوال ہوگا۔ جب تک تم مجھے پوری بات نہیں بتاؤ گے میں تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔“

”کیسی پوری بات؟ میں کچھ نہیں جانتا۔“ اس نے اٹھ کر جانے کی کوشش کی مگر حق نواز نے سختی سے اس کا بازو تھام کر اسے دوبارہ صوفے پر مگرادیا۔

”سیدھی طرح میرے سوالوں کا جواب دو ورنہ میں یہ بھول جاؤں گا کہ تم میرے بڑے بھائی ہو۔“

”وہ تو تم بھول چکے ہو۔ جب میں کہہ رہا ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا، کوئی تعلق نہیں ہے میرا سویرا سے تو تم ان کیوں نہیں لیتے۔ کیوں مجھے زکر کر رہے ہو۔“

”میں تمہاری زبان سے نکلے الفاظ کو نہیں تمہاری آنکھ کے خوف کو جانتا ہوں۔ یہ خوف ظاہر کر رہا ہے کہ تم اپنے اندر کوئی بچ چھپائے ہوئے ہو ایک ایسا شرمناک بچ جو۔۔۔۔۔“

”کیوں بند کر۔ کوئی بچ نہیں ہے میرے پاس۔ مجھے کوئی خوف نہیں ہے۔ میں کسی سے نہیں ڈرتا۔“

”اللہ سے بھی نہیں؟“ حق نواز نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے پوچھا۔ وہ ایک دم غصہ ہو گیا۔

”اور وہ ڈر کیا تھا جو میری سویرا سے شادی کے ذکر پہ تمہیں پریشان کر گیا تھا۔ تم نے یہ کیوں کہا کہ وہ تمہیں بچکانہ جانے گی۔ کیا بچکانہ جانے کی وہ۔۔۔۔۔ بول شاہ نواز! کب دیکھا تھا اس نے تمہیں؟ کیا تو سال کی عمر میں۔۔۔۔۔ کیا ان دنوں جب تم بور یوالہ گئے تھے؟“

”میں تو عرصے سے بور یوالہ نہیں گیا۔“ شاہ نواز نے پست لہجے میں کہتے ہوئے سر جھکا لیا۔

”ہاں، میں جانتا ہوں، سب جانتے ہیں کہ پہلے بہت شوق سے خالہ کے ہاں بھاگ بھاگ کر جانے والے شاہ نواز نے ایک دم ہی وہاں جانا ترک کر دیا تھا مگر آخری بار تم اپنے اتر کے استحقاق دینے کے بعد چھٹیاں گزارنے وہاں گئے تھے۔ ذرا سی تحقیق کے بعد پتہ چل سکتا ہے کہ کیا سویرا کے ساتھ ہونے والا حادثہ بھی انہی دنوں ہوا تھا یا۔۔۔۔۔ یہ بھی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ قتل ہونے والے لڑکے سے تمہارا میل جول تھا یا نہیں؟“

”میری ٹٹی سے دور کی سلام دعا بھی نہیں تھی۔“ وہ جلدی سے کہہ اٹھا تو حق نواز کے

ذریعہ بھی بند ہو گیا جو ٹیکسری کی چوکیداری کے دوران اسے میسر تھا۔ تنخواہ اچھی خاصی تھی جس سے وہ ہاتھ نہیں دھونا چاہتا تھا، مگر دوسری جانب گھنے سگی بالوں اور چمکی جلد والا علی اس کے اندر کے شیطان کو اکثر کھڑا کرتا رہتا۔

اس دوپہر بھی یہی ہوا۔ علی کے دوست اس کے ساتھ کھینے نہیں آئے تھے۔ کیا ڈنڈ ویران پڑا تھا۔ غلی پور ہونے کی وجہ سے بار بار الفت خان کے گرد چکر کاٹ رہا تھا۔ تاکہ اس سے باتیں کر سکے۔ اپنا دھیان ملانے کے لئے الفت خان نے ننھے کی دگنی مقدار لینے کا حربہ بھی آزمایا، مگر اس کے نتائج زیادہ خطرناک نکلے۔ شیطان اس پہ مکمل طور پہ حاوی ہو گیا۔ وہ علی کو بہلا پھسلا کے اپنے کوارٹر لے گیا۔ نشہ آور دوا میں پیچھا روناں اس دن سالہ بچے کو ہوش سے بچا دینے کے لئے کافی تھا۔

مگر خود الفت خان کو جب ہوش آیا تب تک شام کے سامنے گھرے ہو چکے تھے۔ بلڈنگ کا دوسرا گیت کبیر اس کے ساتھ اس کوارٹر میں رہتا تھا اس کے آنے کے بعد علی کو چھپانا نامکن ہو جاتا تھا۔ جواب تک بے ہوش پڑا تھا اور اگر کسی کے آنے سے پہلے علی کو ہی ہوش آ جاتا تو تب بھی مشکل ہو جاتی۔ اس کی ماں کے واپس آنے کے بعد اسے ڈھونڈنے کا عمل بھی شروع ہو جاتا ایسے میں الفت خان کو اپنا بھائی پر بت خان یاد آیا۔ اس نے نزو کی پٹی سی او سے فون کر کے اسے جلد از جلد یہاں پہنچنے کو کہا۔ اس کے آنے کے بعد علی کو بے ہوشی کی مزید دوا سگھائی گئی۔ پر بت خان اسے اپنے ایک جاننے والے کے رکشے میں لاد کے بلڈنگ کی پچھلی جانب سے فرار ہو گیا۔

یہاں سے علی صوبہ سرحد پہنچا، پر بت خان نے اس کو بصورت لڑکے کے اچھے دام وصول کئے۔ چار سالوں میں ان گنت شیطانوں کی ہوس کا نشانہ بننے کے بعد وہ پولیس کے ہتھے چڑھ گیا اور یہاں سے رومیہ کو اس حال میں ملا کہ اس کے بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔

فرخندہ لودھی نے اسے فوری طور پہ ہسپتال داخل کروایا۔ رومیہ اب تک فیصلہ نہ کر پائی تھی کہ علی کے شے کی اطلاع اپنی ماں کو دے۔۔۔۔۔ یا نہیں۔

”پتہ نہیں یہ ان کے لئے خوش خبری ہوگی یا؟۔۔۔۔۔؟ پتہ نہیں علی کو کچھ کر وہ پھر سے جی اٹھیں گی۔ یا۔۔۔۔۔ یا پھر جیتے جی مر جائیں گی۔“ سوچوں نے اسے غر حال کر دیا تھا۔

☆=====☆

”تم میرا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟“ شاہ نواز چلا اٹھا تھا۔

لیوں پہ ایک تھکی تھکی... بھیجی تھی ہی سکرابت آئی۔  
”ٹلی...؟ تو یہ نام تو اس جنم کی کا۔“

شاہ نوازیوں بہت ہوا جیسے اب اس کے پاس مزاحمت کرنے کی نہکت ہونہ ہتھیار۔  
”میں... میرا یقین کرو، میری کوئی غلطی نہیں۔ وہ ٹلی ہی... میں تو۔“  
حق نواز دھیان سے اس کا اچھا ہوا بیان سننے لگا۔

☆=====☆

”میں آخری بار پور پال دیا گیا تھا جب میرا انٹر کار رزلٹ آنے والا تھا۔ چھٹیوں میں تم عموماً چچا جان کے ہاں جایا کرتے تھے اور میں خالہ کے پاس یہاں۔ حالانکہ نہ تو خالہ، امی کی سگی بہن میں نہ ہی اس شہر میں میری دلچسپی کا خاص سامان تھا۔ ان کے دونوں بیٹے حوا جابھ سے بالکل الگ تھے۔ اس کے باوجود میں یہاں آ کر پسند کرتا تھا کیونکہ میرے احساس برتری کو تسکین پہنچانے کا بہت سا سامان تھا۔ میرا لاہور سے آنا، وہاں کے کالج میں پڑھنا، میرا بل ولیم۔ میری انگریزی، میرا لباس میرے جوتے، وہاں کے پیئڈ لڑکے مجھے ہیرو کہہ کے بلایا کرتے تھے، میں بھی ان میں بیٹھ کے خود کو کسی ہیرو سے کم نہیں جانتا تھا اور لمبی لمبی گھیس چھوڑ کے انہیں مزید متاثر کیا کرتا تھا۔ حالانکہ نہ تو میں کواکجو کیس میں پڑتا تھا نہ ہی ہمارے گھر کا محل بہت زیادہ ایلوڈانس تھا اس کے باوجود میں اپنی فرضی گرل فرینڈز کے ساتھ اپنے بے باک تعلقات بڑھا چڑھا کر بیان کرتا۔ جب کہ حقیقت میں میرا کسی نہ کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ نہیں کیے عادت کیسے پروان چڑھی۔

ان دنوں میری ملاقات اس سے ہوئی۔ سویرا سے نہیں بلکہ اس کی بڑی بہن سے۔ وہ صادق بھائی کی دکان پہ آئی۔ میں فارغ وقت اس دکان پہ گزرتا جہاں میرے پرستاروں او دوستوں کا رش لگا رہتا تھا۔ ایک دن جب وہ آئی تو میں اکیلا تھا۔ وہ بہت حسین نہ تھی، منفرد دھج نہ تھی جسے دیکھ کر آپ نظر سے جھکا لیں یا چا لیں۔ وہ ایسی لڑکی تھی جسے دل ہی دل سے پسند کرتے رہنے کے باوجود آپ اس سے اظہار کرتے ہوئے ڈریں یا جھجک جائیں۔ وہ ایک ایسی لڑکی تھی جو آپ کو کچھ کرنے، کچھ کہنے، کچھ کھلنے پہ آسانی ہے۔ اس کی شوخی اور طراری نے ہی مجھے افسوس کیا۔ مجھے موقع ملا کہ میں اپنے دوستوں پہ ثابت کروں کہ میں صرف باتیں ہی نہیں بناتا، بلکہ حقیقتاً لڑکیوں کو مٹھی میں کرنا جانتا ہوں۔ مجھے میری عمر بھی ایسی تھی کہ ماحول اور صحت کا تقاضا۔ میں جلد اس سے بے تکلف ہو گیا۔

اس بے باک لڑکی نے میرے اندر جذباتوں کی آج بھکا کر ہاتھ کھینچ لیا۔ بہت برا

www.pdfbooksfree.pk

اس نے۔ ورنہ میں برا نہ تھا۔ وہ میرے ساتھ کھیل رہی تھی۔ آلو بنا رہی تھی مجھے۔ جن دوستوں کے سامنے میں ڈنکے مار رہا تھا ان ہی کے سامنے وہ مجھے تھپہ مار گئی۔ ٹلی نے مجھے بدلہ لینے پر اکسایا۔ اور... اور اس کی چھوٹی بہن کو بھلا چھلا کے اپنی دکان پہ لے آیا۔ میں کچ کھد رہا ہوں، میری نہ تو سبکی نیت تھی نہ یہ پلان۔ ٹلی خود بدیت تھا اور اپنی غرض سے ایسا کر رہا تھا اور احسان وہ مجھ پہ جتا رہا تھا۔ میں نے منع کیا۔ خود نکا چا پا سے محراب تک وہ اس کے ہاتھ پیر باندھ کے اس کے منہ میں کپڑا ٹھوس چکا تھا۔ میں بری طرح بھٹس گیا۔ اس نے ایک ایسی فلم دکھائی جس سے میرے حیوانی جذبات بھڑک گئے۔ میں اس کا ساتھ دینے لگا۔ مگر اس بچی کی کم سن، آنکھوں کا ہراس، اس کا چڑیا کے بیٹے کا پتا جسم۔

میں ہوش میں آ گیا۔ مجھے اپنے آپ سے عمن آئی۔ مجھے اس بچی کی جگہ فوری نظر آئی۔ میں نے ٹلی کو پیٹ ڈالا جو اس وقت درندہ بن رہا تھا۔ وہ میرے قابو میں نہ آیا تو میں وہاں سے بھاگ نکلا۔ راستے میں صادق بھائی ملے تو انہیں واپس کا بتا کر لاہور آ گیا۔ اور... اور سالوں سے میرے دل سے یہ ملا نہیں جاتا۔ یہ بچپن کا دامن نہیں جاتا۔ کاش... کاش میں نے ٹلی کو رک دیا ہوتا جب وہ اس بچی کو کہا نے سے اندر لا رہا تھا۔

کاش میں صادق بھائی کو لے کر ٹلی کی دکان تک واپس چلا جاتا۔ اس بچی کو بچا لیتا۔ کاش... کاش مگر میرا یقین کو حق نواز! میں نے کچھ نہیں کیا۔ نہ میرا ارادہ تب اس بچی پہ غلط نگاہ ڈالنے کا تھا، نہ ہی میں اسے اندر لا چا جاتا تھا۔ ہاں چند بے بس کر دینے والے لمحات میں، میں نفس کا ظالم ضرور بنا مگر بس۔ بس چند لمحوں تک۔ میرے ہاتھ صرف اسے چھونے کے گناہ گار ہوئے تھے تب سے میں انہیں پاک کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس ایک لمحے کی غلطی کے بعد میں نے کسی گناہ، کسی لغزش کو اپنے قریب نہ پھٹکے دیا۔ تم گواہ ہو میری پراسانی کے۔“ وہ جگمگاتھا۔

”پراسانی نہیں شاہ نواز! یہ تمہارا گلت تھا۔ میں اکثر تمہارے غیر معمولی طرز عمل کی وجہ جاننے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ تمہارا حد سے بڑھا ہوا مذہبی رجحان، پائی تابی کا جنون، پردے اور عورت کے بارے میں کٹر خیالات۔ یہ سب تمہارے اندر کی نفسیاتی گرہ تھی۔ دراصل تم اپنی پراسانی ثابت نہیں کر رہے تھے، بلکہ اپنی روح سے تنہری نیجاست کو دھونے کی کوشش کرتے رہے اور تمہارا ہی مرض انجی اور بڑے گناہ شاہ نواز۔ اب جب تم اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ چکے ہو کہ اس بے گناہ بچی نے تمہاری وجہ سے کسی زندگی گزاری ہے، گزاردی آ رہی ہے اور آئندہ گزاردی والی ہے۔ تم یہ جان چکے ہو کہ اس پورے خاندان پہ کیا گزری چکی ہے۔ اب

تم ہل ہل مرو گے..... سکو گے۔ مگر نجات نہیں حاصل کر سکو گے۔ اس احساسِ گناہ سے تم کتنا ہی چلا چلا کے کیوں نہ اعلان کرو کہ تم نے کچھ نہیں کیا..... یہ تم بھی جانتے ہو کہ تم کیا کر چکے ہو۔“

”میں کیا کروں..... کیا کروں جو میری ذات سے یہ داغ وصل جائے۔ میری روح ہلکی پھلکی ہو جائے۔“ وہ کہا۔

”تم کہہ دو شاہ نواز! جو میں کرنے جا رہا تھا۔ یہ فرض تو تمہیں ادا کرنا ہے اور اگر تم نے قدم اٹھے نہ بد بھائے تو سمجھو، پچھتاوے کے ناگ بیشہ بیشہ کے لئے گلے میں ڈال لئے ہیں۔ اب تلافی کی یہی ایک صورت بچی تھی۔“

”میں کیسے اس سے شادی کروں، امی نہیں مانیں گی..... ابا بھی کیا سوچیں گے، یہ دنیا کیا کہے گی؟“

”اور اللہ..... اللہ کے بارے میں سوچو شاہ نواز! شاید تمہارے اس اقدام سے وہ تمہارے بارے میں رعایت کر ڈالے۔ میں تو یہ کام نکل سمجھ کے کرنے جا رہا تھا۔ ثواب کمانے..... مگر تمہیں تو کفارے کے طور پر کرنا ہے۔“ اس نے رمان سے اسے سمجھایا تھا۔

☆=====☆

حق نواز نے سویرا سے شادی کی بات کر کے وہ طوفان کھڑا نہیں کیا تھا جو شاہ نواز کے اعلان نے کر دیا۔

”میں پوچھتی ہوں تم دونوں بھائیوں کو ہو کیا گیا ہے۔ ایسا کون سا مگر پھونک ڈالا ہے اس پردہ دار بی بی نے جو کبھی ایک اس سے بیاہ رچانے کو اتالا ہوا ہے تو کبھی دو جا۔ کان کھول کر سن لو دونوں۔ میں یہ ڈرا سے باز نہیں چلتے دوں گی۔ وہ لڑکی اس گھر کی بہو کبھی نہیں بنے گی۔“ تنسیم بیگم نے واشگاف الفاظ میں اعلان کیا۔

”وہ لڑکی اس گھر میں آپ کی بہو بن کے ہر حال میں آئے گی امی! اور ایسا شاہ نواز کو ہی کرنا ہوگا۔ میں نہ صرف اس کے ساتھ ہوں بلکہ اسے کبھی کمزور پڑتے دیکھا تو مجبور کر کے بھی۔ یا زبردستی یہ کام کرواؤں گا۔“

”تمہیں یہ حق کس نے دیا ہے، زبردستی کرنے کا۔ میں تمہیں اپنے گھر کو بر باد نہیں کرنے دوں گی۔“

”میں اس گھر کو بر باد ہونے سے بچانے کی ایک کوشش کر رہا ہوں۔ یہ بات میں کرنا تو نہیں چاہتا تھا، لیکن میرا خیال ہے مجھے مجبوراً کرنا ہو گا۔ امی! اگر آپ اس خاندان کی

آنے والی نسلوں کو کسی عذاب یا قہر الہی سے بچانا چاہتی ہیں تو اس مظلوم لڑکی کا گھر برباد دیں۔“

”تم کھل کے لڑو، مجھے عذاب الہی سے ڈرا رہے ہو۔ شرم نہیں آتی؟ کون سے گناہ کر ڈالے ہیں میں نے..... اور میرا بیٹا کیوں ہے ثواب کمانے۔ وہ شیخ وقت نمازی، پرہیز گار..... دین کا پکا..... پاک خیالات والا، اس کے لئے تھوک کے چھٹکی صحت ہی رہ گئی ہے اور وہ مظلوم ہے تو ہوگی ظلم کیا میں نے یا میرے خاندان نے کئے ہیں جو عذاب ہم پہ نازل ہوگا۔“

”ہاں..... ان کے غیض و غضب کے آگے حق نواز کا غصہ اس لیے میں کہا گیا ایک لفظ بند باندھ گیا۔ وہ یک دم چپ ہو کر دونوں کا چہرہ دیکھنے لگیں۔ شاہ نواز کی چیشانی عرق آلود تھی۔ رنگت سفید پڑی تھی لگتا تھا جیسے وہ ابھی کر جائے گا۔

”شاہ نواز یہ اعتراف کر چکا ہے کہ تیرہ سال قبل سویرا کے ساتھ ہونے والے حادثے میں وہ بھی شریک تھا۔“

تنسیم بیگم جھاک کی طرح غصہ دی ہو کر بیٹھ گئیں۔ ایک بار پھر بی بی آس کے ساتھ انہوں نے اپنے بڑے بیٹے کا چہرہ دیکھا۔ وہ بیٹا جو ان کا مان تھا، بڑھتا..... غرور تھا..... ان کا اٹھا ہوا سر تھا۔ آج وہ سر جھکا ہوا تھا۔ وہ منہ پہ دوپٹہ رکھ کے گھٹی گھٹی سسکیاں روکنے لگیں۔

”میں نے کہا تھا کہ میں یہ صورت حال برداشت نہیں کر پاؤں گا۔ اتنی ذلت اور اتنی شرمندگی اٹھانے کی سکت نہیں ہے مجھ میں۔ ابھی تو ان لوگوں کے ہاں سے نہ جانے کتنا ذلیل ہونا پڑے گا۔“ شاہ نواز ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”میں وہاں نہیں جاؤں گی۔ کیا منہ لے کر جاؤں کیسے اپنے بیٹے کے کرتوت کو خطیہ کھاؤں مجھے تو معاف رکھو۔“ انہوں نے ہاتھ جھڑے۔

”بی بی! ان اس سب کی ضرورت نہیں۔ اللہ کا نام لے کر اس نیک کام کا آغاز کیجیے اور شاہ نواز! تمہیں قبل از وقت پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس حادثے کو ایک عرصہ بیت چکا ہے۔ سویرا کے تمہیں بچانے کے امکانات صفر ہیں کیونکہ تم کہہ چکے ہو کہ تم وہاں سے نکل آئے تھے۔ اگر اللہ نے تمہارا پردہ رکھنا چاہا اور تمہارے کفارے کو یا تمہاری توہ بہ کو شرف قبولیت بخشا تو بغیر اس کے سامنے عیاں ہوئے بھی تم دونوں ان شاء اللہ ایک خوشگوار زندگی گزار دو گے۔ ہو سکے تو تم دونوں کچھ عرصے کے لئے کہیں اور شفٹ ہو جاؤ۔ وقت سب سے

بواہم ہے۔" حق نواز نے اس کا حوصلہ بڑھا یا۔

☆=====☆

"کتنی مشکل سے دھوپڑا ہے جہیں۔ کہاں کم ہوگی جس تم؟" حق نواز نے رومیہ سے پوچھا۔ آج کتنے دنوں کے بعد دونوں ویر ہوئے۔

"جس؟ جس کم ہوئی تھی؟ رابطے میں تو تم نہ آ رہے تھے۔" رومیہ نے مسکرائے کی ناکام کوشش کی۔ "میرا نمبر دیکھ کر تکلف آف کر دیتے تھے۔"

"وہ ایک وقتی تھی تھا۔ جس تم سے کتنا انہیں رہا تھا۔ بلکہ کچھ مہلت لے رہا تھا۔ صرف دو دن۔ صرف دو دن۔۔۔۔۔ اور اس کے بعد سے میں مسلسل جہیں تلاش کر رہا ہوں۔ آغوش کیوں نہیں آ رہیں تم اور یہ فرشتہ لودھی کے پاس دیر سے کیوں بھڑکے ہیں تم نے؟"

جواب میں رومیہ نے اسے ساری کہانی مثالی ڈالی۔ علی کے لئے سے لے کر اس کے گزرنے چار سالوں تک کی داستان۔

"میں بہت الجھ مٹی ہوں۔ کچھ میں نہیں آ رہا کیا کروں۔ علی کے لئے انصاف طلب کروں یا ماما کو ان کا علی ٹوٹاؤں۔ ماما نے چار سالوں تک علی کی جدائی بہت مشکل سے برداشت کی ہے اب وہ اس کا یہ حال دیکھ نہیں پائیں گی۔ دوسری جانب میں اس سے یہ بات چہا بھی نہیں پاری۔ میں اتنا جانتی ہوں کہ اگر میں نے ماما کو علی کے بارے میں بتا دیا تو مجھے اس کی خاطر انصاف کی جنگ لڑنے کا فیصلہ دلنا پڑے گا۔ ماما یہ برداشت نہیں کریں گی کہ ان کا مظلوم بیٹا جو چار سال تک زلزلہ رہا۔ اب اس کی کہانی اخباروں کی زینت بنے۔ لوگ جیسے لے لے کر پڑھیں۔ چار لفظ بھدوری کے کہیں اور پھر اسے دیکھ کے ناک پہ پروں مال رکھتے ہوئے اٹھ اڑھ اڑھ ہو جائیں۔ وہ بھی چاہیں گی کہ ان کی زندگی کے باقی سال علی کے ہمراہ کون اور اطمینان سے گزاریں۔"

"اور تمہیں ان کی خواہش پوری کرنی چاہئے۔"

"مجھ کو کو پوئی چھوڑ کر کچھ اور مصمم بچوں کی زندگی تباہ کرنے کا موقع دیتے ہوئے اپنی اپنی زندگیوں میں اطمینان سے گزرا لیں؟ ایسا کیسے کر سکتے ہیں ہم۔ انصاف کی راہ پہ چلتا مشکل بھی مگر ضروری ہے۔"

"فی الحال ایک ماں کے جذبات کا احترام زیادہ ضروری ہے۔ کیا یہ ملے سے علی کے مجرموں کو انصاف مل پائے گا۔ تم ساری عمر جی لگا دو گی تاہم کچھ نہ آئے گا۔ ہاں اگر اللہ نے چاہا تو ایک دن انصاف خود ہی مل جائے گا۔"

"میں مانتی ہوں خدا کی لاشی ہے آواز ہوتی ہے، لیکن سب کچھ قدرت پہ چھوڑ دینا۔ کیا یہ صحت مندانہ رجحان ہے؟"

"تم فی الحال وقت کا تقاضا دیکھو۔ آغوش کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ انہیں علی کی ضرورت ہے اور علی کو ایک گھر، ایک خاندان کی۔ ابھی مناسب علاج، اچھی غذا، بہتر ماحول اور بھرپور توجہ و محبت چاہئے۔ میرا دوستانہ مشورہ تو یہی ہے کہ فی الحال کس لڑنے کا ارادہ متوخر کرو۔ انسانی جان کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ علی کی حالت سنبھل جائے تو بعد میں آغوش کو ماحول میں لے کر سب کچھ بتا دینا۔"

"ٹھیک ہے۔ ایک بار تم نے میری بات مانی تھی آج میں تمہاری بات مان لیتی ہوں۔"

"میں نے تمہاری بات؟"

"ہاں سویرا سے شادی کی بات، مجھے بہت خوشی ہوئی تھی یہ جان کر آغوش کا فون آیا تھا مجھے۔"

"ہاں وہ سب۔۔۔۔۔" وہ کل کے ہنسا۔

"وہ ایک حربہ ہے۔ سویرا سے شادی ضرور ہو رہی ہے مگر میری نہیں شاہ نواز کی۔ اگلے ہفتے سادگی سے نکاح ہوگا۔ البتہ دیسے کا دعوت نامہ کل تک پہنچ جائے گا۔"

اس نے رومیہ سے ظاہر کیا جیسے اس نے سویرا سے شادی کرنے کا شوشا شاہ نواز کو اکسانے کے لئے چھوڑا ہو۔

"میں کسی اور سے شادی کیسے کر سکتا ہوں رومیہ! میں تو تم سے محبت کرتا ہوں۔ اس نے وہی بات دہرائی، اسی سے چارنگی کے ساتھ اور بس دیا۔

اسی اپنی رومیہ کے اطراف میں سنہری دھوپ بن کے گھر گئی۔

☆=====☆

وقت سب سے بواہم ہوتا ہے۔۔۔۔۔ یہ حق نواز نے کچ کا تھا۔ آج شاہ نواز اور سویرا کینیڈا میں ایک خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔ شاہ نواز نے اپنے دل کا بوجھ ہٹا کرنے کے لئے سویرا کو زندگی کی ہر ممکن خوشی سہا کرنے کی کوشش کی ہے اور بد لے میں سویرا کے چہرے پر چھوٹی ہنسی کرنی اس کا احساس گناہ کم سے کم کرتی جاتی ہے۔

علی رفتہ رفتہ زندگی کی طرف لوٹ رہا ہے، اس کا جسمانی اور نفسیاتی دونوں طرح سے علاج جاری ہے۔ مصلحتاً مسز نیلوفر خان سے اس کے گزرنے چار سال کا انخواب پوشیدہ رکھا گیا ہے۔ صرف اس کی گمشدگی کے بارے میں الفت خان کا ذکر کیا گیا۔ وہ رومیہ کے متبع کرنے کے باوجود اس بلڈنگ میں جا کے رہیں۔ وہاں سے الفت خان کے بارے میں



## مناہیں گلاب خوابوں کی

خواب بھی نہیں مرتے، انسان مر جاتے ہیں۔

ایک باپ کا عجیب قصہ جو اپنے گھر کا شیرازہ بکھرنے سے بچانے کے لیے اپنے پانچ بیٹوں کے لیے پانچ مٹی بنیں بیاہ کر لانے کا خواب دیکھ رہا تھا اور جب اس کا خواب پورا ہوا تو.....

ردگ 100

معلوماً بت لے کر اس سے ملے گئیں تاکہ اس سے اپنے بیٹے کی بربادی کا حساب مانگ سکیں اور وہاں جا کر رومیہ کو حق نواز کی بات شدت سے یاد آئی۔ ”اللہ سے بڑا منصف کوئی نہیں۔“ الفت خان، پیار یوں کا گڑھ بن کے رو چکا تھا۔ اس کا گلا مرزا، جسم قسطن پھیلا رہا تھا۔ وہ نہ تکہ کہنے سننے کے قابل تھا، نہ اٹھنے بیٹھنے کے۔

رومیہ نے اخبار کی نوکری چھوڑ دی ہے۔ وہ اپنی ماں کی خاطر مل کے لئے انصاف کی جگہ تو نہ لاسکی مگر فرخندہ لودھی کے ساتھ مل کے معاشرے کے ان بے ضمیر افراد کے خلاف جہاد ضرور کر رہی ہے، جو بچیمن اور مصومیت کو بھی نہ قلم ہونے والا مدگ لگا دیتے ہیں۔

اور حق نواز..... حق نواز صرف نام کا ہی حق نواز تو نہیں، وہ حق کی اس جہاد جہد میں آج بھی رومیہ کے ساتھ ہے۔

☆=====☆



PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY  
www.pdfbooksfree.pk

میں پکڑی چھڑی کی نوک سے وہ کیاری میں نہ جانے کیا کھود کر نکالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے اپنی اس سلطنت کا رقبہ جانزہ لیا جہاں آکر وہ خود کو فراموش کر بیٹھے تھے تو اولاد کیا چڑھتی۔ اس نے منہ میں بال بچھپتے ہوئے کینہ تو زنگیروں سے ایک ایک چڑ کو گھورا۔

التماس کے پہلے پہلے گھجوں سے لہرے تین درخت.....  
لکڑی کے چرچراتے گیٹ کے دائیں طرف والی دیوار کو مکمل ڈھانپے ہوئے مٹی پلائٹ کی سرسبز بیل جسے انہوں نے اپنی خوش بختی کی علامت سمجھ رکھا تھا۔  
لیہوں کے قد آور پودے کے ساتھ بتا بگڑا کتھ۔  
موتے اور رات کی دلفانی کے پودے جن کی کھک کا پوری کالونی میں آگے ہوئے پھولوں کی خوشبو سے مقابلہ کرنا بالی کا دلچسپ مشغلہ تھا۔

پچھلی طرف دیوار کے ساتھ بنی کیاریاں میں آگے گلاب، گیندے اور سورج کھکی کے پھول..... ان سے ذرا آگے لائن کے تین وسط میں بنے مختصر سے گیٹ میں سے جھانکتے گوبھی کے پھول، چوں میں گچھی جھنڈیاں اور تواریاں، شاخوں سے نکلنے بد بخت بیجیں.....  
اس بد ذائقہ گیٹ کے کچھ نزدیک ہی ابلی کی کرسی صری مٹی جس پہ اس وقت وہ بیٹھے مہراں کی قوت برداشت کا امتحان لینے میں مصروف تھے۔ اس نے چڑ کر پھر سے سر گھمایا۔  
برآمدے کی سیزر حیاں اتارنی ”بھابی“ نظر پڑی تو بائیں ہی ہت ہادی۔

”اب کیا خاک بات ہو سکے گی۔“ اس نے جانے اور اس کے کوازمات سے بھری طشتیاں اٹھائے بھائیوں کے ٹوٹے کود لکھا اور جھکے تھکے قدموں سے اندر کی طرف بڑھنے لگا۔

”کہاں چلے پر خور؟ تم تو کچھ کہنے والے تھے ناں؟ کوئی اہم بات؟“ ابلی نے پچھلے آدھے گھنٹے میں اب کہیں جا کر اسے سر اٹھا کے دیکھا۔  
”پھر کبھی.....“ بڑے ہی ضبط کے ساتھ وہ صرف یہ دو الفاظ دہرا سکا۔

”کمال ہے..... حد ہے بد تہذیبی کی..... پچھلے دو گھنٹوں سے مجھے باندھ رکھا ہے۔“ بات کرنی ہے، بات کرنی ہے۔ سب کام چھوڑ چھڑا میں صاحبزادے کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھا ہوں۔ اب فرما رہے ہیں..... پھر کبھی..... بہت خوب..... سارا موڈ غارت کر کے رکھ دیا۔“  
”اور میرے موڈ کی اس وقت کوئیں پھوٹ رہی ہیں ناں جیسے۔“ ایک بار پھر اس نے ضبط سے کام لیا اور دل ہی دل میں ابلی کی مہافت آرائی کی داد دیتا ہوا برآمدے کی سیز حیاں

اسے ابلی کی بے نیازی بری طرح کل رہی تھی جو اس کے گھنٹہ بھر سے آس پاس منتظرانے اور من میں کر کے کچھ کہنے کی کوششوں کو نظر انداز کرتے ہوئے مسلسل گیندے کے پھول کے لاڈ اٹھانے میں مصروف تھے۔

”ابلی پلیز.....“ اس نے ”پلیز“ کو لہجہ بچھپتے ہوئے ایک بار مہراں کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کی اور شاید وہ سراٹھا کر اپنے سب سے چھوٹے سپوت پر نظر کرم ڈال ہی دیتے اگر باگڑو ایک دم سے ہی آکر ان کے پیروں پہ لوٹنا نہ شروع کر دیتا اور نتیجتاً ان کی توجہ کی ڈوری ایک بار پھر مہراں کے ہاتھ آتے آتے رہ جاتی۔

”اوہ! کل ہے میرے باگڑو..... میرا شیر۔“ وہ اپنے پلے پلے مانے تازے پلے کے لاڈ اٹھانے لگے۔

”آف.....“ مہراں نے لب بھجج کر باگڑو کے ننھوں چھو بڑے کو خف سے دیکھا جو اس کے ابلی کے زانو پہ دھرا تھا، اس کی چٹی مٹی سی آنکھیں بند تھیں لیکن پھڑ پھڑاتی ہوئی مونچھوں سے مہراں کو خواہ تو وہ ہی ایک طنزیہ سگراہت بھی نظر آگئی اور تو اور اسے یہ بھی لگنے لگا کہ خبیث باگڑو ضرور پلکوں کی جھری سے اس کی بے بسی کا مزہ لوٹ رہا ہے۔

”ابلی! آپ میری بات بھی نہیں گے یا نہیں؟“ اس نے فیصلہ کر لیا کہ جسے میں کہتے ہوئے ایک بار پھر ذہیت پن کا مظاہرہ کیا۔

”کچھ منہ سے بھونٹو گے بھی یا نہیں؟“ بدستور اس سے رخ پھیرے پھیرے ہی خواجہ ظلیق ابراہیم نے تنہی کی چھڑی دی۔

”ابلی! میں یہ کہنا چاہ.....“ بات تو شروع کر لی اس نے لیکن ابلی کی بے توجہی بھانپ کر پھر چپ کر گیا۔ ان کا ایک ہاتھ گود میں ”کا“ کا“ بن کر لینے باگڑو کو تھک رہا تھا تو دوسرے ہاتھ

چڑھنے لگا۔

”چائے نہیں پیو گے مہرؤ؟“ بڑی بھالی نے پاس سے گزرتے دہلیز کو مخاطب کیا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا، اب کھولنے سے وہ چوڑ کر پڑی کر رہا تھا۔ مہادیو جیلوں کی ساری بھاپ زبان کے رستے باہر نہ نکل جائے۔

”بھئی نکلیاں بنائی ہیں اور چیکن کے پکڑے بھی۔“ بھالی نے ہنرورے انداز میں پتہ کرتا چاہی، نہ جانے کیسے وہ بھول گئیں کہ چیکن مہران کی چڑ ہیں اور وہ جو سبکی کی ہونڈی سونڈی خوشبو والی کرکری خستہ بھئی گلیوں کا قصور کرتے رک گیا تھا، منہ میں تھکتے تھکتے چیکن کی کڑواہٹ محسوس کر کے پھر سے پتہ چننا آدھ بڑھ گیا۔

”جین بھالی نے اپنی جین پہ بھی گلیوں میں چند ایک کا اور اضافہ کرتے ہوئے اسے تبصرہ کرتی نگاہوں سے گھورا جب کہ سب سے چھوٹی بھالی نے پیچھے سے بھی آواز لگائی۔

”کمرے میں چائے سمجھاؤ جی ہوں مہرؤ اور ساتھ میں آلو کے پکڑے بھی۔“ اس ابھی ڈالتی ہوں کڑی میں۔“

”مہناز۔۔۔ مت تازہ اٹھاؤ اس کے۔۔۔ سر پہ چڑھتا جا رہا ہے۔“ ابی نے دور سے ہی سمجھ لی۔ اس کے دم دم کرتے قدم اور زور سے غرض پہ پہنچے گئے۔

”قیں۔۔۔ قیں۔۔۔“ برآمدے کا دروازہ کھولتے ہی ”دو تالا“ بھرتی کے ساتھ اس کی جانگوں کے درمیان سے ہوتا ہوا اس سے پہلے ہال کمرے میں پہنچ گیا۔ مہران نے فصے سے ابی کے ایک اور لاڈلے کی بدتمیزی ملاحظہ کی۔ گردن ہٹا کر اس کی طرف دیکھا جہاں اس وقت ابی اپنی جوتی پہنوں کی سنگت میں لی پارٹی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہ تخرمی اشکال میں سرسرا ہوا اس بدخل بچے کی طرف بڑھا جو جھگ جھگ چلا ہوا بچن کا رخ کر رہا تھا۔

”لاٹھی، بدیتا۔۔۔“ مہران نے بڑا اکرا سے دوٹو نام دیے۔ بچن سے نکالنے سے پہلے اسی اس کی پیٹ پوجا کا انتظام جو گرد پڑی ہیں، اس لئے ہر وقت وہاں گھسنے کے لئے تاک لگائے بیٹھا رہتا ہے۔ مہران جانتا تھا ابی اس وقت اپنے کمرے میں عصر کی نماز ادا کر رہی ہوں گی اور بھائیہ تو اب بڑے کمرے صاف کر کے ہی اندر آئیں گی۔

”اس سے اچھا موقع اور کوئی نہیں اس بے نرے ڈونالڈ سے نہایت حاصل کرنے کا۔“ آج کل اس کے ذہن میں ہمہ وقت ایسے ہی باغیانہ اور تخرمی منسوبے کلپا لے رہے تھے۔ جس وقت وہ ابی کے سامنے کھڑا ان کی چند گھولوں کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا

تب ہی اس کا دل شدت سے چاہ رہا تھا کہ گیندے کے ان بڑے بڑے پھولوں کی ایک ایک پتی فوج لے۔

”کی کی مزیل سی جھنڈیوں کا کچھ مر ٹال دے۔“

”تو ریں کو مروت کر رکھو۔“

اور کچھ نہیں تو کم از کم اس ڈیل باغیڑی کی ذمہ داریوں سے اس بڑی طرح بکل دے کر دونوں تک پہلانا پھرے۔

ہائے۔۔۔ لیکن۔۔۔ ابی کی نظر آگ نہیں پڑتی تھی تو صرف اس پہ ہی نہیں پڑتی تھی ورنہ اپنی اس راجدھانی کی چمکی وہ خوب کیا کرتے۔ ”اس بھدے بے نرے قوال کی چوچ نہیں بند ہو سکتی ورنہ بغیر دن کے ہی راحت کی طرف لے جاتا، وہ خود ہی حلال کرتا اور پھر خودی روست کرتا۔“ بڑا داتے ہوئے اس نے ایک تیز و جارحانہ لہری اور ڈونالڈ کو گردن سے دبوچ لیا۔

”قیں۔۔۔ قیں قیں۔۔۔“ اس نے دو تالا آواز میں نکالیں، مہران کے ہاتھ پھول گئے۔ وہ جانتا تھا ابی کی نظر کے ساتھ ساتھ مہران بھی کس قدر تیز ہیں۔

”بھوڑ۔۔۔ بھوڑ۔۔۔“

اس چلتی بھڑے بھگتے نے اس کے رپے سبے اسمان بھی خطا کر دیے، مارے گھبراہٹ سے اس کے ہاتھوں سے چھری چھوٹ گئی۔ ”کیسا شور مچا رکھا ہے۔۔۔ وہ مواکتا اندر تو نہیں گھس آیا؟“ اسی حواس باختہ چٹکن میں داخل ہوئیں۔

”تو اور کیا؟“ بچن میں دعتار ہا تھا وہ آتا۔ اگر کسی ہٹاڑی میں منہ مارتا دیتا تو؟ ابی نے بڑا سر چڑھا رکھا ہے ان فیٹیوں کو، اتنی مشکل سے میں نے اس کتے کے بچے کو نکالا ہے۔“

”اوں ہوں۔۔۔ مہران۔۔۔ گالی نہیں کہتے۔“ ابی نے سر دھنک کی تودہ جھلا گیا۔

”جب آپ ہی معاملے کی گھنٹی نہیں بھج پاری ہیں۔ ابی سے تو کسی قسم کی سمجیدگی کی امید رکھنا فضول ہے۔“

”سمجیری سمجیدی تو تمہارے ابی کے حراج سے وابستہ ہے، صاف بات تو یہ ہے۔“ انہوں نے دامن چھڑایا تو وہ بھج گیا۔

”یعنی آپ بھی میری کوئی مدد نہیں کریں گی۔ ای۔۔۔ کبھی تو۔۔۔ کبھی تو میری سے بجائے صرف ماں بن کر سوچیں۔ کیا آپ کے خیال میں میرا ہی منسل غیر اہم ہے اور کیا ابی کا موقف اچھا پسند نہیں ہے؟“ اس نے منہ کی تو تیلے میں دال بھگوتے ہوئے شفقتہ قانون

کے ہاتھ تھم گئے۔ نظر اٹھا کے خود بخود جانے کو دیکھا جو سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سب سے لڑا لڑکی تھا۔ دل بچ گیا۔

”میں مانتی ہوں، ان کا رویہ بہت خست ہے۔ کچھ خستے پہ تیار ہی نہیں ہوتے وہ۔ کم از کم میری تو ایک نہیں سنیں گے۔“

”اور وہ ”ایک“ آپ بھی کہ بھی نہیں سنیں گی۔“ وہ ناراض ناراض سادہاں پلٹے گا۔

”ایک طریقہ ہے۔“ امی کی آواز پہ وہ خوش گمان ہو کر بھر مار گیا۔

”اگر سب لوگ مل کر انہیں سمجھائیں، انہیں سنانے کی کوشش کریں تو ہو سکتا ہے بات بن جائے۔“

”سب لوگ کون؟ یہ سب؟ یعنی ہماری جمع تھیں۔ تو بے کیجئے۔ سبھی تو ابلی کی شیر نیاں ہیں اور یہ بھلا کہاں میرا ساتھ دیں گی۔ میرا گھر سنا تو بڑی بات ہے اس کا ذکر سننے ہی چاروں کے ذہن میں جڑے ہو جاتے ہیں۔ کوس میں بھل کر وہاں شروع ہو جاتی ہیں۔“

”تو بس۔۔۔“ امی نے سر ہچکا۔ ”وہ الگ بات ہے لیکن مجھے یقین ہے میں ان سے پیار سے بات کروں گی تو وہ ضرور کچھ جائیں گی۔“

”وہ شاید سمجھ تو جائیں لیکن یہ بات بھول جائے کہ میرے سلسلے میں وہ ابلی سے بات کرنے پہ تیار ہوں گی۔ وہ کب چاچتی ہیں کہ۔۔۔ آپ کچھ لیجئے میری بات۔۔۔ سبھی چاروں ہیں ابلی کے دماغ میں اگلے سیدھے خیال بھرنے والی۔ آپ بس اندر مصلے پہ بیٹھی نمازوں کے بعد لیے لیے دھنپے پڑھا لیجئے اور وہ بیٹھوں کے پکڑے بٹانے کے انہیں کھاتی رہیں اور ان کے حراج اور بگاڑتی رہیں۔“

”تم ہی بات بیٹا میرے چند ایسے نہیں کہتے اپنے بڑوں کے بارے میں اور نہ سوچتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ مان کیا سب مجھ سے بڑے ہیں۔ میں سب سے چھوٹا سبھی مگر اب اتنا بھی چھوٹا نہیں اور نہ ہی تمام عمر چھوٹا رہوں گا۔ جوان تو ہو چکا ہوں، ایک دن بوڑھا بھی ہو جاؤں گا لیکن ہوتا رہوں، آپ کو کیا، ابلی کو کیا؟“ وہ بچن سے چاچکا تھا لیکن شفیقہ خاتون اسی طرح بے بسی کے عالم میں کھڑی اس کی باتیں دہرا رہی تھیں، جو حرف پہ حرف کچھ نہیں لیکن خواجہ ظلیق الرحمان۔۔۔ وہ جس بات پہ آؤ جائیں بھر اس سے ایک انچ سر نہ کھینچی مشکل تھا۔

☆=====☆

خواجہ ظلیق الرحمان بس ایسے ہی تھے۔ یہ بات نہیں کہ ان کا دل بہت خست تھا یا اولاد

www.pdfbooksfree.pk

کے لئے وہ بہت کڑھم کے باپ ثابت ہوئے تھے۔ دل تو ان کا بہت گمراہ تھا اور اس میں پیار بھی بے حد و حساب بھرا ہوا تھا۔ جب وہ اپنے ہاتھوں لگائے پھولوں پودوں کے لئے اتنے حساس ہو سکتے تھے تو اپنی پیدا کی گئی اولاد کے لئے کیوں نہیں۔ اپنے ہاتھ چاروں کے لئے اتنے ذمہ دار ثابت ہو سکتے تھے تو اولاد کے سلسلے میں لا پرواہی کیسے برتنے لگیں۔ ایک بات ایسی تھی جس کے آگے وہ بے بس تھے۔ بس یہاں اگر ان کا دل خست ہو جاتا تھا۔ برسوں پہلے وہ جو خواب دیکھ چکے تھے، اس کی تفسیر کبھی انکھوں دیکھنے کی خواہش وقت کے ساتھ ساتھ اور پختہ ہوتی چلی گئی۔ ابلی کی خواہش پہلے پہل اسے بھی اوروں کی طرح انوکھی مگر بے ضرری لگتی تھی لیکن اب حالات کیا سے کیا ہو جانے کے باوجود بھی ان کا اسی طرح ضد پہ ڈٹنا اسے سراسر ناقصانہ اور ہٹ دھرمی لگنے لگا۔

خواجہ ظلیق الرحمان کے جب اوتے پہ پانچ بیٹے ہوئے تو سب کو ان کی خوش بختی کا یقین ہو گیا لیکن ان کے دل میں جو پہلے بیٹے کے بعد سے ہی ایک بیماری سی ”مون منی سی“ گزیا بیٹی کی تنہا جاگ اٹھی تھی وہ مر جھانسی گئی۔ سن تو بھی رکھا تھا کہ بیٹی ہی والدین کا سہارا ہوتی ہے۔ غم خوار مونس ہوتی ہے۔ پرانی ہو کر بھی اپنی رشتی ہے جب کہ بیٹے اپنے ہو کر بھی پرانے ہی رہ جاتے ہیں۔ اچانک بے بسی سے ہانپا چا تو وہ ہنس پڑیں۔

”بھلا! اٹو سدا جھای رہے گا۔ باتیں بس باتیں ہی ہوتی ہیں۔ کوئی تقدیر کا لکھا حکم تو نہیں۔“ ٹوکیوں لگ کر کرتا ہے۔ چند سالوں کی بات ہے تیرے دبیزے بھی ایک کے بعد ایک دو مٹی اترے گی تو سارے دھبوں والے چادر لے لگا ان شاء اللہ۔“ ہے جی کہ تمہی بھی ان کی بہت نہ بڑھا سکا۔

”لیکن بے بی! کیا پتا آگے قسمت میں کیا لکھا ہے۔ آنے والی کیا تجھے لے کے آتی ہیں۔ کہیں بیٹے بھی نہ جنمیں لے کے جائیں۔ بالکل خالی ہاتھ ہی رہ جاؤں۔ لڑکے تو بھرا پائی بیویوں کے کہنے پہ چلے ہیں ناں۔“

”تو تو نہیں چلنا اپنی زبانی لے کہنے پر۔“ بے بی نے جھپٹا۔ ”بے چاری کی جان قبض لے رکھتا ہے، ساہ (سانس) کسکا کر رکھتا ہے اس کا۔“

”نہیں بے بی۔۔۔“ وہ شرمندہ سے سر جھٹکتے لگے۔ ”میں نے کیا سانس کھانا ہے وہ تو۔۔۔ بس ہے ہی انکی اور پھر وہ مجھے کچھ کہے گی تو میرے کچھ کرنے کی نوبت آئے گی۔“

”اس کا مطلب ہے کہ وہ تجھے اپنی سیدھی بیٹیاں نہیں پڑھاتی تو پھر ثابت یہی ہوا کہ بیویوں بھی اچھی ہوتی ہیں۔ ضرور یہی نہیں ساری کی ساری ذاتیں ہی ہوں۔“

”اوہو بے جی۔ حقیقت کو کیا تکلیف ہو سکتی ہے یہاں۔ میں آپ کا اکیلا اکیلا بیٹا۔ اماں اس کے گھر آنے سے پہلے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ نہ دیر جیٹھ کا رولا (خور)، نہ دیر اچھا بیٹھانی کا جلا، بس اس کا اپنا ہی راج ہے۔ ایک آپ ہی آپ ہیں جو مصلے پہ بیٹھے بیٹھے اسے دعا میں دیتی رہتی ہیں۔ آپ سے اسے کیا شکایت۔ اس کے گھر اتنا سکون ہے چل رہا ہے لیکن میرے خمر سے پانچ بیٹے، سب کی اپنی اپنی بیایاں..... الگ الگ گھروں کی، الگ الگ مزاج والی، الگ الگ عاقول والی، اپنی اپنی فطرت اور خصلت لے کر آئیں گی۔ یہ کتنے دن گزار کیسکیں گی! کتنے ایک ہی چھت تلتے۔ ایک کو دوسری کی عادتیں نہ لگیں گی دوسری کو تیسری کے رن بہن پر اعتراض ہوگا، تیسری کو چوتھی سے جاہ کرنا مشکل ہوگا تو چوتھی پانچویں کا وجود کھٹکے گا۔ ان کی کھینچا پٹائی میں..... بے جی میرے بیٹے..... میرے بیٹے بگم جائیں گے۔ میرا آشیانہ ٹھکانا ہو جائے گا۔ کیا قادمہ میرے برسوں محنت کر کے ان کے پالنے پوتے کا۔ مجھے اتنی جان مار کر کیا ملے گا۔“

”اچھا چل چھوڑ ساری فکریں، بڑا آیا بیٹا کیسں کا۔ بڑا بھرتیا پانچویں چڑھا ہے۔ چھوٹا ابھی گودی ہے اور تو ان کی زبانوں کے جھڑے میں الجھا ہوا ہے۔ دماغ خراب ہو ہے تیرا تو طلیق کا کہے۔“ ہمتیں ضائع جاتے دیکھ کے جی کی نگلی پھر عود کر آئی اور ڈانٹ ڈپٹ کے بیٹے کے سر سے فیضول بوجھا تارے لگیں۔

”اور اگر اتنی ہی راتوں کی نیندیں اڑی ہوئی ہیں تو پھر میرا مشورہ مان۔ لڑکوں جو ان ہوتے ہی ان کی شادی کسی ایسے گھر کر دینا جہاں پانچ بیٹیاں ہوں۔ سب کی بیویاں بنیں ہوں گی تو تیرا ڈر بھی جا تارے گا کہ دیوانی بیٹھانی کا جھڑا گھر توڑ دے گا۔ ایک کی بیوی بڑی بیویوں میں تو جاہ ہو جائے گا۔“

بے جی کے اس مشورے پہ طلیق الرحمان نے استہزاء سے ہنسا دیا اور چپ رہے بڑھاپے میں تہار جانے کا خوف ابھی سے ان کی نیندیں اڑا رہے ہوئے تھا اور یہ تب کی باز ہے جب ان کا سب سے بڑا بیٹا خواجہ فرقان طلیق میرک کے احسان میں پاس ہوا تھا۔ پورے محلے اور ساری برادری میں لڑو بانٹنے نہ رک رہے تھے۔ لڑو کو لڑا کر لے کر وہ بڑا خوشی خوشی اپنے تاجی کے ہاں گئے تھے۔ گھربار اور کاروبار کی الجھنوں میں بڑے کئی مہینوں وہاں جانا نہیں ہو پاتا تھا وہ نہ اپنے تاجی سے بڑی محبت اور انسیت رکھتے تھے۔ جی کے گزرنے کے بعد امی میں والد کی شبیہء صوفیہ تھیں۔ حقیقت یہ ہے بڑا سناٹا کرادیا حیرت سے پوچھا۔

”یہ کیا جی؟ سارے گھروں میں تو بے اور تاجی کے گھر پورا تو کرا۔“  
”تو تاجی کا کبیر (کنہ) بھی تو بڑا ہے ناں۔ بڑے بھائی تو خیر سے پوتے والے بھی ہو گئے ہیں۔ باقی سب بھی اپنے اپنے بیوی بچوں والے۔ نہیں بھی اپنے اپنے گھر کی۔ تاؤ جی ان کے گھر بھی تو چار چار لڑو بچڑا میں سے آخر چھو بیسایاں ہیں وہ میرے فرقان کی۔“  
”ہاں یہ تو ہے ماشاء اللہ۔ جی بھی تو زیادہ ہیں تاجی کے گھر۔ واقعی یہ تو کرا ہی پورا آئے گا۔“ حقیقت سر ہلا کے چپ ہو رہیں لیکن واقعی یہ جب خواجہ صاحب کا بچھا بچھا چہرہ، چلی پھلک رحمت اور مگرم کیفیت دیکھی تو بے جی کے

”کیا تاجی حقیقتاً مجھے تو خود یقین نہیں آ رہا ہے سب کیسے ہوا۔ کس نے تاجی کے چنے لئے گھر ان کو نظر لگا دی لیکن..... کسی کے نظر کے لئے سے ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ کیا برسوں میں بنائے گئے گھرا تے کیے ہوتے ہیں کہ یوں دیکھتے ہی دیکھتے اجڑ جائیں، برباد ہو جائیں۔“  
”ہائے ہائے، خیر کی بات کریں خواجہ جی، اللہ خیر رکھے ہر طرف۔“ وہ ہول اٹھیں۔  
”اب کیا خیر ہوئی ہے حقیقتاً جا کر دیکھو ذرا تاج کا گھر۔ کیسی جہل جہل ہوئی تھی سارے گھر میں۔ یہ لہبا دسرخان چھتا تھا۔ سارے مل کر کھانا کھاتے تھے۔ چنے پوتے تھے۔ اب..... اب تو ایک دوسرے کو دیکھنا بھی گوارا نہیں۔ وہی گھر ہے وہی چھت، بس فرق یہ پڑا ہے کہ چند دیواروں کا اضافہ ہو گیا ہے۔ تینوں بھائی الگ الگ ہو گئے ہیں۔ اچھا۔ انہوں نے طیجھہ کر لیا ہے۔ کاروبار میں بھی مکان میں بھی۔ جب سے انہوں نے چھوٹے دونوں لڑکوں کی شادی کی ہے۔ خاندان میں یہی تذکرہ ہو رہا تھا۔ میں نے سن کر بھی یقین نہیں کیا۔ آج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ سراج اوپر چلا گیا ہے بیوی بیٹے لے کر، معراج اور وہاں دونوں نے بیٹے کے حصے کو دو حصوں میں بانٹ لیا ہے۔ دیوار کھڑی کر کے اور تاجو جاتی ہو سراج بھائی صاحب نے اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں بھی گھر کے باہر سے رکھوائی ہیں۔

ان کے جھڑے میں نقصان کس کا ہوا، تاجی کا اور ان کے بیٹوں کا۔ خون کے رشے کو جلا پالے ڈوبا۔ مجھ سے تاجی کا خیال دیکھا نہیں جاتا۔“ ان کی آواز بھرا آئی تو حقیقت کے آنسو مٹی چھلک پڑے۔

”تینوں نے ان کی ذمہ داری بھی بانٹ لی ہے۔ ایک ایک مہینہ تینوں کے پاس رہیں گے اور تینوں تو پتا ہے کتنی سالوں سے دو کمر کی تکلیف کی وجہ سے بیڑھیاں نہیں چڑھ پاتے ہی آتے تھے ہیں۔ جب بڑا ہوا تو اصول کے مطابق پہلا حصہ بڑے بھائی کو ملا یعنی اسے سامان کے ساتھ ساتھ تاجی کو بھی محدود اٹھا کر اوپر لے گئے اور تاجی بتا رہے تھے

کہ پرسوں جیسے ہی تیس دن پورے ہوئے سراج بھائی صاحب انہیں اٹھا کر چھپے محسن میں بٹھ گئے، کپڑوں کا تھیلہ پاس رکھا اور کال تیل دو باکے اوپر چڑھ گئے۔  
 ”ہائے اللہ۔“ رقیق القلب شفیقہ کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ ”اندھ رہے۔ میری تو یہ۔  
 غضب پڑنے لگا ان پر خدا کا۔۔۔ ذرا خوف نہیں ان کے دلوں میں۔“ روتے روتے ان کی فلفل سفید پڑتے خواجہ صاحب پہ توڑے تارو باجمول کر انہیں سنبھالے لگیں۔  
 ”کیا ہوا جی آپ کو؟ حوصلہ کریں خواجہ جی۔ یہ پانی پیجیے۔“ چند گھونٹ پانی کے بھرنے کے بعد ان میں ذرا بہت آئی تو نوٹے نوٹے لہجے میں بولے۔  
 ”شفیقہ! ہمارا بھی یہی حال ہوگا۔ یہی حال ہوگا۔۔۔ دیکھ لینا۔“  
 ”اللہ نہ کرے جی۔ ہمارے بیٹے فرما شاء اللہ۔“ وہ تسلی دینا چاہتی تھیں لیکن خواجہ صاحب نے بات کاٹ دی۔

”ہمارے بیٹے فرما شاء اللہ پانچ ہیں۔ تاؤ جی کے تین بیٹے اسٹھے نہ رہ سکیں تو ہمارے پانچوں کیسے رہ سکیں گے۔ میں تو یہ سوچ رہا ہوں تاؤ جی کا اتنا بڑا مکان تھا۔ آسانی سے تھوٹے ہو گئے۔ میرا مکان تو بس اتنا سہا ہے، پانچ بھائی تو ہرگز نہ ہو سکیں گے۔ اس کا مطلب ہے میرے بیٹے ایک چھت تلے بھی نہ رہ پائیں گے۔ ہم بیٹیوں ان کی شکل دیکھنے سے آفسا کر سکیں گے۔ ہماری بھی باریاں لگا کر ہیں، ایک مہینہ فرقان کے گھر، ایک مہینہ نقبان ترسا کر ہیں۔ ہمارے عمران کے ہاں۔ ہائے شفیقہ! ہمارے ساتھ بہت برا ہونے طرف پھر دہاں سے عمران کے ہاں۔“ وہ روہانے ہوئے پھر پیچھے کسی خیال کے تحت فیصلہ کن لہجے بولے۔

”نہیں میں اپنا بڑا حصار دور نہیں دوںے دوں گا ان لڑکوں کو۔ میں ان کی شادیاں نہیں کروں گا۔ ساری کل کل ہی ختم۔“ شفیقہ خاتون کے تو ہاتھ ہر پھول گئے، اگرچہ فرقان سولہویں سال میں تھا اور کئی سالوں تک اس کی شادی کا امکان نہ تھا لیکن وہ جانتی خواجہ صاحب کی بات پہ آؤ جائیں تو پھر انہیں باز رکھنے کی ہر کوشش بے سود ہوتی ہے۔ لے فوراً انہیں ٹھنڈا کرنے لگ گئیں۔ ان سے زیادہ کون جانتا تھا کہ یہ دعوے محض نے آکر کہے گئے چند الفاظ نہیں بلکہ پتھر پہ کیکر ثابت ہو سکتے ہیں اگر ان کا زوری سید باب نہ تو۔۔۔

”کیسی باتیں کر رہے ہیں خواجہ صاحب! کیوں اپنی جگہ ہنسائی کرنا چاہتے بھلا ایسا بھی کہیں ہوتا ہے۔ خدا کی رحمت سے کیوں ناامید ہوتے ہیں جی؟ ہو سکتا ہے

کے یہ تمام خدشے بے بنیاد باتیں ہوں۔ ہو سکتا ہے، آنے والیاں اور بھی زیادہ برکت لے کر آئیں آپ کے گھر۔ ہو سکتا ہے ان کے آنے سے ہمارے بچے اور بھی زیادہ معنی ملیں سے جڑ جائیں اور ہو سکتا ہے۔“

”بس کرو خدا کا واسطہ ہے چپ ہو جاؤ۔ تمہاری اس ”ہو سکتا ہے“ کے پیچھے میں یہ گھر داؤ نہیں لگا سکتا۔ چلو مان لیا ”ہو سکتا ہے“ کہ کوئی ایک آدھ بھابھی بھی نکل آئے لیکن بیچم! ایک پچھلی سارے تلاب کو گندہ کرتی ہے۔ کوئی ایک بھی تاؤ جی کی چھوٹی بیوی جس بھی نکل آئی تو پرچھے آؤ جائیں گے۔“

”لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم اپنے بچوں کے گھر بنانے کا ارادہ ہی ترک کر دیں۔ اچھا یہ ہے کہ ہم دیکھ بھال کے خود ان کی دیکھیں لے آئیں۔ بجائے اس کے کہ وہ باقی ہو کر خود کوئی قدم اٹھائیں۔“

”تعمیل سے نہ توڑے کہ رکھ دوں ہمارا دلوں کی۔ ایسی کی جیسی ان کے قدموں کی۔“ وہ تھلا کے بولے۔

”اوہو خواجہ جی! آپ سمجھتے کیوں نہیں کہ وہ بیٹے جاتے انسان ہیں۔ کوئی بڑے پورے نہیں جو تھوڑا اور مار مارے دار ہونے کے بعد بھی آپ کے پانی لگانے کے سبب رنج رہیں گے۔“  
 ”چلو تمہیں بھی کچھ نہیں سمجھا تو ہے جی کی طرح بیڑوں اور درختوں کی مثالیں دینے لگیں۔“ انہیں چند سال پہلے مرحومہ بی کے ساتھ اسی مسئلے کی کئی بحث یاد آئی اور ساتھ ہی اچانک وہ شور و جھجے انہوں نے سرسری سامان کر سر جھک دیا تھا۔ ان کے ذہن میں جھماکا ہوا۔

”چلو ٹھیک ہے۔ زندگی میں پہلی اور آخری بار میں اپنے کئے گئے کسی فیصلے سے دستبردار کی اختیار کر رہا ہوں۔ تمہاری بات مان لیتے ہیں۔“

”ج؟“ وہ جی خواجہ جی؟ ”شفیقہ کو اتنی جلدی ان کے مان جانے کی امید تھی۔  
 ”ہاں لیکن میری ایک شرط ہے اور میں پہلے ہی واضح کر دوں اب مجھ سے بحث کرنے کی قسط کوئی ضرورت نہیں۔ ان کی شادیاں ہوں گی ہر ایک کی عمر میں۔“ انہوں نے سختی سے کہا۔

”ہیں جی؟“ وہ اس سے تو بے رحمی ان پریشان تھیں۔  
 ”ہاں! ان پانچوں کی بیویاں بھی جی نہیں ہوں گی۔ وہ نہ میری طرف سے بھلے ساری معرکوں سے بچیں۔“ انہوں نے نہ صرف فیصلہ صادر کر دیا بلکہ ہر جملے جلتے والے کے ذریعے

زمانے میں بھر شرمی کر دیا۔ لوگوں کے لئے یہ بات بھی نئی تھی اور دلچسپ بھی۔ ہر چہ کہ ابھی کوئی بیٹا شادی کے لائق نہ ہوا تھا لیکن قریبی رشتے دار یعنی لڑکوں کی خالائیں، ممانیاں، چچاں وغیرہ اور گرد نظر رکھنے لگیں کہ کہیں کوئی پانچ بہنوں والا مناسب گھرانہ ملے تو حقیقتہً خاتون سے ذکر کیا جائے۔ یہ تلاش جاری رہی تاوقت کہ خواجہ صاحب کے بڑے صاحبزادے فرخان بی اے کرنے کے بعد اپنے والد کے ساتھ شریک کاروبار ہو گئے۔ ایسے میں ایک دن خواجہ خلیق کے چھوٹے چچا ان سے ملنے آئے اور چند اور اہم کی باتوں کے بعد فرخان کے رشتے کی بات چھیڑ دی۔

”ایک منٹ..... ایک منٹ بچا! آپ شاید بھول رہے ہیں، میں نے اپنے بیٹوں کی شادی کے سلسلے میں کیا فیصلہ کر رکھا ہے۔“ انہوں نے چچا زین کو حیرت کچھ کہنے سے پہلے ہی روک دیا۔ وہ برا منہ بنا کر کہنے لگے۔

”جانتا ہوں، میاں! جانتا ہوں اچھی طرح، جو تم نے برسوں سے زمانے بھر میں ڈھنڈورا پیٹ رکھا ہے۔ تمہاری یہ بات ذہن میں تھی جب ہی تو اس گھرانے اور اس کی بچیوں کو دیکھتے ہی مجھے تمہارا خیال آیا۔ ان لوگوں کو اچھی طرح جانچ کرکھ لینے کے بعد ہی میں تم سے بات کرنے آیا ہوں۔ وہ ایسے گھرانوں کی کوئی کی تو نہیں جہاں پانچ چھوڑ آٹھ آٹھ لڑکیاں ہوتی ہیں لیکن شادی بیاہ کے اور بھی سوچا ملے ہوئے ہیں، سارا حساب کتاب، حسب نسب، شرافت، گمن دیکھنے پڑتے ہیں۔ میں ہر طرح سے مطمئن ہو کر ہی تمہارے پاس آیا ہوں۔“

”یہ تو آپ کی محبت اور رعایت ہے چچا جان! آج کل کون کسی کے لئے اتنی بھاگ دوڑ اور تردد کرتا ہے لیکن آپ نے وقت سے بہت پہلے ہی یہ ذکر چھیڑ دیا۔“

”وقت سے پہلے؟“ چچا حیرت سے بولے۔ ”اے میاں فرخان بچوں کا ہونے کو آیا ہے، بڑی مناسب عمر ہے بیاہ کی اور پھر وہ نہ صرف تعلیم مکمل کر چکا ہے بلکہ اب تو تمہارے ساتھ کام میں بھی ہاتھ بٹا رہا ہے۔ جیسے اپنے بیڑوں پر کھڑے ہو جائیں تو انہیں گھر بار کا کردینا چاہئے وہ قدم غلط راہوں کی طرف بھی لے جاسکتے ہیں۔“

”آپ کی بات درست ہے چچا جان لیکن.....“ وہ مزید ہوئے۔ ”لیکن فرخان اور لقمان ہی شادی کے قابل ہوئے ہیں۔ عمران، جبران ان کی تو کالج کی تعلیم بھی مکمل نہیں ہوئی اور مہران تو خیر ابھی بہت ہی کم سن ہے۔“

”خدا تمہیں عقل دے غلط..... جوان بچوں کے باپ ہو اور ہر بات تفصیل سے سمجھاتا

پڑتی ہے۔“ چچا نے سنجیدگی سے بات کرتے ہوئے انہوں سے سر ہلایا۔

”پانچوں بیٹوں کا رشتہ ایک ہی گھر میں کرنے کا مطلب یہ نہیں کہتم انکے ہی سب کے سرورں پر سہارا بنو۔ ارے جاؤ تو کسی ایک بار، بچیاں دیکھو، گھمراہ نہ کیوں پسند آئے تو وہ بیٹوں کی شادی تمہارے لئے ساتھ ساتھ باقی بچیاں بھی مانگ لو۔ اگر مہران کے جوان ہونے کا انتظار کیا تو فرخان کو باپا باندو گئے۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔ کمال ہے چچا! اتنی بات میں سمجھ نہیں پایا۔“ وہ ایک دم سے ہلکے پھلکے ہو کر چچا زین کے ساتھ وہاں جانے کا پروگرام بنانے لگے۔

آٹا قاتنا تمام معاملات منٹ منٹ گئے۔ خواجہ خلیق اور حقیقتہً خاتون دونوں کو شیخ نواز حسین کا گھرانہ حد بے حد پسند آیا۔ شریف اننس، عظیم الطبع، دورانی حیثیت کے نمازی پرہیزگار انسان تھے۔ محمد دودی آدمی میں چھ چچاں پال رہے تھے۔ بی بی چچا چھ بیٹی صاحبزادی چونکہ نہایت کم عمر تھیں اس لئے چچا جان نے ان کا ذکر کار خیر دوری نہ جانا تھا، ہر حال جہاں خواجہ صاحب اور ان کی بیگم کو حسب پسند اور حسب خفاہ گھرانہ مل جانے کی تسلی ہوئی وہاں دونوں نے خدا کے حضور شکرانہ بھی ادا کیا کہ وہ انہیں ایک مجبور اور شریف کا جو بھائی بننے کی شکیں حاصل کرنے کی سعادت بخش رہا ہے۔ حقیقتہً خاتون کو بس ایک بات کلک رہی تھی اور وہ تھی سب سے بڑی بیٹی ملتا کہ عمراور شکل و صورت۔ وہ تمام بہنوں سے ذرا کم زور تھی۔ عمر بھی فرخان کے مقابلے میں زیادہ تھی اور یہ بات اس کے بالوں میں پچھلے تاروں اور آنکھوں کے نیچے پڑی جھریوں سے صاف واضح ہوئی تھی۔ رنگ بھی دیتا ہوا تھا، نین نقش اچھے تھے مگر بدقسمتی عمر کے اثرات نے ان کی کلاش کی کردی تھی۔ اس بات کا ذکر شوہر سے کیا تو بھر سوچنے کے بعد انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

”کہیں تو ٹھیک ہو لیکن اس ایک بات کے پیچھے میں باقی سب نظر انداز نہیں کر سکتا۔ چلو، میں خود کچھ نہیں کہتا۔ تم فیصلہ کرو، بتاؤ مجھے کیا تمہیں سچ صاحب کی شرافت کے بارے میں کوئی شبہ ہے؟ کیا تمہارے خیال میں آج کے دور میں چھ بیٹیوں کا بوجھ، انہیں عزت سے بیاہنے کی ذمہ داری ایک متوسط طبقے کے شخص کی نہیں جھکا دیتی، اس کی راتوں کی نین نہیں اڑا دیتی؟ کیا تم نے ان سب بچیوں کا سلیقہ، گھسٹاپا، سادہ مندی نوٹ نہیں کی؟ کیا تعلیم کے لحاظ سے بھی بڑی دونوں فرخان اور لقمان کے لئے مناسب نہیں ہیں؟ باقی بیٹیوں بھی ابھی چھوٹی سی لیکن سنی بالاد اور سلیمی ہوئی چچا ہیں؟ یلو؟“ وہ تائید میں سر ہلا کر رہ گئیں۔

”تو بس بیگم، بسم اللہ کہہ رہے ہیں۔“ وہ رشک کرنے سے ٹٹے پیٹتے تھے اور

وہی ہوا جو وہ چاہتے تھے۔ فرقان اور لقمان کی شادیاں چند ماہ کے اندر اندر مل گئیں اور مرد پارہ سے ہو گئیں۔ البتہ کہ قریب میں عمران اور جبران کی مدد تا زور مرہ نہیں سے نسبت کا باقاعدہ اعلان بھی کر دیا گیا۔

خواجه صاحب تو مہران اور ماہ نور کی مٹھی کا اعلان بھی کرتا چاہتے تھے لیکن شیخ صاحب نے اپنی بیٹی اور خود مہران کی کم عمری کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ اہتمام مناسب نہ جانا اور فی الوقت اس سلسلے کو ٹال دیا۔

☆=====☆

تقریباً پانچ سال بعد ان دونوں کی باری آئی تو مہران ایم کی اے کر رہا تھا اور ماہ نور نے ابھی ایف ایس سی کا گریڈ مار دیا تھا۔ وہی روایت نبھائی گئی پھر سے ویسے کی قریب میں شفیق خاتون نے گلابی پشوا میں سید ہیر بی بی نازک سی نور کو اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کے نام کی انگوٹھی پہنا دی۔ مہران کو بھی والدین کا یہ انتخاب پسند آیا۔

نور نے اپنی تمام بہنوں کی مشابہت تھی۔ بڑی باہمی جیسا سر وقت..... بچا جیسے لمبے گھٹے بال..... اپنا جیسا گورا رنگ..... اور آبی میٹھی میٹھی طبیعت..... ان تمام خصوصیات نے اسے سب میں ممتاز بنا دیا تھا۔ خاندان میں بھی بچی چڑھا تھا کہ انچوں بھائیوں میں مہران کا جوڑ ہی ٹھیک بیٹھا ہے۔ یہ بچیگیاں سن کر بے جا رے فرقان کے دل پہ بڑی بڑی گزرتی۔ وہ مدد لقا کو دیکھ کر خضد آجیں بھرتا جو اب جان کی خواہش پوری کرنے کے پکر میں اس کے سر تھوپی لگتی تھی، ہوں تو وہ فرقان سے سال ڈیڑھ ہی بڑی تھی لیکن شادی کے موقع پہ بھی کم از کم پانچ سال بڑی معلوم ہو رہی تھی اور اب شادی کے چند سال گزرنے اور تین بچوں کے ہو جانے کے بعد وہ کہیں زیادہ بڑی اور عمر رسیدہ معلوم ہوتی تھی۔

ایک تو اس کا قد شہر کے مقابلے میں چند انچ اونچا تھا۔ اوپر سے چوڑے چوڑے مردانہ شانے اور کمر دے بے ڈھنگے ہاتھ، ہر نقش مناسب ہی تھے۔ کچھ تو چر خود یہ دیتی تو بہن اوڑھ کے ابھی ہی گھٹی لیکن اسے اتنی گھری کہاں تھی۔ نیلے میں بھی بڑی بہن ہونے کے ذمہ میں خود پہ غیر ضروری رعب و دبہ طاری کر رکھا تھا اور سسرال آنے کے بعد سب سے بڑی بہن کا رتبہ ملا تو گردن میں مزیہ کلف آگیا۔ لہجہ اور لڑک دار اور تیز مزید کا مائدہ ہو گئے۔ کوئی اور دیوانیاں ہوتیں تو چند دن بھی بڑی جیٹھانی کی حکمرانی برداشت کرتیں، نہ روک ٹوک سستیں لیکن وہ تینوں بچپن سے عادی تھیں، بڑی باہمی کی ڈانٹ پٹ کی۔ اس لئے معمول کا حصہ سمجھ کے ٹال جاتیں۔ البتہ خواجه صاحب اپنی بڑی بہن کے نظم و نسق سے بڑے مطمئن تھے

www.pdfbooksfree.pk

اور اس کا اظہار بھی برملا کرتے کہ گھر کو سنبھالے رکھئے اور اس عمدہ طریقے سے چلائے رکھئے میں ملتا کاسب سے زیادہ ماہر ہے۔

ایک لحاظ سے یہ تھا تھا۔ گھر کا بجٹ وہی بناتی تھی۔ سب بھائیوں کی آمدن کے لحاظ سے حصہ لیا جاتا۔ کوئی کم دیتا تھا تو کوئی زیادہ نہیں سہولیات سب کے لئے یکساں تھیں۔ لقمان کے دونوں بار دودھ بڑواں بچے ہوئے اور اب حال ہی میں ایک بیٹی۔ اس طرح اس کے اخراجات زیادہ تھے۔ بڑے دونوں تو سکول جانے لگے تھے لیکن آمدنی اس کی فرقان اور عمران دونوں سے کم تھی۔ تین وقت کے کھانے کے علاوہ پھل، دودھ وغیرہ میں ملتا اس کا حصہ زیادہ رکھتیں۔ اسی طرح تمام بھڑوں کو ایک خاص حد تک ذاتی شاپنگ کی اجازت تھی، چاہے ان کے پاس ہزار روپے بھی کیوں نہ موجود ہوں۔ ان کے اڑے اصولوں نے گھر میں بھی کسی حکم کی چٹش پیدا نہ ہونے دی تھی اس قدر قدرت کی فضا پیدا ہو سکی۔

ساس سسرال کا سہرا اپنی بڑی بہن کے سر باندھے تھے لیکن فرقان کو اس میں بیوی کی حیثیت سے کوئی خونی نہ نظر آئی۔ اس کے حکم سے لے کر وہ چڑتا تھا، اس کی ہمد وقت چڑھی بہنوں سے ہر گز نہیں اور اس کا چوہیں گھٹے گھر اور گھر داری کی فکر میں ہلکا رہتا ہے سخت برا لگتا۔ دونوں میاں بیوی کے درمیان موجود اس سرد مہری اور گرد بڑ کو سب محسوس کرتے تھے لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔

لقمان اور مرد پارہ بھی ہم عمر ہی تھے لیکن اپنی بڑی بہن کی طرح مرد پارہ بھی عمر سے چند سال بڑی ہی نظر آتی تھی، غصہ اس کی ناک پہ ہی دھرا رہتا تھا لیکن ملتا کی طرح اس میں گھر داری کا رچان تھا، اس کی دلچسپی دیگر امور کی طرف زیادہ تھی۔ اس نے بی ایڈ کر رکھا تھا لیکن ٹیچنگ کرنے کے بجائے گھر میں ایک ٹیوشن سنٹر کھول رکھا تھا کہ بقول اس کے سرکاری نوکری میں سر کھپائی زیادہ ہے اور محاضرات کم جب کہ ٹیوشن سٹر کے ذریعے زیادہ سے زیادہ پیسے بڑے جا سکتے ہیں۔ اس سے اس کی فطرت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ ہر معاملے میں پیسے کو اولیت دینے والی لیکن پیسہ حاصل کرنے کے لئے عقل، ہنر اور محنت کے ساتھ ساتھ لگن کا ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ بات اسے کوئی سمجھا نہیں سکتا تھا، حتیٰ کہ بڑی بھی سمجھ نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ شام کو کھانے کے چند ایک بچوں کے علاوہ کوئی اس سے بڑھنے نہ آتا تھا۔ اس کے اپنے پانچ بچوں نے ہی اس کی مت رار کر لی تھی۔ اپنے اسٹوڈنٹس پہ توجہ دینے کا وقت کہاں سے ملتا حالانکہ گھر میں اتنے لوگ ہونے کی وجہ سے اس پر کام کا دباؤ کم تھا بلکہ یوں کہتا چاہئے، بڑی باہمی نے ہر بار جڑواں بچوں کی وجہ سے رعایت دیتے ہوئے کم سے کم



ذمہ داری اس پر لگا رکھی تھی لیکن اس کے بعد بھی وہ اکثر ساری رات بچوں کی دُور سے جاگنے کا بہانہ کر کے دن بھر گھر بند کر کے سوئی رات بھر سوئے وہ سہ سہاگنیں جو ان کی چچیاں بھی تھیں اور خاتونیں بھی۔

سہ پارہ کی شادی کے چوتھے سال جب آمدہ اور آئینہ کے بعد رضی اور وحی ہوئے تو دونوں چھوٹی بہنیں پیارہ کے انجمن میں غلوں کی دہلیس سارا دن رہیں کرتے بیچے ہی اٹھائے پھر تھیں۔ بڑی دونوں اپنی مانی سے مانوس تھیں۔ وہ ان کے کمرے میں ہی کھڑی رہتیں، یوں بھی نہ اور تاوان داران کے ہم عمر تھے اور کلاس فیلو، چاروں بچوں کی آپس میں خوب ہنسی۔

عمران اور جبران کی شادی ہوئی تو دونوں کی عمریں بالترتیب ستائیس اور چوبیس سال تھیں۔ عمران ڈاکٹر تھا اور شادی میں ہی تاخیر اس کی تعلیم کی طوالت ہی کی وجہ سے ہوئی ورنہ خواجہ صاحب تو دونوں بڑے بیٹوں کی شادی کے دوسرے سال ہی دو اور بھائیوں لانے کے لئے بھجئے لگے تھے۔ مدجیں خود بھی بی ایس سی کر چکی تھی اور ایک ملٹی فیکشنل کمپنی میں میڈیکل ریسپ کی جاب کر رہی تھی۔ عمران کی خواہش یہ اس نے اپنی جاب چار دی رکھی اور یہ دونوں مہاں بیوی کے لیے اچھا ہی تھا کیونکہ شادی کو تین سال گزر جانے کے بعد بھی ان کی کوئی اولاد نہ تھی، عمران گورنمنٹ جاب کے علاوہ شام کو اپنے کلینک پہ بھی پریکٹس کرتا تھا۔ بیٹیچا گھر پہ کم ہی وقت گزرتا۔ ایسے ہی اگر مدجیں کی یہ جاب بھی نہ ہوتی تو اسے مہاں کا انتظار بھی کھاتا اور بچوں کا نہ ہونا بھی زنجیدہ کا نہ لیکن اسے مصروفیات اسے اتنا تھا کہ دیتیں کہ گھر آنے کے بعد اپنے ضروری کام نمٹانے اور آرام کرنے کے علاوہ کوئی دوسری بات اس کے ذہن میں نہ ہوتی۔

مدجیں عمران سے دو سال چھوٹی تھی لیکن جبران اور مدنا دونوں ہم عمر تھے۔ لقمان اور مد پارہ کی طرح ان میں عمر کا یکساں ہونا ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ ایک تو جبران ماشاء اللہ لہا چڑا بہت تھا، دوسرے اس کے بال بون جانی میں ہی گرنے لگے تھے۔ دونوں طرف سے نظر آنے والے چڑے لگتے تھے اسے ذرا بڑی عمر کا ظاہر نہ شروع کر دیا تھا۔ اوپر سے مدنا چھوٹی موٹی سی یوٹا سا قد رکھنے والی لڑکی تھی۔ رنگ اس کا ساوولا اور نقشب بھی عام تھے لیکن چہرے پہ غضب کی مصمصیت اور نرکی تھی، یہی نرکی اس کے لہجے میں بھی تھی اور عادتوں میں بھی۔ اگر گھر کا ماحول پُر سکون بنائے رکھنے میں بڑی سی بہو کا زیادہ ہاتھ تھا تو چھوٹی بہو نے بھی آکر گھر کے ماحول کو مٹائی جانے میں خاصا اہم کردار ادا کیا تھا ایک کے مزاج کی سختی سب کو درست رکھتی تو دوسری کے مزاج کی نرکی سب کو شگفتہ رکھتی۔

www.pdfbooksfree.pk

اب سب کی توجہ کا مرکز ماہ نور تھی۔ مہراں کو بھی اپنی مہینگر سے دلچسپی ہو چکی تھی جو کہ ایک فطری سی بات تھی حالانکہ وہ سب سے جانتا تھا کہ بڑے بھائیوں کی طرح اس کا نصیب بھی شیخ صاحب کے گھرانے سے وابستہ ہے اور ماہ نور بھی بہنوں سے ملنے آتی جاتی رہتی تھی۔ اس وقت مہراں کے دل میں ایسا کوئی شریر سا جذبہ بھی نہیں جاگا تھا۔ دونوں کے درمیان سرسری سی پہلو ہائے ہوئی، البتہ سب سے چھوٹی ماہ نور سے اس کی خوب بے تکلفی تھی۔ وہ بھی بھی تو اتنی پیاری اور گولہ روئی۔ وہ اکثر اسے اکل کی بڑھا چپ کے اولاد کہہ کر چھینتا اور بڑی بھالی سے جواباً ڈانٹ بھی سناتا جن کی بڑی بیٹی عاشری سب سے چھوٹی خالہ سے بس ڈھائی تین سال ہی چھوٹی تھی۔ خالہ صاحبہ کا اپنے بھانجے بھانجیوں کے ساتھ خوب جھگڑا ہوتا، بات بات پانی تک آجاتی۔ مہراں بڑی مشکل سے اسے چھڑاتا تھا اور نوید آئینہ، آمدہ کو لے کر خالہ کا منہ چراتے اپنے کمرے میں کھس جاتے اسے اپنے ساتھ نہ کھلانے کا اعلان کرتے ہوئے اور مہراں اس کے پھولے پھولے گالوں پہ پیچھے آؤ نہ دیکھ سکتا۔ چھٹ اسے موڑنا سیکھ پہ بٹھا کر کے اکٹس کریم کھلانے لے جاتا۔ وہ ایسی پہ چڑانے کی باری ماہ نور کی ہوتی۔

”دیکھا تمہارے چاچا تمہیں نہیں لے کر گئے، وہ تو میرے فریڈ ہیں۔“

اور اب مہینگی کے بعد چاچا تک ہی مہراں کی دلچسپی اس گھر سے اور بڑھ گئی۔ اس نے ماہ نور اور مدجیں کو استعمال کیا اور آئے دن چاکلیٹ، کبکلیٹ کی کتابیں لے کر وہاں جانے لگا۔ ماہ نور اگرچہ اس کے سامنے مئی کی لیکن پل دو پل کا سامنا بھی دونوں کو خوشگوار احساس دے جاتا اور مہینگی کے تیسرے مہینے ہی جب ماہ نور کے ہائیڈینڈ میں جلا ہونے کی اطلاع ملی تو وہ فوراً ہی جان کے ساتھ ہی ہٹی ہونے والی سرال جا پہنچا۔ ہزار کوششوں کے بعد بھی وہ اس کی ایک جھلک تک نہ دیکھ سکا۔

وہاں سے لوٹنے کے تیسرے روز عمران بھائی نے اطلاع دی کہ وہ ماہ نور کو اپنے ہاسٹل ایڈمٹ کر آئے ہیں۔ شیخ صاحب اور ان کی اہلیہ نے بیٹی کے آئے روز کے بخار کو اہم نہ جانتے ہوئے خود ہی علاج معالجہ کی طرف خاص توجہ نہ دی تھی، پیرا سمول وغیرہ دیتے رہے اور ان کی سادگی بالا پروائی نے یہ دن دکھایا کہ نہ صرف ناچھینڈا بگڑ گیا بلکہ بڑھاپا نے بھی بگڑ لیا عمران بھائی اپنی غفلت کو کوس رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ مدجیں پہ بھی بگڑ رہے تھے کہ انہوں نے بھی اتنی کچھ بوجھ اور قابلیت رکھنے کے باوجود بہن کو کسی اسپیشلسٹ ڈاکٹر کو دکھانے کی ضرورت کیوں نہ سمجھی۔ کم از کم انہیں تو تادیب تو یہی ہوتی نہ آتی۔ ان کا تردد اور فکر سب کو پریشان کر گیا کہ ہو نہ ہو ضرور کوئی خطرناک بات ہے اور اگلے دن جب خواجہ صاحب

تک میں ہی سنا رہا ہوں۔“

”اے مولیٰ کمال، کیوں اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی گردن توڑ بخار میں مبتلا کرتا ہے۔

اٹھ اندر چل، اے سی آن نہیں کرتے۔ صرف پکھا چلاؤں گا۔“

”وہ تو یہاں بھی چل رہا ہے۔“ اس نے برآمدے کی چھت پر لگے بادا آدم کے زمانے کے پچھلے کی طرف اشارہ کیا جو بغیر سائلر کے موٹر سائیکل کی آواز میں نکلتا ہوا دے کے پرانے مریضوں کی طرح تھکی تھکی پیوٹیں مار رہا تھا۔

”ارے یہ تو جہنم کی آگ چمک رہا ہے۔ اندر چل، میرے یار، کرہ خطا بھی ہے، پُر سکون بھی، آرام، بے بیخ کوئی مووی دیکھیں گے۔“

”یار! اس کھلی فضا میں.....“ وہ شاید موسم کی شان میں کچھ اور قصیدہ پڑھتا لیکن راحت کا میٹر تو لفظ ”فضا“ پہ ہی ڈاؤن ہو گیا۔

”مردم اس ”پُر فضا مقام“ کے مزے لوٹتے ہوئے۔ میں باز آیا ایسی مہمان نوازی سے۔ میں تو اندر جا رہا ہوں۔ تمہاری مرضی اپنے گھر یا پھر یہیں میرے گھر کے برآمدے میں بیٹھے بیٹھے گیت گاتے رہو۔“

”موسم ہے عاشقانہ..... موسم ہے عاشقانہ۔“

مہراں نے اس کی بات میں کرہ لگاتے ہوئے تان بلندی، وہ واقعی اندر جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

”اے دل کہیں سے ان کو

ایسے میں دھوڑ لانا

ایسے میں دھوڑ لانا۔“

اندر جانے کے ارادے سے مزتا راحت ٹھکا۔ گانا گانے اسے چڑانے کے لئے شروع کیا تھا لیکن سوز اور تپ کچھ اور کھڑی تھی۔ اس نے نونالی نظروں سے اسے دیکھا، اس کی بے قرار نظریں گیٹ پہنچی تھیں، ٹانگ پہ لگی ٹانگ اضطرابی کیفیت میں مل رہی تھی اور مدھم ہوتی آواز کے ساتھ ٹنگنا تادہ خود جسم انتظار بنا ہوا تھا۔

”اے دل کہیں سے ان کو.....“ اور ساتھ کمال کی خوشگوار سی چکار اس کے لبوں پہ مسکراہٹ لے آئی۔

راحت کی مشکوک اور سوالی نظروں کے جواب میں اس نے بے ساختہ پھیلے سینے اور جگنو کی سی چمکنی آنکھوں میں زمانے بھر کی معصومیت سمیٹے ہوئے وضاحت کی۔

کے ساتھ ساتھ باقی تمام اہل خانہ بھی ماہواری عیادت کے لئے ہاسٹل گئے تو وہی سب کے چہروں پہ ایک ہی تاثر تھا۔ بھائیوں تو بچے پکڑ رکھی تھیں۔

مہراں سے رہا نہ گیا۔ وہ صبح ہی مدناز بھائی کے ساتھ ہاسٹل گیا، ماہواری کو آئی سی یو میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ اس کی رنگت خلتا نہ کہ حد تک پیلی پڑ چکی تھی مہراں بھائی کے مطابق اس کا جسم دوا قبول نہیں کر پار تھا اور بغیر دوا کے وہ مریض کے زور دے کے کئی دیر تک لوسکتی تھی اور وہی ہوا جس کا غرض سب کے دلوں میں کنڈلی مارے بیٹھا تھا لیکن کوئی بھی بدشگونی کے ڈر سے ایک دوسرے سے اس کا اظہار کرنے کی ہمت نہ کر پارہا تھا۔ اسی شام ماہواری وفات کی خبر آئی۔

☆=====☆

پچھلے آدھ گھنٹے سے وہ گرم ترین برآمدے میں بیٹھا راحت کی دہائیاں سن رہا تھا۔ گرمی اور لو نے پیسے چھڑا کر تھے تو اس کے مسلسل اندر چلنے کے اصرار نے مہراں کے چکلے چھڑا رکھے تھے۔

”یار! تو سمجھتا کیوں نہیں۔ مجھے زکام ہے۔ اندر اے سی میں نہیں بیٹھ سکتا۔“ اس نے کہا بتایا۔

”گرمی کے زکام میں اے سی کچھ نہیں کہتا بلکہ اور طبیعت بحال ہو جائے گی۔“ راحت نے اسے سے بچے پیسے کو مال سے خشک کرنا چاہا لیکن وہ پچھلے ہی اس قدر غور رہا تھا کہ چہرہ اور چھپچھا ہو گیا۔

”میرا زکام ہے، مجھے زیادہ ہوتا ہے، کس چیز سے خراب ہوتا ہے اور کس چیز سے صبح۔“ اس نے بڑے مدبرانہ انداز میں کہا تو وہ ٹھنڈا سا ہوا کے بخور دیکھنے لگا۔

”کہیں سے آواز نظر تو نہیں آرہے نہ زکام کے۔“ وہ بحث نہ کرنا گیا۔

”میں نے کہا ناں۔ میرا زکام ہے مجھے ہی پتا ہے۔ ویسے مجی میں اپنی ٹیکنیوں کا اشتہار نہیں گھوٹا..... جیسے غم اور دکھ دل کے اندر ہی لی جاتا ہوں ویسے بیماریاں بھی چھا کر رکھتا ہوں۔“ مہراں نے چہرے سے ”دیو اس“ کے سے تاثرات سجاتے ہوئے کہا تو راحت جل کر رہ گیا۔

”ہاں ہاں۔ پتا ہے..... مجھ سے زیادہ اور کون جانتا ہوگا یہ ”اہل حقیقت“ کہ تم ہر دکھ اور غم دل کے اندر چھپا کر رکھتے ہو..... ہونہ..... بچپن سے جانتا ہو جنہیں، کائناتی جیسے تو جی جی کر سارا زمانہ سرپاٹھا لیے ہو، ذرا ذرا سی بات پر تمہارے دھڑکنے ڈھائی ڈھائی گھٹنے



پنڈراسی گھبراہٹ کے آثار پیدا ہوئے۔

”وہ..... راحت بھ.....“

”دفع کرو اسے۔ تم کچھ دیر یہاں بیٹھو میرے پاس۔“ اس نے سامنے رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا لیکن وہ سکراتے ہوئے نئی سی مہر لائے گی۔

”ہر بار آپ ہی کی بات نہیں مانی جائے گی۔“

”ایک منٹ..... پلیز؟“ اسے پلٹے دیکھ کر مہران نے بے چینی سے پکارا

”جی..... فرمائیے؟“ وہیں دروازے کے پاس کھڑے کھڑے اس نے پوچھا۔

”فرمانا کیا خاک ہے۔“ اس کا تکلف مہران کو زہر لگ رہا تھا۔ ”نعمت نہ ہو تو ایک گلاس سکواش پلا دیجئے۔“ اب کے اس نے مطر سے بڑھ کے تکلف پیش کیا جسے محسوس کر کے اس کے لبوں پہ پھر سے وہی گندہ اتاجسم پھیر گیا، جو پہلی بار میں مہران کو لوٹ کر لے گیا تھا۔

وہ پتیلیوں میں چہرہ پھسائے بڑی دلچسپی سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ جب وہ یہاں آئی تھی تو کالج پوٹھار میں محسوس ہونے والی تمازت سے تنہا چہرہ بے حد سرخ لگ رہا تھا۔ اب اس نے ایک ڈھیلا ڈھالا سالان کا سوٹ پہن رکھا تھا جو عینا جینا کا ہوگا۔ اس نے منہ ہاتھ دھونے کے بعد تویلے سے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ تھی، بلکی بلکی سی می کے آثار گالوں پر نمایاں تھے اور ماتھے کے ذرا اوپر بالوں پہ چند سنہرے قطرے بھی دکھ رہے تھے۔

”لیجئے!“ گلاس اس کے سامنے نیچل پڑے رکھ کے وہ پھر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ مہران دوبارہ کوئی بات نہا کر اسے کچھ دیر اور درو کرنا چاہتا تھا لیکن واش روم سے مسلسل آتی بچتے پانی کی آواز ایک دم خاموش ہوئی تو اسے خود پہ ضبط کرنا پڑا۔

بہر حال وہ اپنی بے قراری کی وجہ سے مطر کی ناراضی افورڈ نہیں کر سکتا تھا اور مطر..... وہ اس معاملے میں حد سے زیادہ حساس اور محتاط تھی، اسی لیے تو اس کا رابطہ مہران سے صرف ای سیٹلو اور ٹیلی فون کا لڑتیک محدود تھا اور آج کی ماہ کے بعد صرف اور صرف اس کی ضد اور اصرار کے ہاتھوں تک آکے وہ یہ راہ نکالنے پہ مجبور ہوئی تھی تاکہ مہران کی اسے ایک جھٹک دیکھ لینے کی خواہش بھی پوری ہو جائے اور اسے کسی ایسے امتحان سے بھی نہ گزرنا پڑے جس کے نتیجے میں اس کے گھر والوں کا اس کی ذات پر اعتماد ڈھکسا جائے۔ اس کی شوخ اور قدرے بولڈ شخصیت کے پردے میں پوری آب و تاب کے ساتھ جھگڑنا تو نسوانی وقار ہی تو

www.pdfbooksfree.pk

مہران کو بھایا تھا۔ اسے آج بھی اپنی اور اس کی پہلی ملاقات یاد تھی۔

☆=====☆

بات زیادہ پرانی نہیں تھی بلکہ مہران کو تو جیسے کل کا واقف لگتی۔ ایسا ہی ہوتا ہے، دن جب خوشگوار ہو جائیں، پھر جب سبک ہو جائیں اور راتیں خواب بننے میں نکلنے لگیں تو ایسا ہی ہوتا ہے اور ایک وقت وہ بھی خواب تھا اسے تمام شب دروازے پر ایک جیسے کھلے تھے..... جامہ..... تھکے ہوئے..... طویل..... اور آکٹے ہوئے۔

یہ بھی ان ہی مشکل دنوں کا ذکر ہے۔ ماہور کی وفات کا چھ ماہ گزر چکے تھے لیکن خواجہ ہاؤس اور اس کے کینٹون پہ ابھی تک روز اول والی سوگاری نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ خود مہران بھی خود کو اس مہیب ادا کی سے بچانا نہ پایا تھا۔ بلکہ دیکھا جائے تو سب کے دلوں پہ غم اور صدمہ نے حملہ ہی اب کیا تھا۔ ماہور کی آناٹا نا بد قسمتی عام سی تکلیف اور پھر ایک آدھ دن میں ہی وفات کی خبر نے پہلے پہل سب کو جس جھٹکے سے دوچار کیا تھا وہ حیرت کا تھا۔

کسی کو یقین ہی نہ آتا تھا کہ ایک ہفتی تک اپنی زندگی سے بھر پور لڑکی جس کی آنکھوں نے ابھی ابھی خوابوں کا ڈانڈہ چکھتا تھا، ہمیشہ کے لئے چپکلیں موند چکی ہے۔ جیسے جیسے حیرت کا کھجور ڈھیلا پڑتا گیا، دکھ کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔ تمام بھابیوں تو غر حال تھیں ہی، بچے بھی اپنی ہوش میں پہلی موت دیکھنے پر سہمے ہوئے تھے۔ غرض یہ کہ گھر کا ماحول بھی اس قدر تاریکی اور سوگوار سا تھا کہ مہران کو کونسلنے کا کوئی سہارا نہ مل سکا۔ اسی عالم میں اس کا ایم بی اے کا رزلٹ آیا۔ اس کی شاندار کامیابی نے خواجہ ہاؤس کے دروازے پر چھائے جمود پہ پہلی دراڑ ڈال دی اور کئی ماہ سے ایک دوسرے کو دلاسار بچے کینٹون سے خود کو مبارک باد دیتے چلے۔

ان ہی دنوں نشاط باج کی شادی کے بنگامے جاگ اٹھے۔ راحت سے اس کی دوستی ختم نہیں تھی۔ وہ دونوں ہائی سکول سے ایک ساتھ تھے تو لڑکیں کی پہلی پچھلی سی دوستی کالج جا کر بارے میں بدل گئی۔ راحت اگرچہ بی کام کرنے کے بعد اپنے ایلو جی کے ساتھ آفس جانے لگا تھا لیکن دونوں کی دوستی پہلے سے نہیں زیادہ گہری ہو گئی تھی کیونکہ کالج کی دوستی اب گھریک پہنچ چکی تھی۔ مہران اب اس سے ملنے اس کے گھر جایا کرتا تھا، اس کے مختصر سے گھرانے کا سادہ اور پُر غلوں ماحول اسے بے حد بھایا تھا۔

نشاط باج کی ڈانٹ ڈپٹ، چھوٹی بیٹا کی شکایتیں سننے اور ای جی اور ایو جی کی نصیحتیں سننے میں اسے مزہ آنے لگا۔ ماہور کے بعد اس کا دل ہر چیز سے ایسے اچاٹ ہو گیا تھا کہ اس نے راحت کے گھریک جاننا رفتہ رفتہ نہ ہونے کے برابر کر دیا تھا۔ راحت چاہتا تھا کہ اس کے

الی کی طرف سے تمام بیٹوں کے دوستوں کا گھر تک بلا دیا آنا ممنوع ہے۔ اس نے اس بات کا بھی برا بھی نہیں مانا تھا لیکن مہران کی ہمدردی اس سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ وہ کھینچ کھانچ کے اسے اپنے ساتھ لے آتا۔ نشاط باہی، بیٹا، امی جی سب ہلکی ہلکی کھنگو کے ذریعے اس کا دھماکا مٹانے کی کوشش کرتے۔ سب ہی اس گھرانے پر گزرنے والے سامنے سے واقف تھے اور واقعی چند گھنٹے سب کے ساتھ گزارنے کے بعد وہ خود کو ہلکا سا محسوس کرتا لیکن گھر آنے کے بعد وہی افسردگی اور پستی کی لہر اسے اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔

راحت کے گھر شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ آج شام میلاد کے بعد ڈھولک رکھنے کا پروگرام تھا۔ راحت، اپنی امی جی کے ساتھ اس کے گھر دعویٰ کارڈ دینے آیا تھا۔ امی جان اور بھائیوں سے میلاد میں شریک ہونے کے پُر زور اصرار کے بعد اس نے مہران کو رات ڈھولک کے لئے پہنچنے کی سختی سے تاکید کی۔ بھائیوں سے تو اس نے مصلحتاً اس رسم میں شامل ہونے کے لئے نہیں کہا تھا، مادادہ برائے محسوس نہ کریں کیونکہ مہران کا کہنا تو یہی تھا کہ ابھی تک وہ خود کو چھوٹی اور چھٹی بہن کے دکھ سے نکال نہیں سکتی۔

”تمہارا دماغ خراب ہے؟ میں اس خالص گھریلو اور زمانہ محل میں کیا کروں گا؟“ مہران نے اس کے اصرار پر حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

”ڈھولک پہ چھ بھاء گئے، ارے پارل بیٹنے کا بھانہ ہے یہ سب اور کیا۔ سب پار دوست مل بیٹھیں گے، کپ شپ لڑے گی، جائے قہرے کا دور پلے گا، بیک گراؤڈ میں لائیو میوزک الگ سے بج رہا ہوگا۔ جو تیرے ابا کی اونچی چوٹی..... جو میں ایشیں چٹا آیا۔“ وہ بھانڈوں کی طرح تالیاں پیٹنے لگا تو مہران نے ناگوار سے اسے گھورا۔

”جی حقیقت اگر تم نے رات کو بھی کرنی ہیں تو میرے آنے کی امید مت رکھنا۔ مجھے شوق نہیں ہے سڑی توالیاں سننے کا۔“

”اچھا میری تو یہ جواب میں نے چوں کی آواز بھی نکالی اپنے منہ سے لیکن تجھے بھی قسم ہے میری دوستی کی کہ اپنی بہن کی خوشی میں تمام رسوں میں پورے دل کے ساتھ شریک پڑے گا۔“ اس نے بات ہی ایسی کی تھی کہ مہران کو اتنی ہی غیبت۔

”او تیرے بڑے دے.....“

مست نڈیری کی آواز میں اس شہور پنجابی گیت کو وہ کئی بار سن چکا تھا لیکن وہ نہیں پارہا تھا کہ اس میں اتنا پیٹنے والی بات کون سی ہے۔ کافی دیر سے برآمدے میں بیٹھ گیت کے ان بولوں کی تکرار بھی سن رہا تھا اور ساتھ ہی بے ساختہ امنڈنے والے لہجہ پور

بھی۔ ہنسی کا طوفان ڈرا تھا تو پھر سے ایک لڑکی نے ذلتی ہاتھ مارے ہوئے آواز بلند کی۔ ”تھمتے تھمتن.....“ ابھی وہ یہاں تک ہی پہنچی تھی کہ پھر سے کئی کئی امی ہادہ ہادہ شروع ہو گئی۔ اندر سے نشاط باہی پیر پختی نکلیں۔

”منع کر لو ان سب کو راحت دہنہ میں ابھی کو بتا دوں گی۔“ وہ رو ہنسی ہو رہی تھیں۔ راحت، جس کے اپنے دانت اندر نہیں جا رہے تھے۔ سنجیدہ ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہنے لگا۔

”ہائی امی سمجھا تا ہوں..... لیکن آپ کیوں چڑ رہی ہیں۔ اب یہ ہنسی مذاق تو چلتی ہے نا۔“ وہ ناراض ناراض ہی بہن کو نشانے سے قہماتا اندر لے گیا اور جانے کیا کہا کہ کچھ دیر کے لئے ہنسی کا طوفان ختم کیا۔ خود وہ ابھی چڑتا چھوڑی دیر بعد ہی آگیا۔

”بڑی بدتمیز ہے یہ بیٹا بھی۔ سارا خوشا اسی نے چھوڑا ہوا ہے۔“ پھر مہران کی سوالیہ نظروں کے جواب میں کہنے لگا۔

”یارا دراصل یہ جو مورد بھائی جان ہیں، میرے ہونے والے بہنوئی، ہالوں کے معاملے میں ذرا ہاتھ تک ہے ان کا۔“ اسے سے کافی آگے جا کر حد و شروع ہوتی ہیں۔ اسی لئے.....“

اور مہران کو ”تھمتے تھمتن ہال“ پر لڑکیوں کا کلکسلا تا سمجھ میں آگیا۔ اس نے بے ساختہ وارد ہوئی مسکراتی کونہ پھیر کر چھپایا۔

”پھر بھی یہ ہے تو بدتمیزی۔“ انہیں سختی سے منع کر کے آنا قہماتا کہ۔ بے چاری نشاط باہی کو کتہا برا لگتا ہوگا۔

”بیٹا کوئی اکیلے تو ہے نہیں جو میں اسے ڈپٹ کر چپ کرادوں گا۔“ تجھے کا جتنا ہے اس کے ساتھ اور سب سے بڑھ کر شو، اس کی موجودگی میں سب ہی لڑکیاں شیر ہوئی بیٹھی ہیں۔ ”اچھا چلو ایسا کرتے ہیں گانے کے بول بدل لیتے ہیں۔“ ایک شروع و خشک سی آواز نے رائے دی۔

”تھمتے تھمتاں تاواں (کہیں کہیں، اکاڈکا) ہال میرے بڑے تے۔“

”بس کرو، میں اب تم سب کو مارنے لگوں گی۔“ ہائی نے دھاڑ کر چپ کرایا۔

”ہم کیا کریں باہی! میلاد میں اپنی بیٹی ایسی اچھی اچھی بائیں جاتی ہیں، اب جھوٹ بولنے کو دل نہیں کرتا۔“ بیٹا کی منمنائی آواز پر سب نے تائید کی۔

”ٹھیک ہے۔ اگر تم نے ابھی اور اسی وقت اس تہنازہ گیت کو چھوڑ کر کوئی اور گیت

شروع نہ کیا تو میں یہ مقدمہ ابوی کے پاس لے جاؤں گی۔“ اس دھمکی کے ساتھ ہی ڈھونک کی تھاپ گونگی اور کورس بجنا شروع ہو گیا۔

”جی جی، جی جی“

جبو لے بھا لے جی جی.....“

شروع سردی کے دن تھے۔ ابھی خشکی اتنی بڑی نہیں تھی۔ راحت نے تادور شعیب کے ساتھ ل کر نائٹ بسٹ منانے کا پروگرام بنا ڈالا۔ مارے جوش کے سب لڑکوں میں کھلبلی مچ گئی۔ مہراں کو چنگ بازی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ وہیں برآمدے میں ٹھس سا بیٹھا ساری کارروائی دیکھتا رہا۔ تادور نے فیضی اپنی مونزاسکیل شارٹ کر کے گھر سے نکلتی اور گڈے لینے چلا گیا۔ شعیب اور یاسر دوری، کریساں اور ڈیک تھت پچھڑا رہے تھے۔ منظر کو سرج لائٹ کا انتظام کرنے بیچ دیا تھا اور خود راحت اسٹور میں پچھلے سال کی بسٹ کے بیچ کچے مانجے، گڈے لٹکاوا رہا تھا۔ سب کی افراتفری، بہاگ دوڑ اور سب سے بڑھ کر بیچے کے کمرے سے آتی بے سُر کی آواز اور ڈھونک کی تھپ تھپ نے اسے اتارے زار کیا کہ وہ اٹھ کر برآمدے کے دوسری جانب چلا گیا جہاں یکن کی کھڑکی اور بیرونی دروازہ کھلا تھا۔ برآمدے کے ایک طرف بجبرے میں نو برڈرز رکے تھے۔ اس نے جالی کو ہلکا سا جھپٹایا مگر ایک بھی برنڈہ بجبرے میں رکے گئے چھوٹے چھوٹے گھڑ وچھڑ سے باہر نہ نکلا۔

”نہیں نہیں۔“ طوطے کی کراہی آواز ہے اس نے پلٹ کر دیکھا۔ گرل کے دروازے پہ لٹکے کلوی کے خوش نما مختصر سے بجبرے میں لمبی سی بزار اور پٹی ڈالاماطا چھدک چھدک کر اسے اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔ مہراں اس کی طرف بڑھ گیا۔

”مضو..... میاں مضو، چوری کھاؤ گے، میاں مضو۔“ وہ آہستہ آہستہ اسے پکارنے لگا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے بچپن لوٹ آیا ہو۔ ایک بڑھو رتی اور دھیرے بڑے گھر میں قدرے تاریک اور تنہا گوشے میں ایک مصوم سی ذی روح کے ساتھ انگلیاں کرنا سے عجیب بے لطف سا لگا۔

”مضو، مضو نہ کیا کھاتا ہے، بسکٹ۔“ وہ طوطے کو چکارتے ہوئے ہاتھ میں پکٹا بسکٹ تو ذکر بجبرے میں ڈالنے لگا تھا کہ ایک خشکی بھری آواز ہے بری طرح چونک گیا۔

”بد تیز شرم تو نہیں آتی اس طرح.....“ یکن کی کھڑکی سے کسی لڑکی نے بے حد جارحانہ انداز میں اسے لٹاؤنا چاہا لیکن پھر اس کی حواس باختہ سی شکل، ہاتھ میں پکڑے بسکٹ، کلورے اور سامنے لٹکے طوطے کے بجبرے کو دیکھ کر رک گئی۔ فجائت کے رنگ اس کے گھر چہرے پہ صاف نظر آ رہے تھے۔

www.pdfbooksfree.pk

مہراں کافی دیر کچھ نہ سمجھنے کے بعد انداز میں ہکا بکا کھڑا رہا پھر دھن لڑکی کے ہاتھ میں ٹرس کوکٹ کو کیز کا ڈبہ دیکھ کر ساری جھوٹیں سمجھ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ وضاحت کرنا لڑکی خود ہی منظر سے اوجھل ہو گئی۔ کوئی قصور نہ ہونے کے باوجود اسے اپنی پوزیشن بڑی آگورڈی لگی۔ بہر حال دوست کا گھر تھا اور خوشی کا موقع نہ جانے یہ لڑکی رات کی کون تھی۔ کہیں کوئی غلط فہمی معاملہ بگاڑ نہ دے۔ وہ خائف ہو کر اوپر بسٹ کی تیار یوں میں شامل ہونے چل پڑا۔ اگلی شام اٹھا جا کر راحت کے گھر میں داخل ہوتے ہی اس کا سامنا سب سے پہلے اسی لڑکی سے ہوا۔ پورچ میں رکشہ رکوانے وہ نہ جانے کن مذاکرات میں گم تھی، بے نیازی سے گزر کر اندر جانے ہی والا تھا کہ بیٹا کی آواز آئی۔

”بھیا! مہراں بھیا۔“

وہ رک کر ادھر آھر دیکھنے لگا۔ آواز رکشہ میں سے آ رہی تھی۔ اچانک رکشہ خالی ہونے لگا۔ بیٹا کے بعد دو اور لڑکیاں بھی کھچل کر باہر نکل پڑیں۔

”مہراں بھیا آگئے ہیں مضو۔“ اور مضو نے بے ساختہ چونک کر اسے دیکھا۔ مہراں کو بھی اس لفظ سے گزشتہ رات ہونے والا دلچسپ واقعہ یاد آ گیا۔ وہ دل ہی دل میں بے حد مھووظ ہوا۔

(ادوہ تو اس قدر چڑنے کی وجہ یہ تھی کہ موصوف کا اپنا نام مضو ہے۔ جب تو واقعی وہ یہی سمجھ ہوئی کہ میں اس کے ساتھ چھتر چھتر جاؤں گا، اس خیال کے آتے ہی وہ سنبھل گیا۔ اگرچہ صورت حال اس وقت بکتر ہو چکی تھی پھر بھی اسے اپنا بیچ تو صاف دیکھنا ہی تھا۔)

”جلس مہراں بھیا! ہم سب مارکیٹ لے جائیں۔“ وہ پورے استحقاق سے کہتی ہوئی اسے واپس گاڑی کی طرف لے جانے لگی۔

”اور تم اپنا رکشہ بے شک واپس لے جاؤ۔ بڑا آیا..... چار چار سواریاں نہیں بٹھاؤں گا۔“ وہ منہ اور آواز بگاڑ کر بولی تو مہراں نے سر زلج کی۔

”بری بات بیٹا! یوں ہر کسی سے نہیں لیجئے۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ چاروں لڑکیوں کو مارکیٹ لے گیا، اسی اپنی میٹم کے ساتھ کہ ایک گھنٹے کے اندر اندر وہ اپنی ساری شاہنشاہ کر لیں۔

”کوئی کیسٹ آن کریں ناں بھیا۔“ بیٹا کی فرمائش پہ اس نے آن کر دیا، ویسے بھی چاروں کی چڑچڑ سے اس کا دل گھبرا رہا تھا۔ گانے کی آواز میں کم از کم ان کی آوازیں کچھ تو دب جائیں گی۔

”A Beautiful Mind“ میں لکھا ہوا تھا۔ (یہ پانے ایک بچے کا فون ہو سکتا ہے) اسی الجھن میں اس نے ریسیور اٹھایا تو دوسری جانب سے موصول کردہ تعارف نے اسے اپنی جگہ سے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔

”میں ماہ نور پور رہی ہوں۔“

”جی؟“ وہ صرف اتنا ہی کہہ پایا۔

”میں ماہ نور پور رہی ہوں مہران۔“ اس منگنائی ہوئی سی آواز میں جیسے شہر گھلا ہوا تھا۔

”کون؟ کس سے بات کرتی ہے آپ کو؟“ کوئی ایک ماہ نور تو نہیں زمانے میں۔ اس خیال کے تحت اس نے اپنی حیرت چھپاتے ہوئے پھر پوچھا۔

”ماہ نور اور کس سے بات کرنا چاہے گی؟ ظاہر ہے مہران سے۔ جو اسے اتنی دور سے بلا لایا ہے۔“ مہران کے ماتھے پر چٹکھنیں نمودار ہو گئیں۔ ”اگر یہ شرارت ہے تو بڑی ہی گھٹیا۔ لیکن یہ کیوں ہے جو اتنا قریب سے جانتی ہے مجھے۔“ یہ سب سوچے ہوئے اس نے سختی سے سوال کیا۔

”مختصر۔ آپ کون ہیں؟ رات کے اس پہر کسی کے گھر فون کر کے بے مقصد گفتگو کر کے کیا جانت کرنا چاہتی ہیں؟“

”جی کہ میں ماہ نور ہوں۔ میں لوٹ آئی ہوں۔ کسی کی بے قراری، اداسی اور تڑپ مجھ سے دیکھی نہیں گئی۔ میں نے خدا سے اپنی زندگی دوبارہ مانگی اور لوٹ آئی۔ کیا میرا یقین نہیں کر دے مہران۔“

”کیوں اسے نہ کر۔ مجھے کیا پاگل سمجھا کر ہے۔“ اس کی بے نیکی باتوں نے مہران کو اشتعال آگیا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی مخاطب ایک لڑکی ہے، اس لیے جسے میں بات کر بیٹھا۔

”اگر مذاق ہی کرنا ہے تو اس میں کسی مرے ہوئے شخص کو اشتعال تو مت کرو۔ کہ ہوا دم اتنا احترام تو جنہیں کرنا چاہئے۔“ اسے تو قہری سے اس کی گفتگو سے تکلیف ہوئی تھی۔

”مرے ہوئے شخص کا احترام؟“ دوسری طرف سے بڑے انجیسے کے ساتھ دہرایا گیا۔ ”کیا ماہ نور اب اس دنیا میں نہیں؟“

”نہیں، ماہ نور کو زور ہے چھ ماہ ہو چکے ہیں اور اب وہ کبھی واپس نہیں آسکتی۔“ اس نے اس مذاق کرنے والی کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”جی تو آپ کو سمجھانا چاہتی تھی میں مسٹر مہران۔“ اس کا لہجہ یکسر تہدیل ہو گیا۔ ”کہ میں ماہ نور نہیں ہوں۔ کوئی بھی ماہ نور نہیں ہو سکتی، ہاں کسی اور کا نام ماہ نور ضرور ہو سکتا ہے مگر

ہاتھ سے ہاتھ کیا گیا  
دل تیرے ساتھ کیا گیا  
شیراؤ کی مختصری فضا میں گلوکار کی بڑ سوز آواز گونجی  
خوشیں

تیری چڑیوں کی کھٹک  
اب بھی سنتا ہوں دل کی دھڑکن سے  
تیرے آج کی سب سے دھڑکن  
جانیں پائی میرے آگے

میتا نے بڑی گہری نظروں سے پہلے اسے اور پھر پیچھے مڑ کر مٹھو، بلی اور ردا کو دیکھا۔ اس کے اس جتانے والے انداز کو مہران نے سرسری سا لپٹا، اس کا سارا دھیان تو ڈیڑھ روڈ کی پڑھتھر ٹریفک کی طرف تھا۔ میڈرک کے شور نے ان چاروں کی گفتگو مٹ کر دی تھی، اس کے اطمینان کے لیے اتنا ہی کافی تھا، ورنہ اسے دورانِ ذرا نیچے میڈرک سننے کا کوئی خاص شوق نہ تھا اور وہ بھی اس طرح کی سڑکوں پر۔

”مہران بھیا! آپ ہنسنا بولا کریں، یوں چپ چاپ کب تک؟ میرا مطلب ہے، ایسے تو زندگی نہیں گزرتی۔“ اس نے پارکنگ میں کار کھڑی کی تو مینا باہر نکلتے نکلتے رک کر بڑی دل سوزی سے اسے مشورہ دینے لگی۔ اسے لمبی آنکھیں لپٹا کر سچیدہ ہو کر اسے ڈنپا۔

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ چلو اور اور جلدی سے کام نہ کر آؤ۔“ اب وہ اسے کیا بتا کہ اس انجان لڑکی سے پہلا بڑے والا غلطہ اسپریشن اس کی سنجیدگی اور لئے دیئے رہنے والے انداز سے ہی زائل ہو سکتا تھا۔

”لیکن میں اس پر اچھا اسپریشن ڈالنا ہی کیوں چاہتا ہوں؟ میری بلا سے وہ جو چاہے کہے۔“

دل کی بے نیکی احتیاط اس نے خود کو بھڑکا۔ واپسی پہ مینا کے ساتھ ساتھ باقی تینوں لڑکیوں کی غیر معمولی سنجیدگی اور خاموشی پر وہ کچھ کھٹکا۔ ذرا گردن کھمکے پیچھے دیکھ لیتا تو قہقہے ان سب کی آنکھوں سے جھانکتا رحم اسے حیرت آمیز لگتا تھا۔

اگلے دن وہ قہقہہ ڈال رہا تھا۔ دودن ہی خوب جی بھر کے بور ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا لیا تھا کہ اب شادی کے دن ہی جائے گا چاہے راحت کتنا ہی اصرار کیوں نہ کر لے لے رات گئے فون کی تیل نے اس کی کھوپیت توڑی۔ وہ دلاؤغ میں بیٹھا رسل کر دی کی تھی مودہ

وہ نہیں ہوگی کیونکہ ماہواریک ہی تھی اور اب نہیں ہے اور نہ ہی کبھی واپس آئے گی۔ اگر آپ اس حقیقت سے باخبر ہیں تو پھر اسے تسلیم کیوں نہیں کر لیتے کہ ماہو کو آپ کی کبھی طرح واپس آنے پہ مجبور نہیں کر سکتے۔ فون بند ہو چکا تھا لیکن ریسیور ہاتھ میں لئے وہ کتنی ہی دیر بیٹھا رہا۔

وہ کون تھی، کیا کہنا چاہتی تھی اور کیا کہہ رہی تھی۔ سب اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ پہلے تو وہ اسے کسی پتھر جس جراح رکھے والی لڑکی کا ادھما مذاق سمجھا تھا لیکن اب اسے بات کچھ اور بھی لگ رہی تھی۔ اس نے اپنا تعارف جس انداز میں کرنا تھا تب غصے اور نفرت کی شدت نے اس کا دماغ تقریباً ماؤف کر دیا تھا اور اس نے کسی بات کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ اب ایک بات تھی جو اسے کلک رہی تھی، اندر کہیں ایک الارم بج رہا تھا لیکن وہ پورے دوش سے کہہ نہیں سکتا تھا کہ جو کچھ وہ محسوس کر رہا ہے وہ کیا واقعی ہے کبھی انہیں۔ اگر اس وقت بات کرتے ہوئے وہ دھیان دے لیتا تو شاید کوئی سراپا تھا جاتا خود اسے الجھتا وہ سوئی گئی۔

اگلی رات اسی وقت ٹھیک ایک بجے اسے پھر فون کی بیل سنائی دی۔ دن بھر جا ب کے لئے بھاگ دوڑ میں مصروف وہ رات کا واقعہ تقریباً بھول چکا تھا، اس لئے فون نہ لیا، تیسری بیل پہ جیسے اس کے ذہن میں جھماکا ہوا، اس نے وال کلاک پہ ٹائم دیکھا اور جلدی سے سلپیر پہناتا کرے سے نکلا۔

لقمان بھائی جمائیاں لینے لاؤنچ سے نکل کر واپس اپنے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔ فون یا تو بند ہو گیا تھا یا پھر کسی نے ان کی آواز سن کر لائن کاٹ دی تھی۔ وہ بیل کی آواز سن کر تے ہوئے نزدیک ہی بیٹھا گیا۔ اس بار اس نے خود کو اپنے اسوان بحال رکھنے کا آرڈر دیا۔ پچھلے فون پہ اس کے لا شعور میں جو بگلی سی بھن منظر کی بازگشت رہ گئی تھی، وہ اس کی تصدیق کرتا چاہتا تھا۔ بگلی سی بیل ہونے پہ اس نے ریسیور اٹھالیا اور دم سادھ کے بغیر کچھ بولے سننے لگا۔ دور دیکھ سے دھوک کی مدھم کی تھاپ سنائی دے رہی تھی وہ چوٹا ہوا گیا۔

”ہیلو..... کون؟ ماہو؟“ اس نے جان بو پھر کر یہ کہا تھا۔

”آف..... آپ کب سمجھیں گے کہ ماہو کو آپ اس طرح جوگ لے کر واپس نہیں لائیتے۔ آپ اسے یاد رکھیں کسی اچھی بات کی طرح لیکن اس یاد کو نامور مت بنائیں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ اس طرح کی زندگی گزار کر آپ اس کی روح کو کوئی تسکین دے رہے ہیں۔ آپ نہیں جانتے کہ آپ کی یہ حالت دیکھ کر اسے یقیناً تکلیف ہو رہی ہوگی۔“ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ اسے خبر نہ تھی، ساری توجہ اس جانب تھی کہ وہ کہاں سے بول رہی ہے۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ

اس وقت کیلی نہیں بلکہ اس کے ارد گرد اور بھی لڑکیاں جمع ہیں جو اسے مختلف مشوروں سے نواز رہی ہیں۔ ان کی آوازیں کیمپوں کی جھنناہٹ کی طرح اس تک پہنچ رہی تھیں۔

”آپ کی یہ حرکتیں.....“

”کیسی حرکتیں؟“ اچھی طرح مطمئن ہونے کے بعد مہراں نے اب اس کی گفتگو کی

طرف دھیان دیا۔

”کبھی اداس رہنا، کم کم چپ چاپ بیٹھے رہنا، زندگی سے بے زاری، روفت اور گہما گہمی سے آگاہت، خوشیوں سے ناراضی..... ایسے گیت سننا۔“ اس کے آخری حوالے پہ وہ بری طرح چوٹا۔ اسے یاد آنے لگا کہ اس شام گاڑی میں وہ سید سوگ گئے ہی جتنا کہ تاثرات بدل گئے تھے اور مارکیٹ سے واپسی پہ باقی لڑکیوں کا رویہ بھی بدلا بدلا لگ رہا تھا۔

ہو نہ ہو یہ ان چاروں میں سے ایک ہے اور یہ کبھی ممکن ہے چاروں کا نولہ ہی ہو۔ جتنا احسن بھی ہے اور شر بھی لیکن اس طرح کا مذاق اور وہ..... نہیں۔ ہو سکتا ہے، یہ سب اسی کی وجہ سے ہو لیکن یہ جتنا نہیں ہو سکتی۔ اس میں اتنی بات نہیں کہ وہ اپنے مہراں بیسے اتنا سنگین مذاق کر سکتے۔

”آپ جانتے ہیں کہ آپ کا یہ رویہ آپ کو نارمل زندگی سے دور لے کر جا رہا ہے۔“ اس کی خاموشی نے لڑکی کی ہمت بڑھائی۔ ”آپ ذہنی مریض بھی بن سکتے ہیں بلکہ بن رہے ہیں۔ بات کرتے کرتے چپ ہو جانا بھی اس کی ایک نشانی ہے اور بے زبان جانور اور پرندوں سے اکیلے میں گفتگو کرنا بھی یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ اب انسان سے نامید ہو چکے ہیں۔ دیکھئے یہ غلط رویہ ہے۔ زندگی کسی ایک فرد کے جانے سے ختم نہیں ہو جاتی اور.....“ وہ بولتی رہی اور مہراں نے غصڑی سانس بھر کر ریسیور کو گھورا۔

جو بات وہ جانتا چاہتا تھا، اس نے بڑبڑے پلن میں خود ہی اگل دی تھی۔ بچپن سے ابلی جان کے پالے ہوئے کتوں، بلیوں، بھٹوں، مرغیوں اور طوطوں میں رہ رہ کر اسے ان بے زبان جانوروں سے انسیت ہو گئی تھی اور اس رات طوطے سے باتیں کرتے ان چار میں سے صرف ایک لڑکی نے ہی اسے دیکھا تھا۔ وہ لڑکی..... جو طوطے کی ہم تانم تھی اور شاید ہم عادت بھی۔ ابھی بھی ایک فون کے ساتھ رٹا نا یا سبق دہرا رہی تھی۔

”آپ کی ابھی عمری کیا ہے۔“

”بچپن سال۔“ تنبیہ کی سے فون کے بات کاٹی۔ اس کا سلسلہ کلام پھر سے جڑا۔

”دبی تو، اس عمر میں جوگ لے لینا کوئی اچھی بات ہے؟ آپ کی ذات پہ دوسروں کی



محبش بھی فرض ہیں۔ کسی ایک کے متعلق میں دنیا چھوڑ دینا اصناف نہیں۔ ”وہ نہ جانے کمر غلامی میں جتنا کیا۔ کیا متعلق؟ کیا جوگ؟ وہ دل ہی دل میں فس پڑا۔ اپنا کچا اسے ایک شرارت سوچھی۔

”میاں بطور اجوری کھاؤ گے؟“

دوسری طرف زبان کو اپنا کچا بریک لگ گئی۔ مہران نے اپنا سوال دہرایا تو لمبی و ”ہائے“ کے ساتھ فون رکھ دیا گیا۔

اگلے دن وہ بظاہر راحت کے ”نڈر دھرا“ پر وہاں گیا تھا۔ حالانکہ رات کو فون نہ ہوتے ہی اس نے کل مایوں کی تقریب میں جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اس کی متلاشی نظریں اسی کو ڈھونڈ رہی تھیں لیکن ابھی تک اس کی ایک بھی جھلک وہ دیکھ نہ پایا تھا۔ ایک تو آج باقاعدہ رسم تھی مایوں کی اس لئے لوگ بھی زیادہ تعداد میں تھے۔ دوسرے یہ کہ نشاط باقی کے کمرے کے بجائے لڑکیاں آج ہال میں جمع تھیں۔ وہیں رسم ادا ہوئی تھی۔ اس وقت شاہد اور فہرہ دو گلوکار کے مظاہرے ہو رہے تھے۔ اس لئے مردانہ داخلہ ممنوع تھا۔

”یار مہران! یہ ہمارا اور گھر سے ڈراما دہرنا کو پکڑا آ۔“ راحت نے اسے پیلے رنگ کے پھولوں سے بنے درختوں ہار اور گہرے چھائے اور خوب جگت میں لان کی طرف پکا جہاں نشیں اس کی مرضی کے مطابق سیٹ نہیں کی گئی تھیں۔ وہ پھولوں کا ڈھیر سنبھالا ہال کی طرف بڑھا۔

جتیاں بجھائی رکھ دی، میں جتیاں بجھائی رکھ دی

دیوالے بے ساری رات میر یا اپنا

دیوالے بے ساری رات

کارپٹ پہ گول دائرے کی صورت میں بیٹھی تالیاں بھائی لڑکیوں کے جھرم میں وہی تھی جو اس وقت پورے جوش کے ساتھ ڈانس کرنے میں مگن تھی۔ کزنز اور دوستوں کی متواتر تالیاں اسے اور پُر جوش کر رہی تھیں اور اس کے قریب ہی مزید حرکت ہو کر تال سے تال ملانے لگتے تھے۔ دروازے میں ایسا وہ مہران نے بڑی دیکھی سے اس کی سادہ مگر بے ساختہ حرکات دیکھیں۔ کھلتے ہوئے پیلے رنگ کے قمیص اپنا شمار کے ساتھ اس نے ہنسی کا چٹا ہوا پیلا، ہنبر اور سرخ رنگ کا پونڈ لے رکھا تھا۔ دوٹوں کلائیوں میں بھر بھر کے ہم رنگ کالج کی پٹریاں پہن کر کھی تھیں۔ ریشمی بال چوٹی میں قید تھے، البتہ چند ٹیس ڈانس کے دوران چہرے

پر گرا آئی تھیں، ہلکے سے میک آپ کے ساتھ وہ پہلے سے کھینا ابھی اور الگ نظر آ رہی تھی۔ ابھر دلیلوں راتوں رات کھدی

پادینی آس شاماں

نتاں کر کے تھک گئی آں میں

سوحیاں داگ غلاماں

دوٹوں بھیلیاں جوڑ کر جب اس نے متیں کرنے کا اشارہ کرتے ہوئے رخ پھیرا تو ایک دم مہران کو محسوس ہوا جیسے اس کا بدل کئی انہی بھیلیوں کے درمیان پھنس کر رہ گیا ہے۔

اج میری اک سن لےٹو

اج میری اک سن لےٹو

فضا میں لہرا کے اٹھنے اس کے سر میں بازو ہیں بلند رہ گئے۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے سامنے دیکھنے لگی۔ اس کی نظروں کے تقاب میں اکثر نے پیچھے گردنیں جھکیں تو خود کو سنبھالا مہران یوں قدم بڑھانے لگا جیسے وہ ابھی ابھی منظر میں داخل ہوا ہو۔ مشورہ پ سے کارپٹ میں بیٹھ چکی تھی۔ گا نا ابھی بھی چل رہا تھا اور کئی لڑکیوں کی قل قل بھی شروع ہو چکی تھی۔ مہران نے مسرت سے پھولوں سے بھرے قیلے پینا کی طرف بڑھائے اور اسی بیچیدگی سے باہر نکل گیا۔

اگرچہ رسم رات دیر گئے تک جاری رہی مگر وہ قہدا ساڑھے بارہ بجے وہاں سے نکل آیا۔ پونے ایک بجے سے لے کر دو بجے تک لاؤنج میں فون کے نزدیک نیم دراز وہ چینل سرچنگ کرتا رہا لیکن تیل نہ ہوئی۔ (گلتا ہے میاں مٹوئی میں نہیں بند ہوگئی، سارے کس بل نکل گئے ایک ہی نظر میں)

”کس کے اس؟ اس کے ہاتھار ہے؟“ اندر سے سوال گونجا تو وہ مسکرا اٹھا۔

☆=====☆

مہندی والے دن لڑکیاں جن دو کو سڑ میں سوار ہوئیں، ان میں سے ایک کی ڈرامیوگ کافرینڈ سے سونا گیا۔ ہائل گرین ٹھیلوں کے تقش سے بچے لینگے اور میرن ٹکری کی ڈبل چوٹی کے ساتھ ٹائی اینڈ ڈائی..... اور گونے سے سجا ہوا ساؤنڈ اوڈ سے سلور جینری اور میرفٹن شیز ڈمیک آپ کے ساتھ وہ تمام لڑکیوں میں نمایاں تھی۔ حالانکہ وہ درجن لڑکیوں نے اس وقت اسی طرح کا لینگ پہن کر کھا تھا لیکن اس کی چھب ہی نرالی تھی۔

مہران نے محسوس کیا کہ اسے ڈرامیوگ سیٹ پہ بیٹھے دیکھ کر اس کے بڑے قدم قدم تھم گئے

تھے۔ کچھ مذہب کے عالم میں کوئی دوسری کوسر دیکھنے لگی جو پہلے ہی اوپر تلے چڑھی لڑکیوں سے بھر چکی تھی۔ اتنی ہی دیر میں دوسری کوسر میں بھی تل دھرنے کو بکھ نہ رہی۔ مہران نے اپنے برابر کی سینٹ پھر سے ہندی کے قہال کو دیکھا اور پیچھے روا کی گود میں چڑھی بیٹھی بیٹا کو آواز دی۔

”بیٹا تم آگے آ جاؤ اور اگر کوئی اور بھی رہتی ہے تو اسے بھی لے آؤ۔“ اسے بالکل قریب آکھٹے، مٹھانا خود اسے بھی محبوب لگ رہا تھا۔ اس نے بیٹا کا سہارا لیا کہ وہ تو بالکل اس کی چھوٹی بھجوں بیٹھی تھی۔

”م..... میں..... میں.....“ بیٹا کترائی کترائی ہی پھر رہی تھی۔ جس سے صاف ظاہر تھا کہ مٹھو کی شرارت میں وہ برابر صبر دار تھی، اسی لئے راز نگل جانے کے بعد اس سے بچتی پھر رہی تھی۔

”اتنی محنت سے سجایا قہال خراب نہ ہو جائے۔“ اس نے عذر پیش کیا۔  
”گود میں رکھ لیتا۔“ اس کے غلطی لہجے پہ چارہ دھوے آتری۔ ”ارے مٹھو باہر کھڑی ہے ابھی تک۔ آ جا میرے ساتھ بیٹھ جا۔“ اس کا بازو بھی کھینچا۔

اب مہران کے برابر میں صحت مند کی گھلو بیٹھی تھی اور ساتھ بیٹھی ہوئی مشوار دونوں کی گود میں رکھا تھا۔ جس پہ ہندی پہ گری افغان اور کہیں کہیں رکھے سلور پینٹ کئے دیئے سجے ہوئے تھے۔ پیچھے بیٹھی لڑکیوں نے ہندی کے گیتوں کی پرینکس جاری رکھی تھی لیکن وہ دونوں چپ چاپ سامنے کئے جاری تھیں۔ لڑکے والوں کا گھر قریب آنے پر اس نے بریک لگائی۔ گھر سے ذرا پہلے ہی تمام لوگ سواریوں سے اتر کر جمع ہوئے تھیں۔ وہ دونوں بھی اترنے والی تھیں جب مہران نے کہا۔

”تم دونوں نے جو حرکت کی، مجھے اس کی وضاحت چاہئے، مکمل جواز کے ساتھ، جو کہ میں جانتا ہوں کہ ہرگز نہیں ہو گا تمہارے پاس۔ پھر بھی..... اس حرکت کو نظر انداز کر دینا چاہئے یا نہیں اس کا فیصلہ تمہاری وضاحت سننے کے بعد ہی ہوگا۔“

”وہ..... بھیا..... دراصل.....“ بیٹا گڑبڑا کے کچھ کہنے ہی جاری تھی کہ مہران نے روک دیا۔

”تم سے تو میں بعد میں تفصیلی بیان لوں گا۔“ اس نے خشک نظر سے گھر کو دیکھا کہ ہراساں کیا۔ ”ہاں ان مخصوصہ سے کہہ دو کہ.....“

”میرا نام مٹھو ہے، مٹھو ہائیوں۔“ ترختے لہجے میں اطلاع دی گئی۔ اس نے لمبا

سانس کھینچ کر فضا میں سے کوئی مہکا احساس اندازا رہا۔ جیسے اس کے نام کے پھلے سے ارتعاش نے ہی ہواؤں کو مٹھو کر دیا ہو۔

”نام جو بھی ہے، کام تو آپ نے ایسا کیا ہے کہ جواب طلبی ہر حال میں ہوگی۔ کل دن کو دس بارہ کے درمیان میں آپ کے فون کا انتظار کروں گا۔“

جواب اس نے سراپے جھٹکا تھا کہ اسے کسی بات کی کوئی پرواہ ہی نہ ہو۔ اس کی فتح ہوئی رنگت البتہ کچھ اور کہہ رہی تھی اور وہی ہوا کا کافی انتظار کرنے کے بعد جب بارہ بجنے میں مٹھو پانچ ہی منٹ رہ گئے تھے، اس کا فون آ گیا۔

”پلیز ہم سے غلطی ہوگئی۔ آپ کسی کو بتائیے گامت۔“ چھوٹے ہی پہلی بات اس نے یہ کی۔ لہجہ انتہائی اکتھا میر تھا۔

”آپ نے فون کرنے کا کہا، میں نے کر لیا حالانکہ میرے لئے انتہائی مشکل مرحلہ تھا پھر بھی میں نے صرف اس لئے کیا تاکہ آپ اس غلطی کو معاف کر دیں۔“

”آپ غلط نہ رہی ہیں۔ میں آپ کو دھکا ہرگز نہیں رہا اور نہ ہی آپ کو بلیک میل کرتے ہوئے فون کرنے پہ مجبور کیا ہے۔ میں تو صرف اس سارے قصے کی وجہ جانتا چاہتا ہوں۔ بیٹا مجھے کافی عرصے سے جانتی ہے۔ مجھے اپنے بھائی کا درجہ بھی دیتی ہے۔ اس کا اور میرا جھلکے جھلکے مذاق کا رشتہ بھی بنتا ہے اگرچہ اس قسم کے بے ہودہ مذاق کا نہیں، پھر بھی..... مگر آپ نے کیا سوچ کر مجھے اپنے مذاق کا نشانہ بنایا، ایک انجان آدمی کو ٹھک کرنے کی غرض سے آدمی رات کو فون کرتے ہوئے آپ جھجکے نہ گھبرا ئیں اور اب یہ کیسے ایک مشکل مرحلہ ہو گیا، بتائیے؟“

”پہلی بات تو یہ کہ آپ شدید غلط فہمی کا شکار ہیں۔ آپ کو فون کرنے کے پیچھے نہ تو بیٹا کی شرارت کا ہاتھ ہے نہ ہی میرا کوئی مذاق کرنے کا ارادہ تھا۔ ہم دونوں نے آپ کو فون کی غلط مقصد کے تحت نہیں کیا تھا اس وقت میری نیت کچھ اور تھی، میرے دل میں کسی قسم کا غلط خیال نہ تھا۔ اس لئے آپ سے بات کرتے ہوئے سمجھتی نہیں اور اب صرف آپ کے مجبور کرنے پہ یہ قدم اٹھایا ہے تو ظاہر ہے کئی تو فیصل ہو رہی ہے۔ جب میں اکیلی نہیں تھی۔ میرے ساتھ بیٹھی تھی، ردا بھی، بیٹی اور فری بھی تھیں۔ ہم چھپ کر کوئی کام نہیں کر رہے تھے اور آج میں اپنے گھر والوں سے چھپ کر آپ کو فون کر رہی ہوں صرف اس ڈر سے کہ آپ ہماری بے ضروری حرکت کو غلط رنگ دے رہے ہیں اور کہیں اسی انداز میں سب کے سامنے پیش نہ کر دیں۔ آپ نامیں یا نہ نامیں لیکن آپ کا اسٹاک دھکمانے والا ہی تھا۔“ سادہ سے لہجے میں

اتنی سچائی تھی کہ مہران کو یقین کرتے ہی بنی۔

”مانا..... لیکن کیا آپ بتانا پسند کریں گی کہ آپ کے اور مینا کے دماغ میں کیا سلاہ تھا۔  
اصل حقیقت تو وہ اب بھی جاننا چاہتا تھا۔

”اس روز شاپک رکرتے ہوئے بیٹانے آپ کی سختی کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ مجھے سی حالات کے بعد بڑی کم عمری میں وفات پاگئی اور یہ بھی کہ چھ ماہ گزرنے کے بعد بھی آپ خود کو اس صدمے سے نکال نہیں پا رہے۔ اس نے بتایا تھا کہ راحت بھی مجھ پر خاصی کوشش کر رہے ہیں آپ کو زندگی کی طرف دوبارہ لانے کی لیکن آپ ہیں کہ جو کم لے بیٹھے ہیں۔“

خاصی صاف گوئی کے ساتھ اس نے بتایا۔

”اچھا تو جوگی ایسے ہوتے ہیں، ویل ڈریسڈ، کلیئیں شیو۔“

”اب مجھے کیا ہے، جیتانے تو یہی بتایا تھا پھر آپ کا رویہ بھی ایسا ہی تھا۔ درد کا گنا گنا سے جا رہے تھے۔ دوستوں کی عقل پار بار چھوڑ کر آپ تاریک گوشے ٹھانے پھرتے تھے۔ چپٹے لوٹے تو آپ کو میں نے دیکھا ہی نہیں۔ اس لئے یقین کر لیا اور گھر بھی بڑا افسوس بھی ہوا۔ دیکھیں ناں، جانے والے تو چلے جاتے ہیں، بس یاد رہ جاتی ہیں، ان کو دل میں تو بوسا جاسکتا ہے مگر دل بھلایا تو نہیں جاسکتا۔“ اس کی باتیں کھٹ سے بہران کے دل پر لگی تھیں۔

”واقعی دل یادوں سے کب بہلتا ہے بھلا یادیں ہیں بھی کتنی؟“ اس نے سوچا۔

”یادوں کے سہارے زندگی نہیں گزرتی۔“ وہ بولتی رہی۔

”ماشاء اللہ کس قلم کے ڈائلاگ ہیں۔“ اس کے دل جلا دینے والے ریمارک پہ وہ چڑھ گئی۔

”کیا مطلب؟ آپ کو ہفت روزہ ہے جس پر غلوں کا ہم سب نے تو حمل ہر روزی کی نیت سے بڑے غلوں کے ساتھ آپ کا ٹیم لگا کر تپا ہوا تھا۔ یہی سوچا تھا دو چار فون کا لڑکے رہیں آپ کی بریں واشک کریں گے، زندگی کی قدر کرنا کتنا سہل ہے اور زندگی سے محبت کرنا بھی۔“

”ہاں محبت..... محبت کرنا تو تم نے سکھای دیا۔“ اس نے دل ہی دل میں سرگوشی کی۔  
 ”بتائے، اب تو آپ کو یقین آگیا کہ کوئی اور حمانہ اور نہیں تھا۔“

”جیلس مان لیا لیکن آپ کیا سوچ کر مجھے سدا مارنے چلی تھیں۔ مینا کا مجھ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن آپ محض اس خوف لڑکی کا ہاتھ میں آکر اتنا بڑا قدم اٹھا نہیں۔ ایک دم بجان محض اس اعتبار کہ تاسرے بیوی تو ہے۔“

’بتائیے، اب تو آپ کو یقین آ گیا کہ نہ کوئی ادھیڑا مذاق نہیں تھا۔“

”پلیس مان لیا لیکن آپ کیا سوچ کر مجھے سدھارنے چلی تھیں۔ مینا کا مجھ سے کوئی تعلق جڑا ہے لیکن آپ محض اس خوف لڑکی کے باتوں میں آکر اتنا بد اہم اٹھا نہیں۔ ایک دم بجان فحش پہ اعتبار کرنا سراسر بیوقوفی ہے۔“

”لیکن میں نے بتایا تو ہے کہ میرا مقصد.....“ مہراں نے اس کی بات کاٹ دی۔

”ضروری نہیں کہ جو جیسا نظر آ رہا ہے وہی عیاں ہو اور یہ بھی ضروری نہیں کہ دوسرے کسی کے بارے میں جو اندازہ لگا کر آپ کو بتائیں وہ درست ہی ہو۔ ماہوار ایک بہت اچھی لڑکی تھی، بالکل ایسی جسے کوئی شخص اپنی بیوی کے روپ میں دیکھنا پسند کرے گا۔ ہماری عقلی مکمل طور پر راجح تھی۔ کوئی عشق و عاشقی کا پتہ کچھ نہیں تھا اور نہ ہی عقلی کے بعد کوئی ایسا سلسلہ چلا جیسا کہ آپ سمجھ رہی ہوں گی لیکن میں خوش تھا، مطمئن تھا اور مجھے ہونا بھی چاہئے تھا۔ ماہوار میں کوئی کئی نہ تھی اور مجھ دو میرے پورے گھر لانے کی مشترکہ پسند تھی۔ اس کی اچانک موت واقعی ایک سانحہ تھی، سب کے ساتھ ساتھ میرے لیے بھی۔ وہ ایسی لڑکی تھی، مصلحہ کا کردہ معتبر نہ تھی تب بھی یہ حادثہ میرے دل پر باثر ڈالا اور شاید جیتانے آپ کہ یہ نہیں بتایا کہ وہ میری ایک ننھی دھوری کا چارہ د بھائیوں کی چھوٹی اور چھٹی بہن تھی۔“

ان چاروں کا وجود مجھے مانو کہ بھلائے نہیں دیتا۔ ہمارے پورے گھر میں کھینچنے کی مار سے سو گوار چھائی ہوئی ہے۔ میں، میری امی جان اور اپنی جان کل کر سبھی گھر میں بیٹھے کہ کہیں ہماری بھابیوں کو یہ محسوس نہ ہو کہ ان کا دکھ ہمارا دکھ نہیں ہے۔ انہیں اپنی بھڑوں کی دل آزاری منظور نہیں اور میں..... تانس، میں کہنے بیٹھا ہوں، بول سکتا ہوں۔“

”واقعی؟ عجیب سی بات ہے یہ تو۔ آج کل ایسا ہوتا ہی کہاں ہے؟“ وہ مہران کی فیملی کے خلوص سے متاثر ہو گئی۔ ”ماس سسر اور بھوؤں کے حراج کا اس دور چرا حساس کریں؟ کتنا چھا لگ رہا ہے سننے میں آیا۔“ یقیناً آپ کے امی اور ابو بہت حساس دل کے مالک ہیں لیکن نہیں اپنی بھوؤں کا غم بانٹنا چاہتے نہ کہ انھیں ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہتے اور آپ ایسے کیوں بنے بکھر رہے ہیں۔ کیوں خود کو محرم مجرم سمجھوس کر رہے ہیں اپنی بھائیوں کے سامنے، خود بھی مسکرائیں اور انہیں بھی ان کی مسکراہٹ واپس لوٹائیں۔ اس میں ڈرنے جھبکے کی کیا بات۔“

وہ اس کے اسے سمجھ کر تجھے حیران ہوا تھا۔ یہ سب تو اس نے معطل کر دیا تھا ابھی نہیں تھا۔ واقعی وہ کل کے جیتا جا رہا تھا تو کسی مذکر کی بھائی کو سامنے دیکھ کے چورسا بن جاتا۔ اسے لگتا جیسے وہ دل ہی دل میں گلہ کر رہی ہو کہ ”میرا انٹی جلدی..... انٹی جلدی تم ہماری نور کو بھول گئے۔ انٹی جلدی۔“ اور اس کے لب کھڑکھڑاتے، دل پر چھا جاتا۔

”پچیس سال کے ساتھ کے بعد جب کسی کی بیوی مر جاتی ہے تو میں نے اکثر کو چند ہی  
نوں کے بعد دوسرا بیاہ رکھتے بھی دیکھا ہے اور کوئی انگلی تک نہیں اٹھاتا۔ آپ نہ جانے کیسی

عیت کے ہیں..... وہ نہ جانے تشریف کر رہی تھی یا طائر۔

”میں بس ایسا ہی ہوں، مجھے ہمیشہ اگلے کی فکر زیادہ ہوتی ہے۔ کوئی کیا سوچ رہا ہے، کیا سوچے گا، فلاں کو کیسا لگے گا، فلاں کیا محسوس کرے گا۔“

”فی الحال تو مجھے یہ فکر زیادہ ہورہی ہے کیونکہ فون کا خاص ہیلمی ہوئی ہے۔ ابھی کسی نہ کسی کام سے کوئی مجھے ڈھونڈتا آئے گا اور پہلا سوال یہی ہوگا کہ کسے فون کر رہی ہو۔“

”اور تمہارا جواب کیا ہوگا؟“ بڑے نا محسوس طریقے سے وہ آپ سے تم پر آگیا۔

”بس یہ دعا کیجئے کہ اس سوال کی نوبت ہی نہ آئے۔ بات چیمانے کی تھوڑی سی بددیانتی میں بھر بھی کرلوں گی مگر مجھے دھڑلے سے منہ پر جھوٹ بولنا نہیں آتا اور وہ بھی ان لوگوں سے جو مجھ پر خود سے بڑھ کے اعتماد کرتے ہیں۔ اس لئے خدا حافظ۔“ اس نے جواب سننے پہلے پیشتر ہی رسیور رکھ دیا لیکن اس کے آخری فقرے مہران کے آس پاس دیر تک گونجنے رہے۔

”تو مختصر خدا ترسی اور ہمدردی کے جذبے سے مغلوب ہو کر میری دیوانگی کا علاج کرنا چاہتی تھیں۔“ وہ دل میں خوب ہنسا۔ ”تم مجھے دیوانہ، عاشق اور جنوں ٹاپ کا بندہ سمجھ کر مجھ سے ہمدردی کر رہی تھیں! تم غلط تھیں، میں نہ تو جوگی تھا نہ ہی دیوداس۔ ہاں تم نے اب مجھے عاشق ضرور بتا دیا ہے اور وہ بھی اپنا۔“

☆=====☆

رات کو شادی کے موقع پر اس کی آنکھیں کل کی طرح اسے ہی تاشانی رہیں۔ بارات کے آنے کے بعد وہ اسے دیکھ پایا آف وہ ہائٹ کلر کے نیٹ کے کام دار سروس میں اپنی دیگر کزنز کے ساتھ کھڑی وہ بڑی کھوٹی کھوٹی سی محسوس ہوئی۔ ساری شوقی جیسے کوئی ایک دن میں لوٹ کر لے گیا تھا۔ شانے پائے بکھری ریشمی زلفیں چہرہ دونوں اطراف سے ڈھانپے ہوئے تھیں۔ اس نے پہلی بار اسے کھلے بالوں کے ساتھ دیکھا اور سراپے بغیر نہ رہ سکا تھا، بلاشبہ بے حد حسین اور راز انگیز سمجھے۔

تقریب کے دوران وہ ایک بار مہران کی نظر اس سے ملی تھی تو نہ جانے کیوں وہ رخ بدل گئی۔ اس کا گریز اور اہمیت مہران کی بے قراری اور سوا کر گیا۔

اگلے دن ولیدہ کی تقریب دوپہر کو تھی۔ وہ صبح سے ہی تہیہ کئے بیٹھا تھا کہ اس سے دو نوک بات کر کے رہے گا۔ بے شک وہ راحت کی فرست کزن بھی لیکن شادی کے بعد نہ جانے اس سے دوبارہ سامنا کب ہو سکے۔ اگلے رات بلے کے لئے اسے آج ہی کوئی ٹیکس نکالنی تھی۔

www.pdfbooksfree.pk

اس کا سامنا کرنے کے لئے اس نے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا۔

وہ جان گیا تھا کہ جب جب بھی وہ اسے ملی اور جتنی بار بھی ملی پہلے سے کہیں بڑھ کر دلکش اور منفرد محسوس ہوئی۔ ہر بار اس کا دیدار ایک نیا احساس دل پر ثبت کرتا تھا۔ پہلی بار میں ہی اس نے مہران کو چوکا دیا تھا، پچھلوں کے رکھ دیا تھا۔ ”نہ جانے صبح یا آج کیا غضب ڈھانے والا ہے۔“ وہ سر اٹھائے بال میں موجود سسکندوں لوگوں میں سے اس ایک کو ڈھونڈ رہا تھا۔ ولیدہ کی تقریب میرج ہال میں تھی۔

”ایکسکو ڈی۔“ پشت سے آئی مانوس آواز پر وہ چونک کے ہلکا۔ ایک نئے روپ میں بالکل جدا انداز میں وہ اس کے بالکل پیچھے کھڑی مگر کرنے کا راسات مانگ رہی تھی۔ مہران نے ایک نظر ہال میں بیٹھے لوگوں کی گھما گھمی اور مصروفیت پر ڈالی اور مزید جھیل کر کھڑا ہو گیا، کچھ یوں کہ اندر جانے کا راسات آدھے سے زیادہ بند ہو گیا۔ وہ شہنشاہی۔

ٹینگلوں کھڑائی کے مسلک کا جدید تراش کا ٹھکانا آواز اور شارٹ شرٹ کا سوٹ پہنے، آج وہ قدرے ماڈل کے ساتھ سامنے آئی تھی۔ چہلری اور ہیرا سنگل میں بھی جدید انداز نمایاں تھا۔ مہران نے اس کی خوبصورتی، اعتماد اور ذہانت کے بعد اس کی خوش ذوقی کا بھی اعتراف کر لیا۔

”ابن دن آپ نے میری بات سننے بغیر فون کیوں رکھ دیا؟“ اس نے پوچھا تو بغیر گھبرائے وہ کہنے لگی۔

”کیونکہ میری بات مکمل ہوئی تھی اور آپ کی بات سننے کی میں پابند نہ تھی۔“  
”وہل سید، لیکن اس وقت آپ کی ساری احتیاط پسندی اور دور اندیشی کہاں جاسوئی تھی جب ہمدردی کے بخار میں آدھی رات کو آپ ایک انجان شخص کو فون کر رہی تھیں۔“  
”آخر آپ بار بار ایسی بات کا حالہ کیوں دیتے جارہے ہیں۔“ وہ زچ ہو گئی۔ ”اب بس بھی کیجئے۔“

”اڈوبوں، میں نے ان لیا کہ آپ کی نیت صاف تھی۔ اب آپ بھی مان لیجئے کہ آپ کا طریقہ کار غلط تھا۔“

”چھاماں لیا۔“ وہ غلت سے بولی۔  
”جینا کے کان پکڑ کر اسے سر زلزل کرنے کا استحقاق رکھتا ہوں میں اور آپ..... کیا تم مجھے کوئی حق دو گی؟“ اس سے بات بن نہ سکی۔  
”کان پکڑنے کا؟“ حیرت سے اس کی بڑی بڑی آنکھیں اور کل گئیں۔



آتا۔ اسی ڈیپریشن میں یہاں تک چلا آیا۔ خود بہت تباہ تباہ مسموئوں کر رہا تھا۔ پتا چلا کہ مہطر  
آج تمہاری طرف آنے والی ہے تو سوچا کہ..... ورنہ یقین کر دیا ایسے ستے اوراد مجھے طریقوں  
سے ملاقاتیں کرنا نہ اسے پسند نہ تھے۔ اس نے ایک بار پھر اپنی اور اس کی پوزیشن  
صاف رکھنے کے لئے تھوڑی بہت غلط بیانی کے ساتھ کہا۔

”او چھوڑو یارا میں کیا جانتا نہیں۔ مجھے یقین ہے اپنے پار یہ اور بیٹو نے کیا کہا نیایار  
نہیں لگ سکتی۔ جہاں تک مضو کا تعلق ہے تو پھر بھی جی کے گھر کا ماحول خاصا دوستانہ سا ہے  
اور پھر وہ اگلی بیٹی ہے اس کی پسند وہ ستر کر ہی نہیں سکتے اور ایسی صورت میں جب اس کی  
پسند تیرے جیسا بندہ ہو۔ تیری سب سے بڑی سفارش تو خود ہے اور دوسری سفارش میں  
ہوں۔ پھر فکر کا ہے کی۔“

اور میرے گھر والے؟ ان سے غٹنا کیا کم مشکل ہے۔“ اس نے منہ لٹکا کر کہا۔ ”مجھے؟  
ایسا لگتا ہے، میں رٹا ہو گیا ہوں لیکن نہیں لوگ رٹو دوں کو بھی عقد جانی کا مشورہ دینے میں  
در نہیں لگاتے۔ میرے لئے تو لگتے ہے دنیا ہی ختم ہو گئی ہے۔ ابھی صرف امی جی سے بات کہ  
تو وہ سننے ہی ایسے گھبراہٹیں جیسے خدا نخواستہ میں کوئی جرم کر بیٹھا ہوں۔ شادی کے بارے میں  
سوچ کر۔ ابی جان سے بات کرنے سے انہوں نے صاف انکار کر دیا، ان کی ہچکچاہٹ پہ میں  
کھٹک سا گیا ہوں کو کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے، کہیں خدا نخواستہ ابی جان مجھے  
ماہ نور کے نام پر عمر بھر کنوارے بٹھائے رکھنے کا ارادہ تو نہیں کر بیٹھے۔“

”کیا کنوارا کر رہا ہے؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ میرے کہنے پہ ایک بار پھر خالہ جان سے  
بات کر کے دیکھ۔ تھوڑی دیر لگاؤ بازی اور اینٹنگ سے کام لے یار۔ ماڈل کو بلیک میل کر  
تو بہت آسان ہے۔“

”کوشش کرنا ہوتا لیکن ان میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ میری خاطر ابی جان سے ٹکر  
سکیں اور یہ ابی جان تو نہ جانے ان کے دل میں کیا ہے۔“ میران نے ایک بار پھر امی جان  
کا سہارا لینے کا ارادہ کیا۔

☆=====☆

”آپ بات شروع تو کریں۔“ وہ ایک بار پھر شفیعہ خاتون کے سر پہ وار تھا۔

”کیسے کروں..... کیا فائدہ؟ وہ گڑبڑ نہیں مائیں گے۔“

”کیوں نہیں مائیں گے۔ کیا ساری عمر مجھے کنوارا رکھنے کا ارادہ ہے۔ اس

اچھا تھا، مجھے ماہ نور کے ساتھ ہی ”سچی“ کر دیتے۔“

”کیا کر دیتے؟“ وہ زور نہ سمجھیں۔

”کھاؤ!“ وہ چلایا پھر امی کی آنکھوں میں حیرت اور غصے کے تاثرات دیکھ کر دھیمہ  
پڑا۔ شرمندگی بھی ہوئی کہ کس کا قصہ کہاں نکال رہا ہے۔

”سوری امی اوراصل میں..... آپ سمجھیں بائیل۔ ابی سے بات کرنے میں آخر کیا  
مضائقہ ہے۔ کم از کم ان کے دل کی بات تو باہر آئے گی۔ تو پتا چلے کہ آخر وہ چاہتے کیا  
ہیں۔“

”دیکھو بیٹا! تم جانتے تو ہو کہ برسوں سے ان کا یہی خواب رہا ہے تم لوگ اتنے اتنے  
سے تھے تب سے انہوں نے اس خواب کی کتاب تمام رکھی ہے ایک طویل عرصے سے جو  
ذہن ان کے سر پر سوار ہے، اسے ایک دم تو قیاس اتارا جاسکتا۔“

”یہ دھن تو تب ہی ختم ہو جاتی چاہے سچی امی جی جب ماہ نور.....“ اس نے لفظ بھر  
توقف کیا۔

”کوئی انسان تقدیر سے نہیں لڑ سکتا۔ ابی جان کو سب کچھ ان کے حسبِ مشاقت نہیں مل  
سکتا۔ ان کو یہ حقیقت تسلیم کر لینی چاہئے کہ طنائیں ان کے ہاتھ سے چھوٹ چکی ہیں۔ کچھ  
فیصلے زندگی خود اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے۔ ماہ نور کا جانا اور مہطر کا میری زندگی میں آنا بھی  
اس کا بڑا ثبوت ہے۔“

اس نے امی کو اپنی سے بات کرنے کے لئے راضی کر لی لیکن ان کے خدشے بھی بے  
بنیاد نہ تھے۔ شفیعہ خاتون خود کو ہر طرح کی دھماکہ خیز بات کے لئے ذہنی طور پر تیار کرنے کے  
باوجود بکا بکا رہ گئیں۔

”کیا بکواس ہے؟ میران کی ہمت بھی کیسے ہوئی کسی اور جگہ سو بنے کی۔ کیا وہ جانتا  
نہیں میں اپنی اولاد کے بارے میں کیا فیصلہ کر چکا ہوں اور امید تو مجھے تم سے بھی نہیں تھی شفیعہ  
خاتون کہ تم سب کچھ جانتے سمجھتے ہوئے بھی اس کا مقدمہ میرے سامنے پیش کرنے پہ چلی آؤ  
گی۔ کیا تمہاری نظر میں بھی میرے خوابوں کی کوئی وقعت نہیں ہے؟“ ان کے کڑک دار لہجے  
میں رقتہ رقتہ گلہ لال انہیں پشیمان کر گیا اور وہ خود کو غلط نہ مانتے ہوئے بھی سرزنش کرنے  
لگیں۔

”جاؤ جاؤ کہہ دو اس سے، چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر یہ عشق کا بخار اتر جانا چاہئے،  
ورنہ علاج کے لئے خود کچھ کرنا پڑے گا اور وہ اچھی طرح جانتا ہے، میرا طریقہ علاج کیا  
ہے۔“ انہوں نے الماری کے پیچھے کئی سالوں سے سنبھال کے رکھی بید کی چھڑی کی طرف

شفیقہ خاتون پہلی جہنی آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگیں۔ شہر کی حراج آشنا ہونے کی وجہ سے یہ مومس سا اندیشہ ان کو کئی دنوں سے ہلاتا رہا تھا۔ خواب صاحب کی اطمینان بھری خاموشی اسی طرف اشارہ کر رہی تھی لیکن پھر مدد سے وہ اپنے اس خیال کو جھٹلا دیتی تھی۔ ”نہیں نہیں خواب صاحب لاکھ ضدی اور جذباتی ہوں پھر بھی ایسا نامستول خیال ان کے دماغ میں نہیں آسکتا۔“ ان سے ہر طرح کی نامستولیت کی امید رکھنے کے باوجود وہ خوش گمان ہو جاتیں لیکن اب دونوں الفاظ میں اپنا فیصلہ خاتون نے خواب شریف نے ان کی ساری خوش گمانیوں کی ایسی کٹی تھیں کر کے رکھ دی تھی۔

”یہ..... یہ زیادتی ہے۔“ کمزور آواز میں انہوں نے احتجاج کرتا چاہا جسے خواب صاحب نے فوراً ہی دبا دیا۔

”دیکھی زیادتی؟ کیا غلط سوچ لیا میں نے۔ اپنے گھر کو گھر بتائے رکھنے کی خواہش رکھنا غلط کیسے ہو سکتا ہے؟ اپنی اولاد کو پیا رعبت سے اکتھے ہنسا ہنسا دیکھنا زیادتی کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ تو خدا کا کرم ہے، اس نے مجھے کسی امتحان میں نہیں ڈالا، ورنہ سوچو ماہ نور کے بعد اگر ماہ گل کا وجود نہ ہوتا تو میں کس قدر مشکل میں پڑ جاتا۔“

”کاش ایسا ہی ہوتا۔“ شفیقہ خاتون نے دل ہی دل میں سوچا۔ ”ماہ گل کے لئے ایسا سوچنے سے قبل آپ اسے غور سے دیکھ تو لیتے۔ بمشکل تیرہ چودہ سال کی ہوگی۔ براندہ نامیں لیکن آپ کی اپنی بڑی پوتی نثار تقریباً اس کی ہم عمر ہی ہے جسے آپ ابھی تک کا ندھے پہ اٹھائے پھرتے ہیں، اگر کل کو کوئی اس کے رشتے کے لئے آپ سے بات کرنے آجائے تو؟ اور وہ بھی کسی ایسے لڑکے کے لئے جو اس سے عمر میں دو گنا بڑا ہو تو آپ کو کیسا لگے گا؟“ ان کا گستاخانہ انداز خواب جی کو سخت ناگوار کر رہا۔

”تم آج بہت بڑھ چڑھ کے بول رہی ہو شفیقہ۔“ ان کے پاس آخری حربہ یہی تھا کہ وہ ڈانٹ کر انہیں چپ کرادیں اور ایسا ہی ہو، شفیقہ خاتون کہہ گئیں لیکن بد بردار کتا کہنے سے خود کو روک نہ پائیں۔

”آپ مجھے تو چپ کرادیں گے مگر آپ کے اس فیصلہ پر اور کون ہے جسے اعتراض نہ ہوگا۔ اتنا بے جواز سارشتہ ہے اور بے کجی۔ پھر مہران..... وہ تو ماہ گل کو اس حیثیت سے ہرگز قبول نہیں کرے گا خاص طور پر اب جب کہ وہ اس کو رنجیدگی سے پسند کرنے لگا ہے۔“

”اسے اپنی ہنڈ بٹنی ہوگی اور باقی سب کو بھی اپنے اپنے اعتراض نہیں پست رکھتے ہوں گے۔ اس گھر کی بچا کے لئے یہ اقدام اب اور زیادہ ضروری ہو گیا ہے۔ ظاہری بات ہے

اشارہ کرتے ہوئے کہا تو شفیقہ خاتون کا دل ایک بار پھر بے ایمان ہو گیا، ان کی ہمدردیاں دوبارہ بچے کی جانب متقل ہو گئیں۔

”کیسی باتیں کرتے ہیں آپ خواب جی! اچانک بچے کے ساتھ کیا کوئی ایسے فیصلہ آتا ہے۔ کیا الٹو کھاکام کر لیا ہے اس نے کون سا جرم کر بیٹھا ہے۔ اچھے گھر لے کر ایک سبھی ہوئی شریف بچی ہے، اس کے رشتے کے لئے ہمیں بھیجنا ہی تو چاہتا ہے۔ اس میں بری بات کون سی ہے۔“

”جب وہ جانتا ہے میں اپنی بہنوں میں پہلے منتخب کر چکا ہوں تو اسے ادھر ادھر نظر بھٹکانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ یہ وہ لیری تو دیکھو، منہ پھاڑ کے اپنے رشتے کی فرمائش بھی کرانی چاہی ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہوگا، اس گھر میں باہر سے کوئی لڑکی نہیں آئے گی۔ یہ میرا برسوں پرانا فیصلہ ہے۔ آج کل کس گھرانے میں اس خوش اسطولی سے چار چار بھائیوں کے کتنے اکتھے رہ رہے ہیں۔ آنے والی پانچویں بھو اگر ان چاروں میں سے نہیں ہوگی تو..... تو بتا بتا کر ڈالو! دل بھی ہو سکتا ہے بیگم.....! یہ بات اسے سمجھا دو۔ اس گھر کو گھر بنائے رکھنے کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے۔ اسے اپنی خند چھوڑنا ہوگی۔“

”آپ کی ہر بات درست، لیکن تقدیر سے کون لڑ سکتا ہے۔ سب دیا تو نہیں ہوتا جیسا ہم سوچیں۔“ بچے کا پڑھانا تازہ بہ تازہ سبق پڑھایا گیا۔ ”اب اگر ماہ نور نہیں رہی تو مہران کو اپنا گھر بسانے کا کوئی حق نہیں ہے کیا؟ جب جیتا پکا انسان پل بھر میں ختم ہو سکتا ہے تو خوابوں کی بساط ہی کیا ہے؟“

”واہ بیگم.....“ انہوں نے توصیفی اعزاز میں کہا۔ ”ساری عمر یہ حسرت رہی تھی کہ کبھی آپ کے منہ سے بھی چار سانی باتیں سن لیں لیکن کبھی کے روز بروز بڑھتے زرخوں، لان کے سٹوں کے کچے برگوں، مسالوں کے گھٹیا معیار اور ملازمین کی آنے والی دن کی چٹائی کے کدھر۔ رونے کے سوا آپ سے کبھی کچھ نہ سنا۔ ماشاء اللہ آج تو بڑی بد براندہ لکھنؤ ہو رہی ہے۔ حسین کے چھینے مارے مارتے چاکا کچا انہوں نے پیڑا بدلایا۔“ لیکن عقل مندی کی باتیں کرنے اور ذاتی عقل مند ہونے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ”اس ٹھہری انداز پر وہ غصے ہو گئے، واقعی یہ بڑی بڑی دلیلیں وہ کیسے دے سکتی تھیں بھلا..... بس جو مہران سے شائد وہ دیا۔“

”خواب بھی نہیں مارتے، انسان مارتے ہیں۔ میرا خواب ماہ نور نہیں تھی، وہ ہمیں دیا مگر میرا خواب سلامت ہے۔ اس خواب میں آخری رنگ اب ماہ گل بھرے گی۔“

اس کے قطعی لہجے پر حقیقت خاتون چپ کی چپ رہ گئیں یوں بھی ان کو چپ ہی رہنا تھا۔ اپنی بساط سے کہیں بڑھ کے وہ پہلے ہی بول چکی تھیں۔ البتہ باقی سب خوب بڑھ بڑھ کے بول رہے تھے۔ سب نے اپنا اپنا رد عمل الگ الگ انداز میں ظاہر کیا تھا لیکن سب سے عجیب و غریب رد عمل ماہ پارہ بھائی کا تھا۔

”ابی جان کو کم از کم اب تو اپنی اولاد کو اعتماد میں لے لینا چاہئے تھا۔ اتنے سال شادی کو ہو گئے، بال بچے بھی تم کے برابر آگئے لیکن ابھی ان بھائیوں کی حیثیت اپنے ابی کی نظر میں ننھے بچوں کی سی ہی ہے۔ اتنا بڑا فیصلہ چاہتے ہو گئی، مشورہ لینا تو دور کی بات، کسی نے ڈھک سے اعلان کر دیا تو انہیں کیا۔“

”بہنوں کی حیثیت تو تب ہے جب بیٹے خود اپنا مقام بنا پائیں۔“ حیرت انگیز طور پر مدہمیں بھائی نے ان کی تائید کی مگر نرزا جادوؤں مثلاً جنوٹا تھیں۔

”پلو پلو بھینچتے ہوئے نہ سہی اس حیثیت سے ہی رائے لے لینے کا ماہ محل کا ہم چاروں سے کتنا گہرا رشتہ ہے۔“

مہران نے خاصی ناگواری سے ان کا تبصرہ سنا اور مدد طلب نگاہوں سے لقمان اور عمران کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں لاشعلی کے ساتھ فالت کا کچھ دیکھنے میں مگن تھے۔

”ہاں تو اور کیا؟ آخر تک ہماری حیثیت تسلیم کی جائے گی۔ وہ مدداریاں بھانے میں سب برابر کے شریک لیکن اختیار کسی کے پاس بھی نہیں۔“ دونوں متفق ہو گئیں اور مہران مایوس ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”فیصلہ مناسب ہے یا نہ مناسب، اس سے کوئی غرض نہیں۔ بس یہ غم ستارہ ہے کہ انہیں لطف کیوں نہیں کرائی گئی۔“ یہ سب سوچتا وہ بڑی بھائی کے پاس چلا آیا، امید تھی کہ وہ اپنی سمجھ داری کی بدولت شاید اس کا مسئلہ حل کرنے میں کوئی مدد کر سکیں۔ وہ خدا کو ہوم ورک کر رہی تھیں۔ قریب ہی فرقان بیٹا کیلکولیٹر اور ریدک سنبھالے کسی حساب کتاب میں مصروف تھے۔ اس نے خدا کو بھانے سے چائے بنانے بھیجا اور اپنا دھکھارو لے لگا۔

”بھائی! آپ ہی بتائیے۔ ابی جان کی ضد جانتے ہے یا نا جانتے۔ میں مصطوف پندر کرنا ہوں لیکن اگر ایسا کچھ نہ ہو جاتا تو ان کا فیصلہ میرے لئے ناقابل قبول تب بھی تھا۔ کوئی تک بھی تو ہوگی بات کی۔“

بھائی کچھ کہنے جا ہی رہی تھیں کہ پہلے بھانے قلم ہاتھ سے رکھ کر بیان دیا۔

”ابی جان کو عادت ہے کہ جسے جو ملتا ہے۔“

اگر آخری بند باہر سے لاؤں گا تو وہ خود کو اوپر اٹھوس کرے گی۔ یہ چاروں مکی ایک طرف ہوں گی اور وہ الگ۔ مگر میں ڈھما ڈھما کھلے ہوں گے۔ میں مہران کی بہتری کے لئے یہ فیصلہ کر رہا ہوں۔ اسے اپنی زندگی میں سکون اور اس کا چاہئے تو میری بات مان لے۔“

☆=====☆

مہران کے لئے تو ابی جی کا یہ نیا چھم گن تھا ہی، باقی سب کے لئے بھی مگر متوقع تھا۔ سب ہی اپنی اپنی جگہ حیران تھے، آخر ابی جان کو یہ سوچیں کیسے۔ خواہ جی کی ہدایت کے پیش نظر مگر مہران میں یہ تجربہ پھیلانے کے بعد حقیقت خاتون یوں سرمدہ سرمدہ ہی تھیں جیسے اس نامعلوم فیصلے میں ان کا برابر کا ہاتھ ہو۔ مہران تو سن کر ہی بدک اٹھا تھا۔

”کمال کرتے ہیں ابی جان، یہ نت نئے تجربے کرنے کے شوق میں آخر کار وہ اپنی اولاد کا بیڑہ غرق کر کے چھوڑیں گے۔ انہیں بتائیے کہ ان کے بیٹوں اور ان کے پاتو جانوروں میں بہت فرق ہے، ان کی اولاد اور ان کی آگاہی سبزیوں کے تقاضے بالکل جدا ہیں۔ تجربے کرنے کے شوق وہ ان ہی پہ پورے کر لیا کریں۔“ بازو کو دودھ اور ملائی کے بجائے انہوں نے تاشے میں نیم تو س دینے کا تجربہ کیا۔ اسکوئی ڈوکو بڈیاں اور گوشت کھلانے کے بجائے سبزیاں کھلانے کی کوشش کی۔ ڈونا لڈو کئی کئی دن پانی سے دور رکھا۔

ان کے اس جدت آفریں تجربے بات کا کیا رد اثر رہا، ہانڈو لکھا اپنا تڑک کر دیا، اسکوئی ڈوا بھی بھلی برائے من فطرت بھلا کر ہر آنے جانے والے پر پکے لگا اور ڈونا لڈو لٹے پیچ پیچ کر مگر سر پر اٹھالیا۔ جب ان کے اٹلے سید سے تجربے بے زبان جانوروں نے قول نہیں کئے تو مجھ سے یہ توقع نہ رکھی جائے کہ میں ایسی نا بعداری کا مظاہرہ کروں گا۔ اگر بات صرف والدین کا حکم سامنے اور اپنی پسند کو ایت نہ دینے کی ہوتی تو پھر مجھی سوچا جاسکتا تھا لیکن۔

ماہ گل۔۔۔۔۔ آپ خود سوچیں۔۔۔۔۔ کوئی ذی ہوش آج کے زمانے میں ایسی بات سوچ سکتا ہے۔ اگر مصطوف میری زندگی میں نہ آئی ہوتی تب بھی یہ فیصلہ میرے لئے قطعی ناقابل قبول ہوتا۔ آپ ابی جان سے کہہ دیجئے کہ بھلے سے آپ میری خوشیوں کی پرواہ نہ کریں، مصطوف قبول نہیں کرتا تو نہ کیجئے، مجھے منظور ہے لیکن میں صرف ان کی بے گئی کی فرمائش پوری کرنے کی خاطر ایک معصوم بچی کی زندگی برباد نہیں کر سکتا۔

میں تو یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ میری چھوٹی بہنوں بھی ہے، خدا اور آدمی دیکھا دیکھی وہ مجھے چاچو کہہ کر پکارتی تھی اور میں نے اس میں اور انداز میں کوئی فرق نہیں سمجھا اور آج جاتی ہیں انداز میری کیا ہے؟ وہ میری بیٹی ہے۔“



بھائی کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ انہوں نے اپنی بات جاری رکھی۔

”اس بات سے انہیں کیا غرض کہ کیا جائز ہے کیا ناجائز، کسی کی حق تلفی ہو رہی ہے، کس کے ساتھ نا انصافی۔۔۔۔۔ اس کا برسوں پرانا خواب پورا ہونا چاہئے۔ ان کے ہاتھوں بیٹے ایک ہی چھت تلے رہنے چاہئیں۔۔۔۔۔ اب وہ کیسے رہتے ہیں۔۔۔۔۔ خوش یا پھر۔۔۔۔۔ خیر میں نے کہا نا اس سے انہیں کیا غرض۔ ان کی مرضی کے مطابق ان کے بیٹوں کی بیویاں بھی نہیں ہیں اور حسب امید خاصے سلوک سے رہ رہی ہیں۔ چلو ان کو بھینٹ تو سن پسند مل گئیں، بیٹوں کو بیویاں سن چاہی ملیں یا ملیں۔۔۔۔۔ بے حد جلتے ہوئے انداز میں کیا گیا یہ تبصرہ مدھقا بھائی کا پارہ چڑھا گیا۔

”بیٹوں کا نام کیوں لیتے ہیں، صرف اپنی بات کریں۔ اتنے سال گزر گئے شادی کو، ابھی تک بچپتا و افسوس ہونے کو نہیں آ رہا۔ بیوی کے سامنے جلتے دل کی بھاپ اڑانے کا کیا فائدہ، اتنے ہی ارمان چل رہے تھے سن چاہی کہن کے تو اس وقت کیوں نہ اپنی مرضی چلا لی۔“

”بھونہ۔۔۔۔۔ مرضی۔۔۔۔۔“ انہوں نے استہزاء سے بھرا لہجہ کہا۔ ”یہ تمہارے سامنے تو کھڑا ہے“ مرضی والا، کتنی سنی چاری ہے اس بے چارے کی؟ اور وہ تو وقت ہی اور تھا۔ اس زمانے میں تو ابی جان کے ”تھکے“ ہی اور تھے، ہم چارے کا حوصلہ نہ تھا۔۔۔۔۔ بس۔۔۔۔۔ برے چھینے۔“

”بس کیا کہئے، بچے بڑے ہو رہے ہیں۔۔۔۔۔ بچی کو ایک نظر دیکھ لیجئے۔ شاید ہوش آ جائے۔ ہر وقت بچی ذکر۔۔۔۔۔ بکری روئے۔۔۔۔۔ سن سن کر تنگ آ گئی ہوں میں تو۔“ بھائی نے ہاتھ میں پکڑی کا پیاں پیچے پچیس اور سخت عاجز آ کر کہا۔

”صرف سن سن کر ہی؟ میری ہمت کی داؤد دو، دیکھ کر تنگ آ گیا ہوں بے رونقی۔۔۔۔۔ بزرگی۔۔۔۔۔ اور بزرگ ہی بھی۔“ انہوں نے چھوٹے بھائی کی موجودگی کا لحاظ بھی نہ کیا اور انتہائی خراب الفاظ میں اپنی بے زاری ظاہر کی، جسے سن کر بھائی کے چہرے کا راسخا رنگ بھی اڑ گیا۔ اتنی تذلیل و برداشت نہ کر سکیں اور کمرے سے باہر نکل گئیں۔ مہراں خود بھی دنگ تھا دونوں کے حالات دیکھ کے۔

”بھائی کی بھائی بے بے زاری اور بزرگوں سے سب پہ عیاں تھا، یہ کوئی دھنکی جھپی بات تو نہیں تھی لیکن اس طرح بھیا کو کھل کر بولنے دیکھ کر وہ حیران تھا۔ (یہ تو ان کی عادت نہ تھی) وہ کچھ کھٹک سا گیا۔

”پلیز بھیا! کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں۔ بچے بڑے ہو رہے ہیں

اور کچھ دارمگی، ہر بات کا اثر لیتے ہیں۔ ہر وقت کی ٹوک جھوک مناسب نہیں۔ اس نے بھیا کی ابھی خاصی بڑبڑانی کو مروت میں ٹوک جھوک کا نام دیا۔ ”عمر کے اس دور میں آکر بردباری۔۔۔۔۔“

”کیسی عمر، کتنی عمر؟ اور میری عمر یا اس کی عمر؟“ بھیا بھڑک ہی تو اٹھے۔ ”میرا خیال تھا کہ تم پہ یہ وقت آن چڑا ہے، اس لئے کم از کم تم کو میرا ادھ جان پاؤ گے لیکن نہیں۔ سب کی نظر میں بس اپنا مسئلہ ہی اہم ہوتا ہے۔ دوسروں کے لئے بڑی آسانی سے مہر اور برداشت کے مشورے دے دیتے جاتے ہیں۔“

”میں اسٹینڈ لے چکا ہوں اور جو دور آپ گزار رہے ہیں۔ اس سے بچنے کی خاطر ہی یہ سب کر رہا ہوں۔ میری نظر میں یہ اہم نہیں کہ میرا کس پسند سامھی مجھے ملے۔ یہ بات زیادہ اہم ہے کہ کوئی اور سستی میری پائندہ بیگ کی سمجھت نہ چڑھے۔ اگر آپ میں ہمت نہیں تھی اپنی منوانے کی تو اس میں بھائی بے چاری کا کیا قصور۔ وہ خود تو زبردستی آپ کے سر پہ نہیں چڑھیں۔ اپنی بڑی اور کم ہمتی کی بجائے اس ان بے نکالے کا کیا کافدہ؟“

”بھڑا اس میں نکال رہا ہوں یا تم؟“ تیز تیز نہیں تمہیں بڑے بھائی سے بات کرنے کی؟ اپنی اوقات میں رہو۔ پہلے اپنا کس فتنہ لپھرائی اپنی جھپتی بھائی کی دکالت کرتے رہنا۔“ فرقان آئینے میں اپنی صورت دیکھنے ہی بدک گئے اور اسے کمرے سے چٹا کر دیا۔ دروازے کے باہر سرخ آنکھیں لئے بھیجی بڑی بھائی کو دیکھ کر وہ نظریں چراتا باہر نکل گیا۔

”مہر۔۔۔۔۔“

یہ انداز اور یہ آواز صرف چھوٹی بھائی کی تھی۔ وہ چپ چاپ آنکھیں موند لے لیا رہا۔

”مہر۔۔۔۔۔ کھانا نہیں کھاؤ گے؟“ وہ قریب چلی آئیں۔ ابھی چند منٹ پہلے اس نے رضی کے ذریعے کھانے سے صاف منع کرنے کا پیغام بھجوایا تھا لیکن وہ درہ نہ نکسے اور خود ہی چھینے چل آئیں۔

ہیش کی طرح وہ اس باہمی ان کے سامنے مجبور ہو گیا اور آنکھوں سے بازو ہٹا کر انہیں فحش سے بچنے لگے۔ طویل ناراضی کا سارا پرگرام جس جس نہس کر دیا تھا انہوں نے اپنے منہ سے بچے کے وارے۔

”رضی نے بتایا نہیں آپ کو۔“ وہ ردھار دھا سا بولا۔

”اور رضی نے یہ نہیں بتایا کہ میں نے تمہاری پسند کی سالہ بھری بیٹھی پکائی ہے اور قیر میں شملہ مرغ بھی تمہارے لئے ہی ڈالی ہے ورنہ اور سب تو آلو قیر ہی شوق سے کھاتے



”کہیں یہ سب میری وجہ سے تو نہیں ہوا مہراں؟“ وہ فکرمند ہو گئی تو اسے لب کھولے ہی پڑے۔

”او کم آن مٹھو۔“ لاڈ میں آکر وہ اسے اسی نام سے پکارتا۔ ”میرے اور ابی جان کے درمیان یہ سب چلتا ہی رہتا ہے۔ اب کوئی نہ کوئی تو گھر میں ایسا ہوتا چاہے جو آرمیت سے نکلے وہ نہ گھر والوں کی عادتیں حریف خراب ہو سکتی ہیں۔“ اس نے لائٹ سے انداز میں کہا لیکن معطر کی حس طبیعت اور بے چین ہوائی۔

”کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ اپنے والد کے بارے میں۔ ٹھیک ٹھیک بتائیں۔ کوئی زیادہ بد چیز تو نہیں کی ان سے۔“

”جیسا یار۔۔۔“

”مجھے یامرت پکارا۔“ اس نے ناگواری سے ٹوکا۔ ”ہاں اب آگے بتائیے۔“

”مختصر۔۔۔ بلکہ عزت مآب محترم معطر مہالوں صاحب! ناچنے نے اپنے والد بزرگوار سے کسی قسم کی کوئی گستاخی نہیں کی۔ بندہ صرف اقبال جرم کر بیٹھا ہے یعنی آپ کو پسند کرنے کا اظہار کیا ہے اور بس۔ ظاہری بات ہے جس گھر میں اولاد کا چوں کر نہ ہو ممکن ہو وہاں اگر کوئی سچوڑ باقاعدہ چاؤ چائے لگ جائے تو ایک دم جھکا تو لگتا ہے ناں برسر اقتدار شخصیت کو۔“

اس کے انداز میں ہنوز لا پر ادھی تھی۔ درحقیقت وہ دانستہ اس معاملے کی عینی ظاہر کرنا نہ چاہ رہا تھا۔

”کیا واقعی بات سیریس ہو گئی ہے۔“ مہراں کو اس کی آواز سے ہی لگ رہا تھا کہ اس کے چہرے پہ وہ انیاں اڑ رہی ہوں گی۔

”نہیں، سچی، ایسی خاص پریشانی والی بات نہیں۔ دراصل تم تو ہوا ہے پیرٹس کی اکلوتی صاحبزادی۔ تم نے یہ بھرے ہندے کنیوں والے مسائل کہاں دیکھے ہوں گے۔“ آج کیا کہے گا، جیسے روزمرہ کے مسئلہ پہ بھی ہمارے گھر میں دس دس آراء پھرتی ہیں اور یہ بات بھی خاص الحی ہے۔ جتنے لوگ ہیں اتنے ہی مشورے۔ خبر سے چار تو میری بھایاں ہیں، اسی جان کی پسند الگ اور ابی جان تو خبر میں ہی سب سے زیادہ دیکھتے ہیں۔“

”نہیں مہراں مجھے ذرا لگتا ہے۔ آپ پلیز ایسی کوئی کوشش مت کیجیے گا جس کے نتیجے میں اتنے لوگ آپ سے خفا ہو جائیں۔ جو آپ سے ناراض ہو کر بھجوری کی حالت میں مجھے قبول کریں گے، ان کے دل میں بھلا میرے لئے کتنی محبتیں ہوگی۔ میری حیثیت تو کمزور اور

بودی ہی رہے گی۔ مجھے نہ عزت ملے گی نہ محبت۔ نہ جانے کیا کیا بدواشت کرنا پڑے۔“ اس کے آنسو چمک پڑے۔

”بس کبھی تو ساری بات ہے۔“ وہ جھنجھلا گیا۔ ”نہ تم میری نیلی کو اچھی طرح جانتی ہو نہ ہی وہ جہیں۔ تم اپنے طور پہ اندازے لگا کر ناامید ہو رہی ہو مجھے اپنی پسند پہ غور ہے کہ جہیں کوئی رنجش کر ہی نہیں سکتا اس طرح اپنے گھر والوں پر بھی یقین ہے کہ وہ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کر ہی نہیں سکتے۔ ارے میرے ابی جان تو باقاعدہ سر پہ چڑھاتے ہیں بہوؤں کو۔“

”کوئی کھٹ پٹ، ہلرائی جھگڑا۔۔۔ کچھ نہیں ہوتا کبھی؟“ وہ جھس جھس، جواحد نیلی سلم کے تحت رہنے والے لمبے چوڑے خاندانوں کے درمیان جاری فسادات اکٹھنی راتی تھی۔

”اوں۔۔۔ ہاں ہوتے تو ہیں۔“ کچھ سوچ کر اس نے ایماندار سے جواب دیا۔

”بلکہ شاید ہر روز ہوتے ہیں لیکن دیے ہی جیسے بہت سارے لیکن بھائی اکٹھے رہتے ہوں تو گری سردی ہو جایا کرتی ہے لیکن بھائیوں میں یہ سب چلتا رہتا ہے۔ ہم دوٹھتے ہیں، جھگڑتے ہیں، ایک دوسرے کے لئے پریشان بھی ہوتے ہیں، سب چلتا ہے۔“

”ہاں سچی تو زندگی کا حسن ہے۔ گلے کھوے کہاں نہیں ہوتے۔ بس نہیں اتنا کام مسئلہ نہیں بنانا چاہئے اور آپ کی بھایاں۔۔۔ کیا وہ بھی اتنی ہی فراخ دل ہیں۔“

”دیکھی ہی ہیں جیسے ہم بھائی ہیں، فراخ دل یا تنگ دل اس کا مجھے پتا نہیں۔ ایک ہماری بھائی ہیں مہ لقا صاحبہ۔ تم نے اتنا کبوتری کا سن رکھا ہوگا۔ بس وہی کلف ان کی گردن میں بھی ہے اور کبھی اڑے جو انہیں نقصان پہنچا رہی ہے وہ درندہ ایک آئیڈیل قسم کی بہو، ماں، بہن اور بھائی ہیں جس بیوی ابھی نہیں بن پاریں اپنے شوہر کی نظر میں۔ عمر کا فرق اتنا زیادہ بھی نہیں اور نی زانہ تو یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں کسی عورت کے لئے کہ وہ اپنی عمر میں سے چند سال حذف کر کے اور زیادہ عمر کم دکھائی دے لیکن اس میں شاید ان کی اتنا آؤسے آتی ہے یا پھر گھر گھر کا بوجھ اور ذمہ داریاں تنہا بھانے کا شوق راہ میں رکاوٹ ہے۔ اتنے سارے کام ذمے لے رکھے ہیں کہ خود پہ توجہ دینے کا وقت ہی کہاں پچھا ہوگا ان کے پاس۔ اس لحاظ سے دیکھوں تو کبھی کبھار بسیا کی بجائے جیٹے لگتے لگتی ہے۔

دوسری بھائی مہ پارہ ہیں، اتمان بسیا کی بیوی۔ شیخ علی کا زانہ روپ کھلو۔ منسوبہ بخوالوان سے جتنے مرضی اور ان پہ پانی بھی پھر دلو۔ آرام کرنا اور کرتے رہنا ان کا محبوب مشغلہ ہے، جس طرح خیالی پلاؤ پکاتے ہیں ان کا کوئی جانی نہیں، اسی طرح ساری بھایاں

میں اولاد کے معاملے میں بھی وہ سب سے بڑھ کر خوشنمیش ہیں اور وہ ہارتو اپنا ریکارڈ بہتر بنانے کی غرض سے انہوں نے جڑواں شاہکار بھی پیش کئے۔“  
مصلح کی ہنسی سن کر مہران کو تسلی ہوئی، وہ یہ سارا غائبانہ تعارف اس کا دھیان مٹانے کی غرض سے ہی تو کر رہا تھا۔

”اور ہاں یاد رہے کہ نہ پارہ بھائی کا پارہ بہت جلدی اور بہت معمولی باتوں پہ ہائی ہو جاتا ہے اور دوسرے نمبر پہ ہیں بھائی مدہجیں۔ اپنے نام کے کچھ گن ان میں بھی پائے جاتے ہیں۔ کچھ اس کا ذرا اور کچھ یہ کہ سرجن صاحب کی اہلیہ ہیں۔ میرے ان بھیا کو خدا نے اب تک اولاد کی نعمت سے بھی محروم رکھا ہوا ہے اور ہاں ان والی بھائی کے لئے ایک احتیاطی تدبیر ذہن نشین کرلو۔ انہیں تنقید، چاہے وہ جائز ہی کیوں نہ ہو پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں نہ صرف وہ گھر کی خواتین میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہیں بلکہ خوش مزاج، خوش شکل، خوش لباس اور خوش ذوق بھی ہیں۔ ویسے سوچنے والی بات یہ ہے کہ اپنی ذات میں اتنے ”خوش“ جمع کر لینے کے بعد بھی نہ جانے کیوں وہ خوش نہیں رہتیں۔“

”اور لاسٹ نمبر والی بھائی؟“ مصلح کو بھی اس ذکر سے دلچسپی ہو گئی تھی۔

”ہاں..... وہ تو میری جگہری یار ہیں..... نہ تازہ بھائی..... یوں تو انہیں تازہ پرور بھر بازک مزاج وغیرہ ہوتا چاہئے تاہم انہوں نے اپنے نام کا اظہار اٹھایا۔ ان کی زندگی کا مقصد بس دوسروں کے تازخوں سے اٹھانا ہی ہے۔ جتنا جبران ادھر کی ادھر لگائے میں ماہر ہے، اتنا ہی یہ صلح کروانے میں، ماحول سازگار بنانے رکھنے میں پیش پیش۔“ وہ ہنسا، حالانکہ جبران بے کی ذات کے ازالے کی صورت میں یہ بھائی اس گھر میں سمجھی۔ ”وہ ہنسا، حالانکہ جبران بے چارہ کوئی اتنا بھی ماسی مصیبت نہیں تھا لیکن سب کچھ بتاتے بتاتے مہران اپنے بارے میں یہ انکشاف کرتا تو بھولی ہی گیا تھا کہ اس سے بڑھ کے مبالغہ آمیز کوئی اور نہیں۔

”تو میرے پیچھے پیچھے ہی لگا رہا کہ، کسی دن ایسے ہی جیروں تلے آکر پکلا جائے گا بد بخت۔“ ابلی جان کی شہد میں ڈوبی ڈوبی ڈانٹ دور سے ہی سنائی دے رہی تھی۔ ساتھ ہی ڈانٹوں کی منت بھری قہقہے قہقہے کبہ رہا ہوا۔

”سانوں دی تال اپنے لئے چل دے۔“

اسے ابلی جان کے دھامیں بائیں آگے پیچھے گھومنے کا بڑا شوق تھا لیکن اس کے اس شوق کی خاطر خواجہ صاحب کو پلٹے میں اتنی احتیاط کرنی پڑی کہ گویا کچھ بھرے راستے سے اینٹوں پہ پاؤں دھر دھر کرتے گزر رہے ہوں۔ اس وقت بھی پلٹے کے اسی اسٹاک کی وجہ سے اور ڈانٹوں کو

پڑنے والی جھانسن کر مہران پہلے سے عطا ہو گیا۔ اس نے مصلح کو الوداعی ٹکٹات کہے اور ریسیور رکھ کر بڑا سوئپ سا ہو کر جبر نامہ دیکھنے لگا۔ نیوز ریڈر اس وقت موسم کے حالات سنا رہا تھا۔

”یہ تم کیا لگا کر بیٹھے ہو جھوٹا پلندہ، وہ ذرا اشارہ پس تو لگاتا۔“ دونوں پاؤں اور کھینچ کر خواجہ طلیق الرحمان بڑی فرصت کے ساتھ صوفے پہ جم گئے۔ وہ جڑبڑ ہو کر رہ گیا۔ ESPN سے بیچ گئے والے تھا اور وہ باہر جانے کا پروگرام مکمل کرتے ہوئے صرف یہ بیچ دیکھنے کے لئے بیٹھا تھا۔ اب انہیں تھا کہ گھر میں صرف ایک ہی دی تھا۔ بہنیں اپنے جینز میں بھی بی بی کی لے کر آئی تھیں لیکن ایک گھر میں بیٹیاں دینے کا شیخ صاحب کو یہ فائدہ ہوا کہ ان کی سفید پوشی کا بڑی آسانی سے نہا ہو گیا تھا۔ مصلح اور مدہ پارہ کو ایک بی بی کی ملا تھا اور ایک بی بی واشنگ مشین۔ کافی عرصہ دونوں بیٹیں لکڑے دھوئی رہیں اب دونوں سالوں سے الگ الگ محل رہے تھے لیکن ایک ہی مشین استعمال ہوتی، ایک دن نہ لگاھا کہ لیتیں، دوسرے دن مدہ پارہ۔ یہی طریقہ بی بی دیکھنے کے لئے بھی رائج تھا۔

فرقان اور لقمان کو ملنے والے کروں کے آگے مختصر لالی قمی میں بی بی دی رکھ دیا۔ مدہ جہیں اور مدہ تازہ دونوں کو بھی ایک بی بی دی، ایک ہی فرنیچ اور ایک بی بی واشنگ مشین میں نشا دیا گیا۔ بیڈروم فرنیچر البتہ سب کو الگ ملے تھے۔ ان کے ذاتی استعمال کے فرنیچر کے علاوہ خواجہ صاحب نے حریہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ تو یوں بھی جینز کے خلاف تھے۔ ضرورت کا سب سامان گھر میں موجود تھا۔ بڑے لانڈج میں ان کا پٹائی دی رکھا ہوا تھا جو کہ ان کے اور مہران کے درمیان وجہ تنازعہ تھا۔ انہیں لمبی لمبی تھپوں تک ملنے والے ڈرامے بہت پسند تھے اور وہ پینٹل جیوگرگٹس، سپورٹس جینٹل یا پھر بھی کیمار HBO پر کوئی فلم دیکھنا پسند کرتا جو کہ ابلی جان کو سخت ناگوار گزرتا اب بھی مسلسل بڑا ہرے تھے۔

”ایک تو کیبل والے کو بول بول کر اشارہ پس کھلوا یا ہے، کم بخت رات کو چند گھنٹوں کے لئے لگاتا ہے ورنہ اس وقت گئے والے سارے ڈرامے سکون کے ساتھ دوپہر کو دیکھ لے کر دن بہتر ہارے ساتھ جج نہ کرنی پڑے۔“

”جب حکومت کی طرف سے بھارتی پھیلندہ دیکھنے پہ پابندی ہے تو کیا ضرورت تھی کیبل آپریٹر کو ورغلائے کی۔ یہ ایک قانونی جرم ہے۔ آپ کا کیا جائے گا کسی نے شکایت کر دی تو اس غریب کا لائسنس ضبط ہو جائے گا وہ بے چارہ کیا کرے، آپ چھپے کسمپرسیاں دے کر کہ یہ سب کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔“ اسے تو یوں بھی ان تھوڑے سے خارجی، بند ہونے پر

رامائن، سوتلی ماں کی سازشیں، بھائیوں کے آپس اختلافات، یہ تو حال ہے ان کی مذہبی کتابوں کا۔ صدیوں سے بھی چمکے کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ایک چمکتے تھے رہتا ہے اور ایک دوسرے کی جڑیں کاٹتا ہے۔ سبھی سمجھ ان ڈراموں میں ہوتا ہے۔ پورے گھرانے میں کوئی ایک فرد بے چارہ مارتا ہے، باقی سب اس پہ کمر کس کے کھڑے ہوتے ہیں۔

یہ جو آپ کا پند یہ میریل ہے جس کے انتقام میں آپ بیٹھے ہیں۔ سنی کی گدی دیرانیاں، جیٹانیاں آگے سے ان کی بھی بونیں، سنی گلیں اسٹری رسی ہیں لیکن ہر قسط میں کیا دکھاتے ہیں، سازشیں، چغلیاں، عناد، بغض وغیرہ وغیرہ اس سے تو بہتر تھا کہ یہ سب اگ رہتے، کم از کم گناہوں سے تو بچتے۔ اس سے منسلک لکچر دیا ابلی جان نے جوانی گھوری ڈالی۔

”برخوردار میں سب سمجھتا ہوں یہ سب کہنے سے تمہارا مقصد کیا ہے۔ تم بھی اپنی نسل کے دیگر لوگوں کی طرح زیڈ اے اینٹ کے سچا لگ بٹانے کے حق میں ہو۔ والدین کے حقوق سرے سے فراموش کر کے جوائنٹ فامیلی سسٹم کے خلاف مظاہرے کرتی ہے یہ نسل۔ سب دین سے دوری کا نتیجہ ہے۔“ یہ طعنہ وہ برداشت نہ کر سکا۔ مزید بحث سے احتراز کرتا ہوا وہ اٹھ کے اپنے کمرے میں جانے کو تھا کہ پھر سے جم گیا۔

”میں اور کسی کی بات نہیں کرتا لیکن کم از کم میں والدین کے حقوق سے بے بہرہ نہیں۔ حقوق العباد کی اسلام میں بڑی وضاحت ہے لیکن کہیں دیرانی کے حقوق، جیٹانی کے فرائض، دیور کے حقوق اور بہو کے فرائض نہیں بیان ہوئے بلکہ میرے ناقص علم کے مطابق تو اسلام میں مشترکہ خاندانی نظام کی گنجائش ہی نہیں۔ یہ وضاحت کردوں کہ میں والدین کے ساتھ رہنے کو مشترکہ خاندانی نظام نہیں سمجھتا، وہ تو خاندان کا ہی ایک حصہ ہیں بلکہ بنیاد، جب دو نئے بھائی یا دو سنی بیٹیں شادی کر کے گھر ساتے ہیں، اپنے اپنے گھر دوں کی بنیاد رکھتے ہیں، ان کے بال بچے ان کا خاندان ہوتے ہیں اور ہر شخص اپنے خاندان کی کفالت کا ذمہ دار ہے۔“

عمود انکل سعودیہ افکار وہ راہ رکھ آئے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ وہاں بیٹے کی شادی کرے ہی الگ کر دیا جاتا ہے۔ کیونکہ اسلام میں سر، جینہ دیور سب ناخرم ہیں اور عورت کو ان سے پردے کی ہدایت ہے اس کے ساتھ ساتھ گھر کی چار دیواری میں عورت کو پردے سے مشتاق قرار دیا گیا ہے، اس کا ایک مطلب؟ ظاہر ہے ایک شخص کا فرض ہے کہ وہ اپنی بیوی کو گھر میں سے الگ، دھوئی گھر مہیا کرے۔ سارے عرب ممالک میں بھی سنی سسٹم ہے۔ اہل سنی ساس بہو وغیرہ کا مسئلہ نہیں اٹھا۔“

سکون کا سانس لیا تھا۔  
”میری سمجھ سے باہر ہے صرف ان جھوٹو بندہ کرنے سے کیا حاصل؟ یہ فرنگی اور بہو کزن مسلمانوں کے خیر خواہ ہیں، ان کی اوٹ پٹانگ فلمیں تو بے شوق سے دیکھتے ہ انہوں نے اعتراض کیا۔

”ان کی فلمیں زیادہ تر قصورانی ہوتی ہیں جب کہ یہ ڈرامے سیدھا ہماری گھریلو زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان ڈراموں کے ذریعے وہ ہمارے فحش پر وار کر رہے ہیں۔“  
”خاک و وار کر رہے ہیں، میں تو کہتا ہوں سدا رہے ہیں۔ اپنے ڈرامے اٹھا کر، لو، اسٹارنگ، قتل و غارت، خاندانی دشمنیاں، جبر کے اور ان کے ڈرامے، سیدھی سادی گم کہانیاں، بڑوں کا ادب سکھا رہے ہیں، بل بل کر رہتا سکھا رہے ہیں، لگاؤ تم جلدی سے وہ بار بار مکرری دیکھ رہے تھے۔

”ابھی آپ کے پند یہ ڈرامے میں کافی وقت ہے۔ وہی ہے ناں“ کیونکہ ساس بھی ہتھی۔

”ادھر تم لگاؤ تو سہی اس سے پہلے وہ“ کہانی گھر گھر کی“ لگتا ہے۔“ ان کے بار کے اصرار پر زچ آتے ہوئے اس نے اپنا پند یہ چمک لگایا۔ دیکھ کر میں بے چارہ سا میں بیویں ایک ساتھی عورت فل میک آپ کے ساتھ بٹھائیں دوئی ہلا رہی تھی، اس اصرار اور دیکھا اور بیویوں سے چھپا کے رکھی نہ ہر کی شیشی کھانے میں اڑ رہی دی۔

”ہائے ہائے، کیسی، تھی، تیرا بیڑا ہی غرق۔“ اسی جان بھی افسوس سے ہاتھ آ بیٹھیں۔ انہیں ہر تینوں بے لاک تھیرا اور وہ بھی لائیو کرنے کی عادت تھی۔

اگلے سین میں بڑی بھالی کے کسی چڈ بائی سین کی داد دیتے ہوئے خواجہ صاحب جہانیاں لیتے مہراں کو مخاطب کیا۔

”کیوں؟ یہ بے راہ روی کھائی جارہی ہے؟ یہ بھارتی ڈرامے خاندانوں کو لڑا سکھا رہے ہیں، قربانیاں کا درس دے رہے ہیں۔“ وہ بہت بڑے فین تھے ان سیریلز کے اب بیٹے کو بھی متفق کرنا چاہ رہے تھے۔ ”میں یہ نہیں کہتا کہ ہندو معاشرہ ہم سے بہتر ہے جو بائیں نہیں اپنی پائیں، ہم سے سیکڑ کر دھنا چکے ہیں۔“

”جی نہیں، آپ کا تجربہ اتنا درست نہیں، الانام ان کا اثر لے رہے ہیں۔ یہ کلچر ہے وہی مہا بھارت والا اور رامائن والا۔ مہا بھارت میں کیا ہے، خاندانی چٹاٹوں فسادات سے بھری پڑی ہے، پاڈرو نے کیا کیا نہیں کیا اپنے ہی خون کے ساتھ

”دین ہم سب کا بے شک ایک ہی ہے لیکن کچھ اڑکچھ کا بھی تو ہوتا ہے۔ عربوں کی معاشرت.....“ خواجہ صاحب اس کے دل بیان کے باوجود ہار پانے پر تیار نہ تھے۔  
”دیکھا..... دیکھا..... بات معاشرت کی آہی گئی۔ یعنی آپ تسلیم کرتے ہیں کہ راہ بات کا تعلق مذہب سے نہیں معاشرہ سے ہے اور ہاں کچھ تو سب جانتے ہیں، ہندوؤں ساتھ صدیوں رہنے کے بعد ان کا کچھ ہم میں رچ بس گیا ہے۔ رہی سہی کسر سٹیلٹ پوری کر دی۔ جن زموں سے نسل نانا آئیں وہ بھی رائج ہو گئیں۔ میں تو ان ذرا مومن دکھائے جانے والے پھر اور رجحان کی باہل بھی حوصلہ افزائی نہیں کر سکتا۔ یہ انسان کو کھل چھینے اور ضمیر ہو کر جینے کے بجائے ایک دوسرے کے ساتھ زبردستی منسلک رہ کر جینا سکھار ہیں۔ لڑو، مرو، سب اکٹھے رہو۔“ اس نے بات مکمل کر کے اپنی جان کی طرف دیکھا، خدا تو حق وہ خاموش بیٹھے تھے۔ چہرے کی چمک ماعتھی اور نظر میں جھکی تھی۔

”شاید جوش جذبات میں آکر میں زیادہ ہی بول گیا۔“ اسے انہوں ہوا۔ سارا بھائیوں میں بس وہی ان کا سر چڑھا تھا اور کبھی بھار بٹھ و سہانے میں حد سے بڑھ چکی تھا۔ اب بھی اس کا مقصد انہیں چپ کرانا نہیں تھا نہ ہی وہ خامدانی سسٹم کا اس قدر مخالف تو بس یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ ان کی سوچ انتہا پسندانہ ہے، زور زبردستی کے ذریعے چاہے ہندوؤں میں بائبل کے اولاد کی مرضی اور خواہش کو کبھی پشت ڈال کر بنائے گھر بندے اتنے بابرکت نہیں ہوتے۔ بس زور بیاں میں کچھ زیادہ ہی شدت آگئی۔ خاتون نے بھی جینے کو ملاستی نظروں سے نوازا۔

”تو تم قلم کر رہا نہیں چاہتے، کھل کر جینا چاہتے ہو فیئر ہو کر..... ہم سب تو بدد ہیں۔ اسٹے رہ کے ایک دوسرے کی جڑیں کاٹ رہے ہیں۔ سادھی ماحول ہے“ کاہوں۔“ انہوں نے جلد ہی اپنی کیفیت پر قابو پایا اور گڑک دار لہجے میں بڑے استفسار کیا۔ اس کی ساری طراری ہوا ہوئی، الہی کے اس موڈ کے آگے اس کی ایک نہ چلتو بے چارہ گھٹھکیا نے لگا۔

”ابی جان..... ہم..... میرا مطلب یہ تو نہ تھا..... میں تو بس..... بس مثال د تھا..... جزل سی بات ہے۔“

”اپنی مثالیں سنہال کر رکھو۔ تمہاری تقریروں سے میرا ارادہ حیران نہیں ہوتا۔ میں نے جو سوچ رکھا ہے، خدا کے فضل سے ہو کر رہے گا۔ میں ماموں کی برسی کے انتظار کر رہا ہوں۔ یہ بات بڑھاؤں لیکن تمہارے ارادے سے نیک نہیں برزور دار۔ مجھے عملی

اٹھانا ہوگا..... جیم..... میرا کرنا شلوار کو نکالنا۔“ میں بیٹا دونوں گھبرا گئے۔  
”کیا کر رہے ہیں خواجہ جی، رات بہت ہو گئی ہے۔ ایسے وقت کسی کے گھر جانا اور وہ بھی اس مقصد سے..... کچھ نامناسب ہے۔“ امی جان نے بات بتائی۔ انہوں نے بھی وال گلاب پہ ایک نظر ڈالی اور غصے سے ہو کر بیٹھ گئے۔  
”ہاں یہ تو ہے لیکن کل صبح دس بجے مجھے ہر حال میں وہاں جانا ہے۔ فرحان کو بتا دینا، مجھے لیتا ہوا جائے۔“

☆=====☆=====☆

صبح مہران کی بے چینی اس کے ہر عمل سے ہوا تھی۔ سنا ز بھائی کی تسلی نفسی کے باوجود اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ کسی طرح اپنی کو اٹھانے کے گھر جانے سے روک دے۔ اوپر سے الہی کی تیار اور اس کی جان چلا رہی تھی۔ سفید و دھ کلف زدہ شلوار کے ساتھ بھجائی سیاہ چٹل اور تو اور کلائی میں دو گولڈن اسٹریپ والی گھڑی بھی باندھ رکھی تھی جو کہ تقریبات اور اہم مواقع کے لئے مخصوص تھی۔ انہیں ڈانگ جیڑ کھینٹ کر احتیاط سے گرتے کا دامن اٹھا کے بیٹھے دیکھا تو اس نے اپنی گھبراہٹ چھپانے کے لئے اخبار پھیلا کر چہرے کے آگے کر لیا لیکن شاید ان سے یہ انداز برداشت نہ ہوا۔ اخبار کی پشت پر ٹھک ٹھک ہوتے سن کر بادل غواستہ اپنے چہرے کے کثرت ٹھکانے پر لاتے ہوئے اس نے اخبار پھینچ لیا۔

”جی ابی!“ جی ابی! مکان پر خورداری لپو پیدا کرتے ہوئے جیسے ہی نظر اٹھائی، ڈونالڈ ڈانگ ٹھیل پر چڑھا اپنی چونچ سے اخبار پر دیکھیں دے رہا تھا۔ الہی کے آگے پر اٹھارہ تھی۔ ناز بھائی کی کسی چھوٹ گئی۔ انہوں نے اذیت کا تحقیر جابرہ چھوڑ کر ہوکھو گھورا۔

”تمہیں کیا ہوا؟“

”جج..... جی کچھ نہیں۔“

”اور تم۔“ اب سامنے چٹل سے بیٹھے جینے کو گھورا۔ ”تم کچھ کہہ رہے تھے؟“  
”نہیں..... میں تو کچھ بھی نہیں.....“ آئیں بائیں شاہین کرنا وہ ڈونالڈ کو کیڑہ توڑ نظروں سے گھورنے لگا، جس کی مداخلت بے جا نہ ہے یہ چوٹیشن پیدا کی تھی۔

”کیا کچھ نہیں..... ابھی ابھی تو تم نے مجھے پکارا۔“

”میں سمجھا تھا آپ نے مجھے پکارا ہے۔“ اس نے ہشکل بھانہ گھڑا، اب کیا بتاتا ہے خیاں میں وہ اسے جیسے کو.....

”سبحان اللہ، کیا عالم ہے خودی ہے، خبر میاں ہمیں بھی ہوش ٹھکانے لگنے آتے

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

”بھئی، صاف صاف الفاظ میں کہہ رہا ہوں کہ ماہ نور کی جگہ میں ماہ مغل کو دینا چاہتا ہوں یعنی اپنے چھوٹے بیٹے کے لئے اب بھی آپ ہی کے گھرانے کے آگے طلب گار

”کیا مطلب؟“ ٹیلی پہ موجود تینوں نفوس اس کے سادہ الفاظ کے پیچھے چھپے ہوئے کیم بھانپ کر بولے۔ ویسے بھی جبران سادہ بات تو کر ہی نہیں سکتا تھا۔

ہوں۔“

”یہ تو آپ کی محبت ہے خواجہ صاحب.....“ وہ متحوش تھے۔ ”لیکن دیکھیں جی، محبت اس قدر اندھی بھی کیوں ہونا چاہئے۔“

”جین؟ کیا مطلب؟“

”مطلب تو صاف ظاہر ہے۔ ایک تو مہراں بیٹے اور ماہگل کی عمر میں آدھو آدھ (دگنا) فرق اور دوسرا خود ماہگل کی عمر..... وہ تو ابھی ساتویں جماعت چڑھی ہے، گزریوں سے کھیلنے کی عمر ہے اس کی۔ شاید تو بہت دور کی بات ہے۔“

”ٹھٹھا..... کتنی دور کی؟“ وہ دھل سے پوچھنے لگے۔

”تقریباً آٹھ، دس سال تک۔“

”تو ٹھیک ہے، ہم انتظار کر لیں گے، آٹھ چھوڑیں بارہ سال تک کر لیں۔ اب تو آپ کا یہ اعتراض دور ہونا چاہئے کہ اس کی گزریوں سے کھیلنے کی عمر ہے۔ بارہ سال بعد تو یقیناً آپ اس کا یہ شوق چھڑ داسی کھلے ہوں گے۔“ بچے جھلکے انداز میں اپنی دانست میں انہوں نے بڑا نفیس مذاق فرمایا تھا لیکن شیخ صاحب کی سنجیدگی مجوز برقرار تھی۔

”آپ نے میرے دوسرے اعتراض پر غور نہیں کیا خواجہ صاحب۔ مہراں اور ماہگل کی عمروں کے درمیان موجود کئی سال..... یہ فرق بارہ سال بعد بھی جوں کا توں برقرار رہے گا۔ آج مہراں کے مقابلے میں ماہگل کا جوڑ ایک پچھلے نساخیل لگ رہا ہے تو کل ماہگل کے سامنے مہراں مٹھکے خیر لگے گا۔ دس سال بعد آپ کا بیٹا چالیس سال کا ہو رہا ہوگا۔ میرا اعتراض تو یہ بھی یہی ہوگا۔“

”یعنی..... آپ کو یہ رشتہ..... آپ انکار کر رہے ہیں۔“ بڑی بے یقینی سے کہتے ہوئے انہوں نے نکست خوردہ انداز میں پوچھا۔ کچھ میں شائستگی اور آنکھوں میں حسرت اتنی لمباں تھی کہ برم سے شیخ مذہب حسین بھی بچتے لگے۔ وہ خواجہ صاحب کی اس خواہش کے پس منظر سے بخوبی آگاہ تھے۔ پہلے سے ہی جانتے تھے کہ اپنے بیٹوں کے لئے ان کی بیٹیوں کا انتخاب کرنے کی وجہ کیا تھی لیکن یہ تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اپنی اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لئے وہ اس حد تک آگے چلے جائیں گے۔ ان کا مقصد نیک سہی لیکن یہ فیصلہ انتہا پسندانہ تھا۔

”میں معذرت کر رہا ہوں..... آپ سے اتنے برسوں کے تعلقات ہیں۔ اگرچہ آپ سے رشتہ بڑا نازک سا ہے، بیٹیوں کا سہولہ نہ وابستہ ہے آپ سے لیکن سالوں پرانی دوستی کے

ٹاٹے اتار کہنے کی ہمت کروں گا کہ ذرا جذبات سے باہر نکل کر حقیقت کی دنیا میں آئے دیکھیں۔ آپ نے کس قدر آرام سے کہہ دیا کہ کچھ تو کیا بارہ سال انتظار کر لیں گے۔ آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں خواجہ صاحب؟ یہ انتظار آپ کو نہیں کرنا، آپ کے بیٹے کو کرنا ہے۔ ہمیں شکر کرنا چاہئے۔ اس دور میں بھی ہماری اولادوں نے اپنے مستقبل کی ڈوریں ہمارے ہاتھوں میں تھما رکھی ہیں لیکن اس اختیار کا جائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہئے۔ نیک، تابعدار اولاد خدا کا عطیہ ہوتی ہے، کیا اس عطیے کو صرف اپنی ذاتی خواہشوں کی تکمیل کے لئے ضائع کر دینا چاہئے؟ اس بارے میں ضرور سوچئے۔“

وہ خواجہ صاحب پہ سوچ کے کئی دورا کر گئے، وہ مہراں کو اچھی طرح جانتے تھے اور ماہ گل سے اس کی انیت سے بھی واقف تھے۔ اس لئے صرف انکار پہ اکتفا نہ کیا بلکہ دوستی کا استحقاق استعمال کرتے ہوئے تھوڑی بہت کر دیکھی صاف کی، جو خواجہ طلیح الرحمان نے اپنی خود پسندی اور اختیار پسندی کے دغ میں اپنے دل دماغ پہ پھیلا رکھی تھی۔

☆=====☆

اگلے چند روز خاموشی سے گزرے۔ اگرچہ خواجہ طلیح الرحمان نے آنے کے بعد کوئی بات کی، نہ کسی نے کریدنا چاہا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ سب لاطم تھے۔ وہ جہاں سے ہو کر آئے تھے وہاں کی ”چارہ کھڑکیاں“ خواجہ ہاؤس میں کھتی تھیں جنہوں نے ایک ایک منظر سب کو دکھا دیا لیکن مصلحتاً سب خاموش رہے۔

مہراں کو جہاں اس سلسلے کے ختم ہونے کا احساس اطمینان بخش رہا تھا وہاں ابی کی خاموشی اور اضطراب خلش میں مبتلا کئے دے رہا تھا۔ فیض خانوں بھی بھوردی سے شوہر کو رکھ کے رہ جاتیں۔ سب چپ چاپ خنجر تھے کہ سب ان کے لیوں کا قفل ٹوٹنے۔ آخر تیسرے روز شام کی چائے پہ وہ باہر نکلے۔ مہراں بھائی جوان کے لئے فرے میں چائے اور پیٹی رکھ رہی تھیں، انہیں لان میں آتا کہ کچھ کر بحث پٹ فرے خالی کرنے لگیں۔ مہراں بھائی بھی اندرازی جان کو اطلاع دینے بھاگیں۔ وہ بھی ان کی آمد کا سننے ہی دلیفہ مختصر کرنے لگیں۔ ابی کے بیٹھے ہی سکونی ڈیوٹ کی رکھوا لی چھوڑ کر کپاریوں کے نزدیک آ بیٹھا اور انہیں دیکھ دیکھ کر ڈوم ہلانے لگا۔

باہر گزرنے بھی جست لگا کر ان کی گود میں براجمان ہو گیا۔ پورے تین روز بعد وہ کمرے سے نکلے تھے۔ چائے کے دوران ہی ابی بھی بیچ بڑھتی ان کے برابر بیٹھ گئیں اور سرہ جبین بھائی جو جھکن کی وجہ سے اکڑ جائے اپنے کمرے میں مگوا کر تیں، اپنا کپ ہاتھ میں



تھامے لان میں نکل آئیں۔ مہران ٹوٹتی نظروں سے انہیں دیکھنے لگا لیکن کوئی بھی اندازہ لگائے نہ آ سکتا تھا۔ ان کے چہرے پر ایک سہانہ سا تاثر تھا۔  
”دودو دودو!“ رضی ہنستا ہوا آیا اور پیچھے سے اپنے دادا کے گلے میں بائیں ڈال دیں۔

”دودو! کیا بیمار ہیں؟“

”نہیں بیٹا۔“ انہوں نے پوچھ کر کہا تھا چڑا۔

”تو پھر آپ دن رات آرام کیوں کرتے رہتے تھے۔ میں جب بھی آپ کے پاس جاتے لگتا تھا، بڑی ماما روک دیتی کہ دودو کی طبیعت ٹھیک نہیں۔“ وہ تانی کو بڑی ماما کہتا تھا۔  
”انہیں کیا پتا کہ آپ کے دودو کی طبیعت اچھی ہے یا بری۔“ آپ آجاتے میرے پاس۔  
آپ ہی تو میرے ڈاکٹر ہو۔“ انہوں نے نگاہوں کی چھٹی کرانی اور رضی کو گود میں بٹھالیا۔  
”اور میں نس۔“ آئینہ نے چھوٹا دھندلہ پندہ پر بٹھایا۔ وہ ابھی ابھی قاری صاحب سے پارہ پڑھ کے آ رہی تھی۔

بچوں کی ہلکی پھلکی باتوں نے وہ کروٹ لیا جو وہ سب کرنا چاہ رہے تھے مگر کر نہیں پا رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد خواجہ صاحب پہلے چپے موڈ میں آگئے اور سب نے اطمینان کی سانس لی لیکن پھر بھی کسی کو اندازہ نہ تھا کہ وہ اتنی جلدی پر ذکر چھیڑ دیں گے۔ اس نے اس وقت سب ہی دنگ سے رو گئے جب رات کے کھانے پر سرسری سے انداز میں انہوں نے بڑی بہو کو مخاطب کر کے پوچھا۔

”مسلماً! چھوٹے سے پوچھو، کون ہے وہ لڑکی، کس خاندان سے ہے، ذات برادری، اتا پتا سب کچھ۔۔۔۔۔“

”ابی۔۔۔۔۔“ کچھ توقف کے بعد مہران نے ٹھکھار کر کہنے کی ہمت کی۔

”ابی۔۔۔۔۔ وہ راحہ کی کزن ہے۔“

”راحہ۔۔۔۔۔ کون راحہ؟“

”جی وہ راحہ، اسی کے گھر میں پہلی بار۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے، وہ جیس دیکھا تھا میں نے اسے۔“

”بہت خوب۔“ خواجہ صاحب کا چہرہ ہنسنے لگا۔ ”مجھے معلوم نہ تھا، آپ اتنے دل پھینک ہیں۔ پہلے محترمہ راحہ سے راہ و رسم بڑھائی پھر ان کی کزن پر فدا ہو گئے۔ میں پوچھتا ہوں اس بے چارہ کی کیا ہوگا، کیا گزرے گی اس بد نصیب پہ جسے چھوڑ کر اب تم اس کی کزن

پہنچو ہو گئے ہو۔“

”کون ہے چاری، کون بد نصیب؟“ وہ ہونٹ تھا۔

”وہی راحہ، جو اس سے پہلے تمہاری منظر پر نظر تھی۔“

”لا حول ولا۔۔۔۔۔“ اس کا جی مکدر ہو گیا۔ ”راحہ میرا پرانا دوست ہے اب! انکی بار یہاں آیا ہے بلکہ اس کی بہن کی شادی کی دعوت دینے پوری فیملی بھی آئی تھی۔ اسی آپ کو تو یاد ہے ناں؟“

”ہاں ہاں، بڑی بھلی خاتون ہیں۔“

”ان ہی کی بھانجی ہے معطر۔“

”معطر۔۔۔۔۔ واہ بڑا امیرکا مہکا سا رتو تازہ سا نام ہے۔“ چھوٹی بھالی نام پہ ہی خوش ہو گئیں۔

”اب رتو تازہ ہو یا باہی، کیا فرق پڑتا ہے۔ چلو میاں! تم نے جو تھیں مان رکھی تھیں، پوری ہوئیں۔“ خڑکے اٹھ کے چڑھاوے چڑھا دینا شکرانے کے۔ میری مرضی نہ تو ماما تو سچی نہ ہی ماما گل، میں تو صرف یہ کڑی خون کے رشتوں سے جوڑنا چاہتا تھا لیکن بھب نہیں ہوسکا تو پھر معطر آئے یا چلتے، ایک ہی بات ہے۔“ بڑی نے یاز کی کے ساتھ انہوں نے مہران پہ جتا دیا کہ وہ بادل غماز اس کو پسند کرنا چاہتے ہیں۔ تیار ہو رہے ہیں۔ اس نے بھی ابلی کا یہ احسان تجھ جان سے اسے اپنے سر لے لیا۔

☆=====☆=====☆

اس سے اگلا مرحلہ بغیر کسی بد محرکی کے طے ہو گیا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ آنا قانا طے ہو گیا۔ شفیقہ خاتون راحہ کی والدہ کے توسط سے ان ہی کی ہمراہی میں یہ رشتہ لے کر گئی تھیں، اس نے رواجی تکلفات کا دور نہ چلا، بلکہ کے سامنے نے ضمانت دی اور بغیر کسی پس و پیش کے سیرجہا میں جعفر نے یہ رشتہ قبول کر لیا۔ اب تک خواجہ طلیق الرحمان کے کسی روئے سے نہ لگ رہا تھا کہ وہ اس رشتے پر دل و جان سے راضی ہیں۔ مہران ان کے چہرے پہ حقیقی مسرت تلاش نہای رہا لیکن وہاں فقط اندیشہ تھے۔ ہراسا تھا۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس نے خود کو تسلی دی۔ معطر پہ پورا بھروسہ تھا کہ وہ جلد ہی ابلی کو اس خود ساختہ خوف سے آزاد کر دے گی۔ اسے آئے دن اپنے وقت کا انتظار تھا۔ وقت جو خوب ثابت کر دے گا لیکن اس سے پہلے جبران نے ثابت کر دیا کہ۔۔۔۔۔  
ہوایوں کہ ابلی تو اسے فرقان کی سرگرمیوں پہ نظر رکھنے کا کہہ کر خود بھول بھال گئے بلکہ

تازہ رونما ہونے والے واقعات نے یہ بات ان کے ذہن سے یکسر مٹا ڈالی۔ دیگر افراد بھی اس سرسری سے ذکر کو یاد نہ رکھ پائے، یوں بھی جبران کی تو عادت تھی ادھر سے ادھر کی پھیلانا..... لیکن اب..... اب اس نے جس وثوق سے یہ دھماکا کیا اس نے سب ہی کو ہلا کر رکھ دیا، ویسے بھی وہ لاکھ لگتی ہو..... اتنی بڑی بات بے پڑے کے تو نہیں اڑا سکتا تھا۔ سب کو یقین تھا کہ اگر جبران نے مفروضات کا پہاڑ کھڑا بھی کیا ہوگا تو کہیں نہ کہیں تہہ میں رانی ضرور ہوگی اور اس ذرے کی جبین ہی اتنی شہی قحی کہ سب بے یقین ہو گئے۔ سب سے بری حالت بڑی بھالی کی تھی، وہ بلے بڑی کی ملی کی طرح شوہر کے انتظار میں پھر نے لگیں ان کی بچہنی ہوئی مضمین، لچکاتے لیوں، شرابی کی نگاہوں سے سب کو اندازہ ہو رہا تھا کہ آج بڑے بھیا کی کیا درگت بنے گی اور ان سے بھی بڑھ کے تھلا رہے تھے خواجہ صاحب۔ مہران بھی باقی سب کی طرح حیرت زدہ تو تھا لیکن دم بخود نہیں کیونکہ نہ جانے کیوں..... بھیا کی کسی ادا پہ وہ پیلے ہی کلک سا کیا تھا۔

بھالی سے انہیں لاقطع دیکھنا تو معمول کی بات تھی لیکن اب سب کھلا بے زاری کا اظہار یہ اعلان بہت پہلے کر گیا تھا کہ اب ان کی نظروں میں کوئی اور چٹنے لگا ہے۔

”بڑے بھیا قصور میں سرینہ فیکٹری کی سپر وائزر فریڈم قبول عرف فیری میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ مومنہ بیوہ مشہور ہیں۔ یہ ایک بات کہ چھپیں ستائیس سال سے اوپر نہیں لگتی اور رنگ ڈھنگ سولہ سترہ سال دانی دو تیرہ اداں کے ہیں۔ ایک معمولی سی پوسٹ پہ چھ ہزار تنخواہ کے ساتھ ٹھٹھا باندھ دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں جو اس بات کا اشارہ ہے کہ بھیا بھیا کی طرح ہی کچھ اور قدردان خاصا نواز رہے ہیں محترمہ فیری کی۔ ہفتے میں دو یا چار ایک چکر تو ضرور ہی لگتا ہے بھیا کا قصور میں۔“

یہ انکشاف کر دینے کے بعد وہ ایک طرف بیٹھا گڈیاں چوستے لگا۔ مدجیں بھالی شانے پہ بیک لٹکاے جانے کو تیار تھیں، اب ٹانگ پہ ٹانگ چڑھا کر صوفے پہ براجمان ہو گئیں، مد پادہ بھالی بھی اپنے اسٹوڈنٹس کو چھ کا پہاڑ ہارنے کے لئے دے کے انک سمیت ہی آکر ان کے برابر کھٹیں۔ دونوں نے پہلی فرصت میں فون کر کے اپنے اپنے میاؤں کو بھی بلوایا تھا تا کہ اس قدر اہل قمر سے محروم نہ رہیں۔

مد تازہ ساف سے اپنے کھنڈر سے مزاج شوہر کو نکلے لگیں جسے صورت حال کی سنگینی کا احساس تھا نہ معاملے کی نزاکت کا۔ اگر یہ بات سچ تھی تو بھی اب اسے یوں سرعام بھاڑا بیوڑنے کے بجائے صرف اہل کو مطلع کرنا چاہتے تھا، وہ خود ہی اپنے ڈھنگ سے اسے نسا

لیتے۔ اس طرح بات کھل جانے کا خوف بھی اگر بڑے بھیا کے سر سے اتر گیا تو وہ مزید دلیر ہو جائیں گے۔

لقمان اور عمران تقریباً آگے پیچھے کھیں داخل ہوئے۔ دونوں کو اصل قصہ سننے کی بے تابی تھی اور دونوں کی مشترکہ تسلی و تسکین نے پارہ بھالی نے بعد شوق احسن طریقے سے کرائی۔ ابھی وہ مکمل تفصیلات سے فیض یاب ہو ہی رہے تھے کہ بڑے بھیا کی آمد ہوئی۔ سب الرٹ ہو کے بیٹھ گئے، بڑی بھالی کے متحرک قدم رک گئے۔ اہلی نے بھی مونچھوں کو تاد دینے کا مشغل ترک کیا۔ فقط اہلی جان تھیں جن کی سرگرمی کو کوئی فرق نہ پڑا۔ وہ حسب معمول چپ چاپ تسبیح کے دانے گرانے جاری تھیں، اب اور زیادہ خشوع و خضوع سے دانے گرانے لگے۔ ہال کے سانے میں پچھلے برآمدہ سے آئی آدھ درجن بچوں کی آواز بیک گراؤ ڈھکڑا کام دے رہی تھی۔

چھوٹی بارہ

چھوٹا تھارہ

ٹائی کی ٹانٹ ڈھلی کرتے بھیا کا پہلا قدم جیسے ہی اندر پڑا، تمام اہل خانہ کو ایک ہی تاثرات تھانے دیکھ کر قسم سگیا۔

”السلام..... علیکم.....“ اٹھے ہوئے سے انداز میں سلام کرتے انہوں نے پھر سے نظروں نظروں میں سب کو جانچا۔

”اوہو..... میں تو بھول ہی گیا، آج اپنے مہرو کی تاریخ رکھنے جانا تھا..... سچ

سچ..... آپ سب شاید میرے ہی انتظار میں بیٹھے ہیں۔ بس دن منٹ اور..... میں شانور لے کر پہنچ کر لیتا ہوں۔ واقعی بہت دیر ہو گئی لیکن آپ سب بھی تو کمال کرتے ہیں، مصروفیت میں میرے ذہن سے یہ بات کھل گئی تھی تو آپ میرے موبائل پہ رنگ کر لیتے۔“

بڑی جگت کے ساتھ کہتے وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھتے گئے کہ ابی کی سرور آواز نے ان کے قدم اور اعصاب دونوں جھمک کر دیئے۔

”صاحبزادے! اچھا بات تو یہ کہ مہرو کے دن رکھے آج نہیں اتوار کو جانا ہے اور دوسری بات یہ کہ جب تم ملی فریڈ کے ساتھ ہوتے ہو تو اپنا موبائل بند رکھتے ہو، ایسے میں اگر تمہارا باپ بھی مرنے جاتے تو تمہیں اس کی اطلاع نہ ہو سکتے گی اور ہوئی بھی نہیں چاہئے، ہفتے بھر کی چھٹائی کے بعد تم جو جتنوں کے ساتھ، بیوی کی دفاؤں کا مذاق اڑاتے ہوئے، جوان ہوتی اولاد کے سامنے ڈھٹائی دکھاتے ہوئے اور بوڑھے باپ کی آنکھوں میں دھول جھونکتے

آتے ہیں وہ بھی سینے میں ایک دن، نئی نئی ڈیٹنگوں کا میرا کام ہے آپ کا نہیں۔“ اب جوابی کارروائی کے طور پر جبران نے یاد دہانی کرائی کہ آؤٹ آف آفیشن ڈیٹنگوں کا ذمہ دار نہیں ہے ان کا نہیں۔

”چھانٹیک ہے۔ میں مانتا ہوں۔ میں بزنس کے سلسلے میں نہیں گیا تھا لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ضرور کسی عورت کا ہی پتہ ہوگا۔ میرا بڑا اچھا دوست ہے وہاں۔ اس کے ساتھ دن گزارا ہے۔ آخر جیتنے بھری ٹینشن کے بعد کچھ ریلیکس کرنا میرا بھی حق ہے۔“ یہ ان کا اگلا بیان تھا۔

”تو اتنا چھپ چھپ کر ریلیکس کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“ ابی گرے۔

”اور میں پوچھتی ہوں، بیوی بچے اور عمر بڑا اگھر ہوتے ہوئے باہر کسی غیر کے پاس دن گزارنے میں کیا آرام ملتا ہے انہیں؟“ سب بہانے ہیں، جھوٹ ہے۔“ بھابی سرے سے کسی ”عروا نہ دوست“ کے وجود سے انکار ہی نہیں۔

”جب کسی کو گھر میں آرام نہ ملے، سکون میر نہ آئے تب ہی وہ باہر کی خاک چھانٹتا ہے۔“ آہستہ آہستہ بھیا کھلنے لگے۔

”کیوں صاحبزادے انھیں کیا دفتر ہے آنے کے بعد بچے کھانا نہ پڑتے ہیں، بیوی کے پیروا نہ پڑتے ہیں، آٹا گوشت نہ پڑتا ہے، جھازوں کا ہوتا ہے یا جھڑیگ دم دینی ہوتی ہے۔“ ابی نے جواب طعنی کی۔

”ان محترمہ کا بس چلے تو یہ سب بھی کروائیں مجھ سے۔ آپ نے بیوی نہیں بیٹے ماسٹرنی میرے سر پہ بٹھا رکھی ہے ابی۔ میں تنگ آ گیا ہوں اس کی زیر ہدایت زندگی گزارا کر کے۔ یہ مجھ سے بڑی ہے، مانتا ہوں، لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہر وقت ہی اپنا بڑا بن ثابت کرنے پٹی رہے۔ میں نے ہزار بار اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ بیوی ہو بیوی بن کے رہو، اماں مت بھولیں اس نے ہمیشہ میری بات کبھی کی طرح اڑا دی، اب بھگتے۔ اسے اماں جیتنے کا شوق ہے، اپنا شوق پورا کرتی رہے۔ مجھے بیوی کی ضرورت ہے۔ میں.....“ طیش میں کھلنے کھلنے وہ سب کچھ کہہ گئے۔ ہوش آیا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ انکی دیر سے جو بولے بہانے گھڑے جارہے تھے۔ سب مت کے بل گر گئے۔

”تو..... کیا آپ نے..... آپ نے دوسری شادی کر لی؟“ بھابی مدد سے سے سفید پڑ چکی۔ ابی بھی پہلے خوب گرج چمک رہے تھے لیکن اب بیٹے کی ڈھنائی کے مظاہرے پہ ڈھیلے پڑ گئے۔

ہوئے اس سے ملے جاتے ہو، کسی کا حق کدو تہمارا غلط میں مغل دے سکے۔“

خواب فرقان ایک جھگڑے کے ساتھ چلتا جا چکے تھے لیکن چھوٹے بھائیوں اور بھادج کی موجودگی میں بھید کھل جانے کی قیامت نے انہیں منہ پھیرے رکھے پر مجبور کیا۔ ان کا کٹر یا کٹر اپنا پشیمان سا انداز دیکھ کے مرلاقا ڈھے گئیں۔ نہ جانے کیوں اس قدر طیش کے عالم میں بھی انہیں امید تھی کہ وہ اس الزام پر بھڑک اٹھیں گے، جبران کو ڈانٹ ڈپٹ کر یہ کہلوائیں گے وہ مذاق کر رہا تھا اور یہ امید تو شاید سب ہی کے دلوں میں قبی جی جی بھیا کا خاموش اعتراف سب کو مل دے گیا۔

”مجھے تجھ سے یہ امید نہ تھی فرقان..... تو تو..... تو تو میرا سب سے سیدھا سادہ بیٹا بچہ تھا۔“ ابی جان چمک کے رد دیں۔ بھابی کے آنسوؤں کو بھی راول گئی۔ ساس کے شانے پہ سر ٹکا کر وہ کھٹکے لگیں۔ بچے آواز میں سن کر پریشان ہی شکلیں لئے اس طرف آگئے۔

”کیا ہوا بڑی ای..... ماما..... آپ دونوں کیوں روری ہیں۔“ غدا چھپے گی لیکن بھابی ہر چیز سے بے خبر تھیں۔

”ہائے..... میں مجبور سے میں ہی ماری گئی۔ مجھے کیا پتا تھا فرقان آپ اس عمر میں مجھے یہ غم دکھائیں گے۔“

نذا اور ناز نے دیکھنے کے سے انداز میں باپ کو دیکھنے لگے جو پہلے ہی بیٹی کی آواز پہ تڑپ کے نزدیک آ گیا تھا اور اب قہقہے لگا ہوں سے سب کو دیکھ رہا تھا۔ مہناز بھابی بچوں کا ہاتھ تھام کے اوپر اپنے کمرے میں لے گئیں۔

بچوں کے منہ سے غائب ہوتے ہی فرقان بھیا کی شرمندگی بھی دھیرے دھیرے دیکھنے لگی اور ابی کی لعنت ملامت کے جواب میں جلی جلی سر کی مسواک ہوتی گئی۔ سب ہی حیرت اور آنسوؤں کے ساتھ ان کی بڑی دلیلیں سن رہے تھے، جو ہر دو منٹ کے بعد اپنا رنگ بدل رہی تھیں۔

”آپ سب کو شدید غلط فہمی ہو رہی ہے بلکہ..... یہ سب فساد اس غیبت کا پھیلا یا ہوا ہے۔“ جبران کی طرف غوغا اور نظروں سے گھورتے ہوئے انہوں نے پہلا وضاحتی بیان دیا تھا۔ ”میں تو فیکٹری کے کام سے تصور کیا تھا، کسی فیبری شیری کو میں ہرگز نہیں جانتا۔“ جواب ابی نے تصور کی اس فیکٹری کو ہرگز نہ جاننے کا اعلان کیا جہاں سے ہو کر وہ آرہے تھے۔ (بقول ان کے)

”اوہو آپ کیا جانتے ہیں بھلا، کئی سال سے برائے نام چند گھنٹوں کے لئے آفس



”جی میں سمجھی نہیں۔“

تمہارا شوہر اندر کرے میں اکیلا بیٹھا ہوتا ہے۔ تم بھاگے، چھپو، گھبراؤ، تمہارا شوہر ہوتا ہے۔ وہ دفتر سے تھکا ہارا آتا ہے، تم مشین پر دھڑا دھڑا بہن کے کپڑے سینے جا رہی ہو۔ وہ خود کو بلو، اپنی ذات پر فوجہ دو۔ کام کی زیادتی نے تمہارے چہرے کی روشنی چاہ کر دی ہے۔ اپنی بہنوں کی طرف ہی دیکھو۔ وہ۔ یہ پارہ چار چار بچے پھر کی بنائے رکھتے ہے، انہیں سکول بھیجنے کے بعد مدرسے سے گھنٹوں سوئی رہتی ہے، دودھ جوں جی پیتے ہے۔ وہ آدھی ڈاکٹر کی کیسے پٹاپ سے رہتی ہے اور چھوٹی بہو، تمہاری طرح ابھی کام کا ہوا ہے لیکن خود سے لاپرواہ نہیں رہتی۔“

انہی کی ساری ہدایتیں مرا لقا بھائی نے بڑے دھیان سے سنیں اور ان پر عمل کرنے کا مہم ارادہ بھی کر لیا۔ اس سے پہلے بھی اکثر کوئی نیکوئی نہیں اس بات کا احساس دلاتا رہتا تھا لیکن وہ ہمیشہ ایک کان سے کن کر دوسرے سے اڑا دیتیں۔ اس بار سنجیدگی سے غور کیا بخیر کر ہی ایسی کئی تھی کہ وہ جتنا طے ہو گئیں۔

☆=====☆=====☆

”وسی.....وسی پُتر۔“

خواجہ صاحب آوازیں دیتے اندر آئے۔ ڈونالڈ صاحب عادت ان کے پیروں کے آگے بچھتے پھدک رہا تھا۔

”یہ نمک پارے اور گلے لے جا کر اپنی جتنی کو دے آؤ، شام کی جانے کے لئے۔ وہ وہیں کھن میں ہوگی۔ جانے کا وقت ہو چلا۔“ ٹھڑی پہ وقت دیکھتے وہ شفیقہ خاتون کے برابر آ بیٹھے۔ ان کی روٹی روٹی آنکھیں دیکھ کر کھٹکے۔

”مہ جیہیں چچی تو چکن میں نہیں، میں لفافے رکھ آیا ہوں۔“ وہ اطلاع دے کر بھاگنے لگا۔

”ارے تو جاؤ، ذرا دروازہ کھٹکھاؤ، چہ بجنے کو ہیں، کب ملے گی جائے۔“

”میں؟ میں دو؟“ وہ سہم کر اپنے کمرے کے بند دروازے کو دیکھنے لگا۔ خواجہ صاحب کی سمجھ میں اس کا تردد نہ آیا۔

”دھی!“ بند دروازے کے پیچھے سے مہ پارہ کی غضب ناک آواز آئی اور وہ تیر کی لڑخ اپنے کمرے میں گھس گیا۔

”کس قدر نامعقول بچہ ہے۔ میں نے کہا چچی کو جگاؤ، اپنے کمرے میں بھاگ گیا۔“

”بچہ بے چارہ کیا کرے۔ ماں کا حکم نہیں ہے چچی کے کمرے کی طرف رخ کرنے کا۔ میں خود مہجس کو آواز دیتی ہوں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ”خیر نکلے والی تو وہ بھی نہیں۔ خود ہی لپکتی ہوں جائے۔“

”کیا ہوا ہے؟ میں پوچھتا ہوں۔ ہوا کیا ہے؟ یہ حد بندیاں..... یہ کمرہ بندیاں..... یہ سب کیا ہے؟“ وہ سخت متوجش تھے۔

”نیا معرکہ.....خواجہ صاحب! تبدیلیاں تو آپ پہلے ایک ہفتے سے دیکھ ہی رہے  
ہیں گے۔ یہ کیا پلٹ ہے، کیا پلٹ۔“

”تہذیبیاں؟“ سوچ میں پڑ گئے۔ مرقا سے منگو کے اگلے دو تہذیبی تو نظر آتا  
 دیکھ ہوگی جس کی تمہیں انہوں نے فوس لہرایا۔ ظاہر ہے، اتنے سال یہ گمراہ عورت کے ہاتھ  
 لے رہا تھا، سارا انتظام، سارا نظام۔ کچھ وقت تو لگے گا باقی سب کو اپنے حصے کی ذمہ داری  
 اٹھانے میں۔

صبح کا آغاز ہی ملاقات کو تحریک کر دیتا ہے کہ ذمہ داری ان کی تھی۔ سب کو نرفارم دیا  
 کہ پکے پسینہ کا نشہ کرنا۔ بچوں کے سکول کے لئے بچے باکس تیار کرنا، دو دھاپا ل کر کھانا ہانپنا  
 ڈھیروں برتن خود دھونا کہ برتن دھونے والی ماسی میں ایک ہار آتی تھی یعنی صبح  
 سے رات کے برتن ہوتے یا دوپہر کو استعمال ہونے والے بڑے برتن دیکھیے، دو گئے

وغیرہ۔ وہ ناشتہ سے پہلے آتی اور ملتا بھائی کی نفاست پسند طبیعت کو گوارہ نہ تھا کہ ناشتے کے برتنوں کا ڈیمرا اگلے چوبیس گھنٹوں تک کھیاں بھسکا تا رہے، وہ سہ پہر کو کچن میں آکر دوپہر کے برتنوں میں سے بھی لگاس پائیں وغیرہ دھو جاتیں۔

دوپہر کے کھانے کی ذمہ داری مد پارہ بھائی کی تھی۔ وہ بس باغی میں چھپا ہلکا نام کر لیتیں کیونکہ سبزی وغیرہ کاٹ کر کچی کدھو کر بھائی تیار کر چھوڑتی تھیں کہ بچوں کو سکول بھیجنے کے بعد مد پارہ بھائی اپنی نیند ضرور پوری کرتی تھیں۔ گیارہ بجے بستر چھوڑنے کے بعد چائے ناشتے سے فارغ ہو کر جب وہ ساڑھے بارہ بجے کچن کو رونق بخشتیں تو ان کے پاس صرف آدھ گھنٹہ ہوتا تھا کیونکہ ادراوی دونوں ایک سوا ایک بجے کھانا کھا لیتے تھے۔ اگر بڑی بھائی پہلے کچن کا چکر نہ لگا چکی ہوتیں تو انہیں پتہ چلا کہ آدھ گھنٹے میں اتنا ڈیمرا کھانا کیسے تیار ہوتا ہے۔

ملاو، پٹنی، فرنج میں تیار پڑی ہوتی۔ پیاز کٹی ہوئی، بسن چھلا ہوا اور ادراک پسلی ہوئی پیالیوں میں رکھی ہوتی۔ سبزی بھی بنانے کے بعد دھو کر الگ تیلے میں بھگوئی ہوتی۔ اگر کوئی یا کباب بنے ہوں تو قے میں پہلے سے مسالے کس کر دیے جاتے کبھی کھارو گوشت مسالے سمیت گر میں چڑھا دیا جاتا۔ آنا گوند ہار کھا ہوتا۔ یوں بڑی آسانی کے ساتھ وہ آدھ گھنٹے میں اس معرے کو سر کر لیتیں۔

سہ پہر کی چائے مد جنیں بھائی کے ذمے تھی۔ وہ تقریباً اس ٹائم گھر آئیں، اس لئے خالی چائے ہی بنانے کا ٹائم مل پاتا، چائے کے ساتھ جو دوسرے لوازمات پیش ہوتے، وہ عموماً ملتا بھائی یا مد ناز کی کارگر اسی ہوتی۔ آج کل چونکہ ملتانے شوہر کے آنے کے بعد کچن کے پھیرے لگانا بند کر دیے تھے اس لئے دو ایک دن مد ناز ہی مد جنیں کا ساتھ دیتی رہی لیکن اس کی طبیعت کی گرانی کے سبب پچھلے چند روز سے خواجہ صاحب بازار سے کچھ نہ کچھ لے آتے۔ مد ناز ایک بار پھر ناں بننے کے سر طے سے گزردی تھی۔

رات کے کھانے کی ڈیوٹی بھی اسی کی تھی جسے وہ آج بھی پہلے کی طرح بد حسن دخولی ادا کرتی تھی۔ رات کے کھانے کا ہتھام بھی زیادہ ہوتا کیونکہ تمام افراد موجود ہوتے۔ چچا تیاں ڈالنے کی ذمہ داری مد جنیں کی تھی جسے سردیوں میں تو وہ ادرا کر لیتیں لیکن گرمیوں میں اکثر بازار سے آن آتے جسے سب چپ چاپ کھا لیتے۔ ہاں ابلی اور امی جان کے لئے وہ تین پھلکے گھسے پتا لیتیں۔

اب جب سے ملتا بھائی نے اضافی ذمہ داریوں سے ہاتھ کھینچا، سارا انتظام درہم برہم

ہو گیا۔ ناشتے کی میز پر ہی وہ پڑھ لکھ جیتی کرتی۔ یہ بھی۔ بھائی کا تو بس نہ چلنا تھا کہ نوالے بنانا کراپنے سرتاج کے منہ میں ڈالیں۔ اب سرتاج تو خوشی سے پھولے نہیں سارے ہوتے آئی تو بد اور محبت پا کر لیکن باقی سب کے منہ پھولے ہوتے۔ لقمان کو نرالی اظہ پسند نہ آتا۔

”افوہ مد پارہ! ساری زردی چکی ہے، اٹھا ڈالے۔ میرا تو جی مٹلا رہا ہے۔ تمہیں پتا ہے کہ میں قل فرانی اٹھ نہ کھاتا ہوں۔“

اب مد پارہ کے فرشتوں کو بھی کیا خبر کہ ان کے میاں قل فرانی کھاتے ہیں یا باف فرانی۔ اتنے سالوں سے وہ یہ وقت جمائیاں لے لے کر اخبار پڑھتے گزار رہی تھیں۔ یہ بھی ان کی نہایت کردہ جاگ جاتی تھیں اور بچوں اور میاں کی تیاری میں مدد بھی کر دیتی تھیں۔ ناشتے کے وقت تو بس ان کا کام یہ ہوتا کہ اخبار پتی کے ذریعے وقت کچھ آگے کھسکاتیں۔ بچوں کو سکول جانے اور لقمان کے آفس جانے کا انتظار ہوتا تا کہ باقی ماندہ نیند پوری کی جائے۔ مد جنیں بھی اس وقت اپنی تیاری میں لگن ہوتیں انہیں عمران کے ساتھ ہی لگنا ہوتا تھا۔ ایسے میں خود پوچھو توبہ لے یا شوہر کا ناشتہ کرائے۔

”یہ بلا اٹھ! اور چائے کا کپ؟ میں یہ کھا کر باطل چاؤں گا۔ بھائی نے مجھے پرائے اور آلیٹ کی عادت ڈال دی ہے، اب مجھ سے یہ بلا ناشتہ کھا کر نہیں گزرا رہا جاتا۔“

”کمال ہے۔ ڈاکٹر ہو کر آپ نہیں جانتے کہ آگلی اور بیوی بیک فاسٹ کتنا نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ آلیٹ میں تو ذیابیط بھی اٹھ کے ساتھ پڑھیں برن ہو جاتے ہیں۔ بواں ایک ہی اصل غذا ہے۔“ وہ دلیل دیتیں۔

حالانکہ اصل وجہ یہ کہ کل والے پرائے بنانے اور آلیٹ کے لئے پیاز کاٹنے میں اتنا وقت لگنا کہ وہ ڈھنک سے تیار نہ ہو پاتیں۔ جس وقت مد ناز بھلو کے لئے اٹھ رہا ہوتا، یہ چپکے سے کھولتے پانی میں دو اور اٹھ بے ڈال دیتیں۔ چائے تو تیار ہی جاتی تھی۔

ہیش کی طرح بارہ بجے کے بعد کچن کارخ کرنے والی مد پارہ چلتی جب سارا کچن منہ کھولے ان کا منتظر ہوتا۔ ملتا بھائی بھی فرقان ہسٹا کے جانے کے بعد امی، بیویں کا پھیلادوا سینیٹیں۔ اٹھو کے چھلکے، بریڈ کا پھرا، چائے کے نشانات، پیاز کے چھلکے وغیرہ وغیرہ۔ پتھروں کا ڈیمرو گھونے کے بعد وہ اپنے کمرے کا رخ کرتیں۔ اب مد پارہ کوائف سے یہ تک کھانے کی ساری تیاری خود کرنا پڑتی۔

صفائی والی ماسی سے اپنی عمرانی میں کام کروانا مد ناز کی ڈیوٹی تھی۔ اس لئے وہ بھی مصروف ہوتی پھر مگھی مد پارہ کہہ کھولا کر بردستی اس سے مدو لے لی کر تیں اور دو مارے

مروت کے کر بھی دیتی لیکن بھر صفائی اس کی مرضی کے مطابق نہ ہو پاتی، اس لئے اس نے بھی معذرت کر لی۔

یوں جنت و دکن دون بعد یہ نوبت آگئی کہ دو پہر کے کھانے پہ نہ سلا دھوتا نہ رائیہ۔ اکثر و بیشتر روٹی بازار سے منگوائی جاتی یہ کہہ کر کہ آنا گوندھنے کا نام نہیں ملا۔ کل رات کے بچے ہوئے سنان اور وال کے ساتھ آلیٹ بنا دیا گیا تھا اور پرسوں ڈھیلی کی کچھڑی بنا کر بنیر کی چٹنی اور سنان کے سجادی لگی۔

ماس سر کے ناک بھوس چڑھانے کی قطعاً پرواہ نہ کرتے ہوئے وہ دو پہر کو پکا بھیکا لٹا لینے کی افادیت گنوا نہ لگیں۔ انہوں نے بھی نظر انداز کرتے ہوئے بادل خواستہ کچھڑی کے لمٹوے کو قلعے سے اتارا۔ خواجہ صاحب یہ رعایت صرف اس لئے دے رہے تھے کہ رفتہ رفتہ سب کی روٹین سیٹ ہو جانے لگی۔ سر پہ پڑے تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ یہ سوچ کر وہ قصد اپنی منجھلی بھڑوں کی لاپرواہی اور سستی سے سمجھو نہ کرتے رہے۔ چھوٹی بھڑی حد درجہ مروت سے بھی واقف تھے اس لئے اسے سختی سے تنبیہ کر دی کہ وہ اپنی بڑی آپا کی سیٹ سنبھالنے کی ہرگز کوشش نہ کرے۔

دھان پان سی نہ تازہ دوسری بار امید سے تھی اور کنوڑی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ وہ سہ پہر کو باہر نظر اور شام کی چائے کے لوازمات لے آتے تھیں۔ جہیں سے تو اس قسم کی امید رکھنا محنت تھا اور وہ جانتے تھے کہ نہ تازہ گھر والوں کی زبان کا چٹکا پورا کرنے کے لئے خود کچن میں جا گھسے گی جب کہ رات کے کھانے کی تیاری بدستور اس کے ذمے تھی۔ منجھلی بار اس کی حالت کے پیش نظر اس کی بڑی آپا نے یہ ڈیوٹی اپنے سر لے لی تھی لیکن اس بار وہ کسی اور ہی مشن میں سرگم رہی تھیں۔

شانوں سے ذرا نیچے آتی ایک سی پنڈیا اب اسٹیپ کننگ کی صورت میں چہرے کے کئی سال کم کر رہی تھی۔ کبھی کبھار مہندی سر پہ خوب لیتی تھیں اب ڈارک براؤن ڈائی بالوں کی چمک ہی اور تھی۔ میک آپ سے سدا بے نیاز رہنے والے چہرے پہ گھوڑی لب اسٹیک، بلیک مسکارا اور پیش آن لگا ہوتا لباس پر بھی توجہ ہوتی۔ پہلے پائیں انہیں ذرا سی جھجک محسوس ہوتی۔

”سب کیا سوچیں گے؟“

”سارے باتیں نہ بنائے لگ جائیں۔“

لیکن پھر انہوں نے سر جھٹک کر اس شرم و جھجک کو پرے دھکیلا۔

”کون سارے؟ کون لوگ؟ یہ سب غیر تھوڑے ہی ہیں۔ یہ میری صرف دیوانیاں ہی تو نہیں، میری ماں جاناں ہیں۔ میرا اتنا احترام کرتی ہیں۔ یہ بھلا کیسے میرا مذاق اڑا سکتی ہیں۔ سب تو یہی چاہتے ہیں کہ میری گزشتہ سلامت رہے اور میری اپنی ترجیح کیا ہوئی چاہئے؟ ظاہر ہے میرا شوہر۔ نہیں..... بہت عرصہ میں نے دوسروں کو اذیت اور ترجیح دے دے کر اپنا معاملہ خراب کیا ہے۔ اب یہ غلطی نہیں دہرائی۔ مجھے ان سب سے بھی محبت ہے، سب کا خیال ہے لیکن خرقان کے جذبات کا احترام سب سے پہلے۔ ابھی ایک ہی تو کہتے ہیں میں نادانی میں ان کا حق رانی رہی۔ سب کا دل جیتنے کی دھن میں شوہر کے دل سے اتنی رہی۔“

انہوں نے اس دل تک جانے والے ہر راستے پر اپنا جال بچھنا شروع کر دیا اور خرقان کوئی نفعاً آوارہ، دل پیچیک یا عیاش شخص تو نہیں تھے، یونہی ذرا سا نظرا انداز ہو جانے کی وجہ سے بھٹکنے لگے تھے، اب بیوی کی بھرپور توجہ نہ پرچے مگر سرے باہر کے تمام رستے ہی بھولنے لگے۔ یہ احساس ہی کتنا خوش کن ہوتا ہے کہ کوئی آپ کے لئے صرف آپ کے لئے خود کو سرتا پابدل رہا ہے۔ وہ جان گئے تھے کہ مدلتا میں دن بدن زور دھما ہونے والی خوش آئندہ تبدیلیاں صرف ان کے لئے ہیں ورنہ خود وہ کہاں اپنی ذات کے لئے اسے جتن کرنے والی ہیں۔

یوں مہاں کو راضی کر کے کرتے سب کی چھٹی بڑی بھالی اور بڑی آیا، لاڈلی بیٹیوں کو ناراض کرتی گئیں۔ یہ ناراضی پچھلے دو چار دنوں سے بڑی واضح صورت اختیار کر رہی تھی۔

اب جو شفیق خاتون نے خواجہ غلیظ الرحمن کی توجہ پر تہہ پیلوں کی طرف دلائی تو ان کا دھیان اسی تہہ پیل کی طرف گیا۔ نہ جہیں پہ غلیظیں مستقل ہو گئی تھیں اور نہ پارہ کا پارہ ہر وقت سوا سیز سے پر رہنے لگا تھا لیکن وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ حالات اتنے خراب ہو سکتے ہیں کہ ایک اپنے بچوں کا ادھار ٹیک دوسری کے کمرے میں جا باندھ کر دے گی۔

”کایا پلٹ۔“ انہوں نے شفیق خاتون کی بات دہرائی۔

”واقعی یہ کیا پلٹ ہے لیکن ہوا کیا؟ مجھے پوری بات بتاؤ؟ آخر بات اتنی آگے کیسے بڑھی۔ ان دونوں میں معمولی کٹ پٹ ہوئی ہی رہتی ہے آخر اوپر تلے کی ہیں اور پھر مزاج بھی الگ الگ ہیں اتنی رنجشیں۔“

”بات صرف ان دونوں تک ہی تو محدود نہیں رہی۔ مدلتا بھی پلٹ میں آگئی۔ نہ چھوٹیوں نے آپس میں کوئی کس بات کی رنج نہ ہی بڑی کے بڑے پین کا لحاظ کیا۔“ ان کے لہجے میں افسوس ہی افسوس تھا۔

”کیا؟ مہلتا بھی... ناقابل یقین... آخر تم پوری بات بتاتیں کیوں نہیں۔“ وہ حقیقت جاننے کے لئے بے چین تھے۔

”کام سر پر لانے کی وجہ سے مد پارہ اچھ تو خامے دنوں سے رہی تھی۔ آپ نے محسوس کیا ہی ہوگا۔ اس نے تو بچے بس پیدا ہی کئے تھے، بالے تو بڑی اور چھوٹی بن گئے تھے۔ اب مد ناز تو اپنی حالت سے خود مجبور تھی، اس کا حوصلہ بے جوہر کمزوری اور لو بلڈ پریشر کے باوجود اپنے ننھے سے بچے اور گھریلو ذمہ داریاں بے حسن دھری تھا میری ہے لیکن ایسے میں دوسرے بچوں کے بھی۔ اور مد ملتا کو تو آپ نے خود ہدایت کی تھی پھر مجھ ایسی بات نہیں کہ اس نے بالکل ہی ہاتھ پیچھے رکھا ہو۔ آخر خدا کی طرح آزمائشیں ہی اس کے ہاتھوں پٹی ہیں۔

اب بھی روزِ صبح اپنے بچوں کے ساتھ ساتھ وہ ان چاروں کے لچ باکس بھی تیار کرتی ہے لیکن مد پارہ کو وہ دن یاد آتے ہیں کب اس کی بچیوں کی چٹا تک تالی گوندھتی تھی اور چھوٹی رائٹر کے ڈائریز تک وہ دلی تھی۔ بس جب تک وہ بے دام کی غلام بنی رہی، اچھی تھی۔ بڑا آگے پیچھے پھرتی تھی بڑی آہ، بڑی آہ کہتے ہوئے اب جو بے چاری کی خود پہ سن آتی ہے، ہاتھ پاؤں مار کے اپنی زندگی سنوار رہی ہے تو بری لگنے لگی اور رہی مد میں تو آپ جانتے ہیں، وہ ہمیشہ سے اپنے کام سے کام رکھنے والی ہے لیکن ساتھ ہی اس میں ایک بری عادت ہے کہ کسی کا احوال نہیں رکھتی نہ ہی لحاظ مروت ہے اس میں۔ منہ پر جواب دے مارتی ہے۔ بس اس کی زبان کھلی تو مد پارہ نے بھی حد کر دی۔“

”تم اصل قصہ مٹ سنا۔ اپنے تجربے پر چیں کرتی رہنا۔“ اب تو خواجہ صاحب کا تجسس اور گھروں کی اچھا کو چاہئے۔

”دراصل بات آج سے نہیں کل شروع ہوئی تھی۔ مد میں روز کی طرح سر شام ہی اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔ اس کے کمرے کی کونکلیاں باہر میسر پہ کھلتی ہیں جہاں اس وقت مد پارہ سے محلے کے بچے پڑھتے آتے ہیں۔ بس ہوا ہے کہ بچوں کے شور سے ٹک آکر اس نے باہر نکل کر اسے یہ کلاس اپنے کمرے میں لگائے کو کہہ دیا۔

”کمرے میں اتنی جگہ کہاں ہے کہ میں ان سات بچوں کو وہاں بیٹھاؤں۔“ اس کے اپنے چاروں بچوں کے علاوہ ایک نانا بھی اور بس محلے کے دو بچے۔

”تو پھر نیچے لاؤنج میں چلے جائیں یا پھر برآمدے میں۔“

”لاؤنج میں تو اس وقت میرا ان جہراں کا رخ ہوتا ہے۔ وہ فی وی بند کریں گے نہ ہی میوزک اور برآمدے میں اپنی بیٹھیں ہوں گے۔“

”کہیں بھی لے جائیں انہیں، مگر خدا رالم ازلم میرے سر پہ تو سوار نہ کریں۔ سر میں اس قدر شدید درد ہو رہا ہے۔ مجھے ہارے کام سے آؤ اور دو گھڑی کا چین میسر نہیں ہوتا۔“

”اوہ تو وہ تمہارے سر پہ کب بیٹھے ہیں؟ تم جاؤ اپنے کمرے میں اور جی بھر کے آرام کرو۔“

”کیسے آرام کروں۔ چین بھر کھا کر ذرا آنکھ لگی تھی کہ شور سے جاگ گئی۔“

”تو تم بھی تو بے وقت سو رہی۔ بچوں پہ بگڑنا باقی ہے۔ اگر مجھری دو سپر یا آدھی رات کو میں یہ کلاس لگاؤں تو تمہارا احتجاج کرنا بھی جائز ہے۔ ظاہر ہے یہ آرام کا وقت ہوتا ہے لیکن اس وقت سوائے تمہارے اور کون سوتا ہے۔ سب اپنے کام تمہاری نیند پر قربان تو نہیں کر سکتے۔“

”آپ لوگ دو پہروں کو سو سکتے ہیں، میں تو نہیں۔ میڈیکل ریپ کو کس قدر رنج و خار ہونا پڑتا ہے اس کا اندازہ بھی ہے آپ کو؟ سٹیز کرکٹ کی طرح سٹیز کا ناہی پڑتی ہیں۔ ابھی اس کلینک میں تو اب اس باہر مل رات کو میں عمران کی وجہ سے جلدی سوئیں پائی۔ ان کے آنے کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ لے دے کہ ایک شام ہی چلتی ہے، اس میں بھی آپ یہ اپنا استانیوں والا شوق لے کر بیٹھ جاتی ہیں۔“

”مجھ پہ اپنی نوکری کا رعب بھانے کی قطعی ضرورت نہیں۔ کتنی حقیر سے تھے تمہی استانی کہہ کر بلا رہی ہو۔ خود کو سارسر جن یا فریشن ہو۔ الٹی سمجھتیں آؤ گی ذاکر فی کہہ کر بلاتے ہیں۔“

”میں کیا بات کر رہی ہوں اور آپ کیا ذکر لے رہیں۔ میں نے کوئی طفر کیا ہے نہ ہی کسی قسم کا رعب ڈالا ہے۔ یہ محض آپ کا کام ٹیکس ہے۔“

”خدا خواہ مجھے کیوں کا ٹیکس ہونے لگے۔ کا ٹیکس کی مادی ہوئی تو تم خود ہو۔ کیا میں نہیں جانتی تم ان معصوم بچوں سے اتنا کیوں چڑتی ہو۔“

”آپ حد سے بڑھ رہی ہیں۔ آپ نہیں جانتیں کہ کس قدر تکلیف دہ اندازے لگا رہی ہیں۔ مد جنیں، مد پارہ کی بات کی گہرائی تک جا کے ٹپ لگھی۔

”بہنہ، جی بات کی تکلیف تو ہوئی ہی ہے۔“ وہ تو کہہ کر چل پڑی لیکن مد جنیں سکتی رہی۔ اس کی شادی کو اتنے سال ہو رہے تھے لیکن اولاد کی کوئی امید پیدا نہ ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ بیاہ کر آنے والی مد ناز بھلو کے بعد اب ایک اور مہمان کی تیاری کر رہی تھی۔ سب جاننے والے اس سلسلے میں اس سے سوال کرتے رہتے تھے، اپنے اپنے طور پر بھردوانہ



اعلان کیا لیکن مدہجیں تو کس کے رہ گئی۔

”ایک آدھ سلاکس تو بچا دیتیں۔ مگر میں کچھ نہ کچھ تو موجود ہونا چاہئے۔ خالی فریج بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔ ایک انڈہ تک موجود ہو جسے فروٹ کا ایک دانہ نہیں۔ بچے نہ ہوئے جن ہو گئے جو سب چٹ کر گئے۔“ اس نے زور سے فریج بند کیا۔ اوچی آواز سن کر مدہلقا بھی اس طرف آ گئیں۔

”زبان سنہیال کے بات کر مدہجیں۔ کیسے نہ پھاڑ کے میرے بچوں کو جن کہہ دیا جیسے تمہارے کچھ کچھ ہی نہیں۔ مگر کے باقی لوگوں کو تو جیسے پچھے لگا ہوا ہی نہیں۔ بس میرے بچے ہی سب کھا جاتے ہیں۔ فروٹ تو سارا دھچوٹی ٹھونس جاتی ہے، پھلے ٹھک پائے اس کے بارہ ہی کیوں نہ بچ رہے ہوں اور پھر اندر سے تو ناشتے میں سے جو کچھ جاتے ہیں، وہ بڑی آ پائے کرے میں لے جاتی ہیں چرے سے پھوٹنے کے لئے۔ انہیں خانا بخوار ہوا ہے چرے کی سلوٹیں دور کرنے کا۔ ہونہاب اس عمر میں چلی ہیں حسن میں کھانا پیدا.....“

سانے مدہلقا کو کچھ کر اس کی زبان لڑکھائی پھر دھیت پن کا مظاہرہ کرتی فیڈر سنہیال پہلو بجاتی لنگھتی لیکن مذاقے رائے روک دیا۔

”کیا ہو رہا ہے؟ کس مسئلے پر اتنی زور دھڑو سے بحث ہو رہی ہے اور کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ مجھے کس مسئلے میں کھینا جا رہا ہے؟“

”آپا میں تو صرف اپنے کھانے کے لئے کچھ ڈھوڑ رہی تھی۔ یہ آگئیں تو ان سے پوچھ بیٹھی، بس اتنی ٹھوس ہو گئی تھی مجھ سے۔ میرے ساتھ ساتھ آپ کو بھی کھینٹ لیا۔“

”مدہ پارہ اتم اس طرح کی باتیں بھی کر سکتی ہو۔ میں سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ مدہ زخم سے کتنی چھوٹی ہے۔ تمہیں اس کا اس حالت میں خیال رکھنا چاہئے اور تم اس کا کھانا پینا مگن رہی ہو۔ میں نے تمہارے ان دونوں کیسے کیسے لا ڈھائے ہیں، نوالے ٹانہا کے منہ میں ڈالے ہیں اور تم..... اور تو دیر سے بارے میں، اپنی بوی، بہن کے بارے میں ایسی بات تم نے کیسے کہہ دی۔ مجھے اسے اتنا غصہ، انداز میں اتنی حقیر..... میرے لئے.....“ وہ دم سے پھر پورے لہجے میں سوال کر رہی تھیں۔

”میرے ساتھ جو جیسا کرے گا میں دیا ہی پیش آؤں گی۔ جب تک آپ نے لاڈ اٹھائے، میں نے بھی تنہا ضروری کی۔ جب تک مدہجیں سیدھی رہی، میں بھی چپ تھی لیکن وہ منہ میرے میرے بچوں کو جن کہہ دے، ان کی خوراک کو کھو کے تو کیا میں چپ رہوں۔ اپنے باپ کا کھانا ہے۔ کسی سے تو نہیں لیتے۔“

مشوروں سے بھی نوازتے رہتے لیکن اسے توقع نہ تھی کہ اپنی ہی بہن اس کی جے اولادی کو طعنے کی طرح استعمال کرے گی۔ اس نے ذہن میں اس کا فقرہ دہرایا اور نئے سرے سے سلگ اٹھی۔ وہ تو بہتر ہوا مدہ پارہ اپنی بات کہہ کر اندر چلی گئی ورنہ مدہجیں اتنی بڑی اور نوکیلی بات آسانی سے سہہ جالے دانی نہیں تھی۔

آج دوپہر کا واقعہ کل شام کے سمر کے کواڑسرو زندہ کرنے کا باعث بنا۔ خلاف معمول مدہجیں شام سے کچھ پہلے ہی چلی آئی۔ جب کبھی وہ وقت سے پہلے آتی تو دیر سے ہی سہی دوپہر کا کھانا کھرے ہی کھاتی۔ آج بھی ساڑھے تین بجے آنے کے بعد اس نے بکن کا رخ کیا۔ فریج میں سے ٹوری کی بھجیا اور قیرہ پیاز کا ساں نکالا۔ ہاٹ پاٹ چیک کیا، روٹی غدارو، سرد آٹھ بھر کے اس نے آٹا نکالنا چاہا حالانکہ روٹی پکانے کا ذرا موڈ نہ تھا لیکن بھوک زبردست لگی ہوئی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ آج جلدی فارغ ہو جائے گی، اس لئے آفس نام میں جو ہلکا پھلکا لٹچ لٹچ تھی۔ وہ نہ لیا کہ ایک ہی دفعہ گھر جا کر کھانا کھایا جائے اور اب جب بھوک زوروں پہ تھی، روٹی کچی پکائی نہ ملی۔ ”خیر میں کون سا کچھ کھرے کرتی ہوں جو کئی میرے لئے اہتمام کر کے رکھتا۔“ لیکن اس کا سکون غارت ہو گیا جب تلاش کرنے پر بھی فریج میں گندھا آٹا نہ ملا اور تب تو کوفت کے مارے اس کا شر ہو گیا، جب ڈبل روٹی کے ٹکٹ میں آدھے سلاکس کے کچھ سوا نہ نکلا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا، صبح سوئے اس کے سب نے بن اور بیٹھی کسی کا ناشتہ کیا تھا۔ بچوں کے لٹچ کا سز میں بھی آپا نے فریج فراز رکھے تھے بھارات کو لایا گیا بڑے کا فل سا سز ٹکٹ ختم کیسے ہو گیا۔ خالی پیٹ غصہ بھی خوب آتا ہے اور شوخی قسمت ایسے میں مدہ پارہ کی بکن میں تشریف آوری ہو گئی۔

”تم کیا پوری کی پوری فریج میں تمہیں ہوئی ہو؟“  
”اور کچھ تو ہے نہیں۔ میں نے سوچا، میں ہی تمہیں چاؤں۔“ وہ مل کے بولی۔ ”مدہ روٹی ہے نہ ہی آٹا نہ کوئی بڑے سلاکس۔“

”ہاں، وہ آٹا تو آج میں گوندھا ہی بھول گئی۔ کیا کروں۔ روٹیں میں نہیں ہے ناں۔ ہمیشہ آپا ہی گوندھ دیتی تھیں لیکن اب تو نہیں اور بھی معروفا ت ہیں۔ بازار سے روٹی منگوائی تھی۔“ وہ سکون سے رائے کے لئے فیڈر بناتے لگی۔

”اور بڑے؟“

”امی کے دانت میں درد تھا، بڑے کے ساتھ کھانا کھایا اور رضی بھی تو وری نہیں کھاتا، تجھے میں مرجع زیادہ ہوگی۔ میں نے ابلے انڈے کھائے اور سینڈوچ بنائے۔“ اس نے غصے

”ہونہ، اپنے باپ کا؟ غلط فہمی سے نکل آئے۔ سب جانتے ہیں وہ اپنے باپ کا کتنا کھاتے ہیں اور دوسروں کے باپ کا کتنا۔“ مدجیبن نے فوراً حساب برابر کر دیا۔ ”بھئی لہجہ بھائی کی آمدنی ہے اگر وہ بھل اپنے بل بوتے پر اولاد پالتے تو آپ کبھی پانچ پانچ بچے پیدا کرنے کی ہمت نہ کرتیں لیکن جب بغیر کچھ کے ساری بھولتیں مل جائیں تو یونہی اولاد کے ذخیرہ لگے جاتے ہیں۔“

”جب رہو تم مدجیبن۔“ مدلقا کو اس کی زبان سے خوف محسوس ہوا۔

”بولے دیں آپا! اسے بولے دیں۔ پتا تو چلے کہ آخر اس کے اندر کتنا زہر بھرا ہوا ہے۔ آپ بھی دیکھ لیجئے، کیسے اس کا احساسِ محرومی باہر اُبل رہا ہے۔ خود کے اولاد کو نہیں ہے، دوسروں کی بھی چھ رہی ہے۔“

”آپا! اس نے دوسری بار مجھے یہ طعنہ دیا ہے۔ پوچھئے اس سے یہ میری سگی بہن ہے یا دشمن۔ اس کا دل نہیں کا پتا مجھے ہے اولاد کی کا طعنہ دیتے ہوئے۔“

”اور تو خالہ ہے باؤ اس۔“ میرا کچھ نہیں بھٹتا بہن کی اولاد کو کتنے۔ ہم تو یہی سنتے آئے ہیں کہ خالہ ماں جیسی ہوتی ہے۔ اسی لئے تو اسے ماں کہا جاتا ہے لیکن تم نے یہ غلط کر دکھایا۔ ہاں ظاہر ہے جو ماں ہی نہیں وہ ماں سی کیسے ہو سکتی ہے۔ تمہارا دل ممتا سے خالی ہے، اس لئے خدا نے تمہاری گود بھی سونپی رکھی ہے۔“

”مد پارہ! خدا کا واسطہ ہے، اپنی زبان کو گلام دو۔“ مدلقا نے مدجیبن کے چہرے کو پہلے سفید پھر سرخ کر پڑے دیکھا تو اس کی متیں کھیں۔

”آج مدت روکیں اسے آپا! بہت زعم ہے اسے ماں ہونے پر۔ میری بے اولادی اس کی نظر میں خدا کی طرف سے دی گئی کوئی سزا ہے لیکن یہ نہیں جانتی۔ کبھی کبھی اولاد بھی عذاب اور سزا کی طرح ہی نازل ہوتی ہے۔“ پھر کادری ہوئی وہ تیری طرح بچن سے نکل گئی اور مد پارہ فیڈر چیک کر سیز پینے لگی۔

”ہائے ہائے کوکھ طلی بدو عدا سے کر گئی ہے مجھے۔ مجھے..... اپنی ماں جانی کو۔“

”تم نے کون سا بہنوں والا حق ادا کیا ہے۔“ فسمے میں ہی تھی، اس نے سخت ناروا حرکت کی ہے لیکن اگر وہ اپنے ذہن اور زبان سے احتیاط کر تو ہٹتی ہے تو اسے اس حد تک لانے والی بھی تم ہی ہو۔“

”آپ کیوں میرا ساتھ دینے لگیں۔ آپ کو تو ہمیشہ سے میرا وجود چھلکتا ہے۔ یہ سب مصیبتیں شروع ہی آپ کی وجہ سے ہوئی ہیں۔ نہ آپ اچھا بھلا چلا گھر کا نظام تبدیل کرتیں

لہی کام کے بوجھ اور داؤ سے میرا داغ خراب ہوتا۔“

”واہ بہت خوب۔“ اتنا عرصہ میں تنہا یہ بوجھ اور داؤ اپنے شانوں پہ لئے رہی۔ میرا ذہن داغ خراب ہوانہ میں سے کوئی نساہد پر کیا۔“

”آپ کو کوشش جو بے لیزری کرنے کا۔ آپ تو خوش تھیں ہاں بن کر لیکن میرے ساتھ یہ نہیں ہے۔ جان کھانے کے بعد بھی میں ہاں تو نہیں بن جاؤں گی، وہ تو آپ ہی رہیں گی۔ جب غبرون یوٹیشن پر آپ نے ہی رہنا ہے تو مجھے محنت کرنے کا کیا فائدہ۔ میں تو باپ کے گھر بھی غبر دو جی اور یہاں بھی غبر دو۔ آپ اپنے سے آگے کسی کو بڑھتا دیکھ ہی نہیں سکتیں۔ خصوصاً مجھے..... مجھ سے زیادہ اہمیت تو آپ اس چھوٹی گود دیتی ہیں۔ اسے بھی گر سکھا رہے ہیں لوگوں کو مٹی میں کرنے کے۔“

مدنا ز جو مدجیبن کو دتا دھوتا زیر حیاں جڑتے دیکھ کر یہاں چلی آئی تھی فوراً لپٹ میں آگئی۔ چکا دیکھا وہ دونوں بڑی بہنوں کے چہرے دیکھنے لگی۔ ایک کا چہرہ مد سے زرد پڑ چکا تھا تو دوسری کا فسمے کی پیش سے بھسکوا ہو رہا تھا۔

”کیا ہوا بڑی آپا..... بھیا! کیا بات ہے؟“

”کچھ نہیں۔“ وہ سر جھٹکتے ہوئے واپس مڑنے لگیں۔ ”دماغ خراب ہو گیا ہے اس کا۔“

”ہاں ہاں کوئی جی ہاں کہیں کرے اس کا دماغ خراب اور جو گھنا مینا ہو کر بیٹھ جائے وہ اچھا۔ جیسے یہ اور اس کا کیاں۔“ مدنا کے ساتھ ساتھ اس کے شوہر جبران کو بھی تھکیت لیا گیا۔

”کیا جبران نے کچھ کیا ہے؟“ وہ کہ کر پوچھنے لگی۔

”کسی نے کچھ نہیں کیا، میں نے کہا ناں، اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے تم کچھ در اور ہاں رو کی تو تمہارے بھی پرغے اُڑا دے گی۔“ چلو نکلو یہاں سے۔ پہلے ہی تمہاری طبیعت ٹپک نہیں۔“

☆=====☆

”ناممکن..... یہ سب کیسے ہو سکتا ہے۔ خواجہ ہاؤس میں اتنا سب ہو گیا۔ کیسے..... اتنی؟“

”یہی زبانیں میری ہو سکتی ہیں۔“

خواجہ صاحب نے بیٹنی کے سے عالم میں بیٹھے افسوس سے سر ہلاتے رہے۔ بیگم سے اربابا سن کر بھی وہ یہ حقیقت ہمدم نہ کر پارے تھے۔ جب مد پارہ کا دیا ہوا بے اولادی کا منہ یاد آتا تو جیسے کچھ مسلا جاتا۔

”ہائے کیسا بارانگا ہوگا مدہ نہیں کو۔ بے چاری کے دل پہ کیا نہ زور تھی ہوگی۔“  
اور جب اس کی رُوی بدعا یاد آتی تو وہی مدہ نہیں مظلوم سے ظلم بن جاتی۔  
”اتنی پتھر کیسے ہو سکتی ہے وہ کہ اپنی ہی بہن کو اولاد کی بددعا دے ڈالی۔“  
اسنے میں مدہ ناز چائے کی ٹرے لے چلی آئی۔ ساتھ ہی مہراں بھی اندر داخل ہوا۔

خواجہ صاحب سے کچھ پہلے وہ چھوٹی بھالی سے ساری روئیداد جان چکا تھا۔  
”وہ نہیں آئیں؟“ خواجہ صاحب نے صرف نظر اٹھا کے دیکھا تھا لیکن شفیقہ خاتون  
نے سوال کر ڈالا۔

”اؤں ہوں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”بڑی آپا تو اس وقت سے روئے چلی جا رہی ہیں۔ مدہ نہیں کے پاس سمجھانے گئی تو اتنا  
مجھ پہ چڑائی کر کہیں اسے غلط بھی رہی ہوں اور دوسروں کی حمایت کر رہی ہوں حالانکہ میرا تو یہی  
خیال ہے جتنی غلطی اس کی ہے اتنی ہی جیسا کہ بھی لگتی لیکن تو بہر حال دونوں کی ہے۔ دونوں  
میں سے کوئی دوسرے کو اس بدچرگی کا ذمہ دار ٹھہرا کر خود کو بری الذمہ نہیں ہو سکتا۔ بجیانے تو  
خیر میری شکل تک دیکھنے سے انکار کر دیا۔ ان کے خیال میں تو میں بڑی آپا کی چچی ہوں۔“  
”دیکھنا ہوں، تک تک کرے میں بند رہتی ہیں۔ کہہ دو سب سے رات میرے کرے  
میں حاضر ہوں اپنے اپنے شہروں سمیت۔ سب کے دماغ درست ہونے والے ہیں۔ گھر کو  
معاذ جنگ سمجھ رکھا ہے۔ اپنے اپنے مورچے سنبھالے بیٹھی ہیں۔ آج رات میں یہ قصہ ختم  
کر رہوں گا۔“

غم کی وقتی کیفیت سے نکلنے ہی خواجہ صاحب نے اپنی اولیٰ دہشت پھیلاتے ہوئے  
چنگی میٹنگ کا اعلان کیا۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے ذرا گھر کئے کی دیر ہے، سب سیدھے  
ہو جائیں گے۔ جیسے فرقان کے کتل میں درست کئے تھے ویسے ہی یہ مدہ اور مدہ نہیں کی  
طبیعت بھی صاف ہو جائے گی۔ آئندہ ایسی معاذا رمائیاں کرنے کی جرأت نہ کر پائیں گی۔ یہ  
چلتی پورے اعتماد کے ساتھ ان کے چہرے پر روشن تھا جسے پڑھ کر مہراں نے چپکے سے دعا  
کی۔

”اگرچہ میں آپ کے اس اصول کے خلاف ہوں کہ ڈٹے کے زور پہ سب کو اپنی  
مرضی پہ چلا یا جائے پھر بھی ابلی میری دعا ہے آپ کا پھر کبھی نہ ٹوٹے۔ اپنی اولاد پہ آپ کا  
بیاضا دلو یہی قائم رہے۔“

”میں کوئی لمبی چوڑی تسمیہ بانہوں کا نہ ہی وضاحت طلب کروں گا صبح والے واقعے  
کی۔ میں صرف وارننگ دے رہا ہوں کہ آئندہ اس جھگڑے کے پیچھے ایسا کوئی تماشا برگر نہ نہیں  
ہوتا چاہئے۔“

باری باری تمام بیٹوں اور بہوؤں کے تھے ہوئے چہروں کی طرف کڑی نظروں سے  
دیکھتے ہوئے ابی نے سخت ترین انداز میں وارننگ دی۔

”یہ کیا بات ہوئی ابلی! گھر میں اتنی بڑی بات ہوگئی اور آپ بجائے قصور وار کو تسمیہ  
کرنے کے سب کو ایک ہی لالچی سے بائک رہے ہیں۔ وضاحت کیوں نہیں طلب کریں گے  
آپ۔ آپ کو ضرور وضاحت طلب کرنی چاہئے، سارا دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو چانا  
چاہئے۔ پتا چلتا چاہئے کہ تماشا کس نے شروع کیا اور کیوں کیا؟“ عمران بھیا کو ابلی کی ڈانٹ  
ڈپٹ ذرا پسند نہ آئی۔ وہ تو اپنے طور پہ بیوی کی وکالت کرنے آئے تھے اور انہوں نے مقدمہ  
کی ساعت کے بغیر یہ فیصلہ سنایا۔

”بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں یہ ابلی! اچھا ہوا یہ مطالبہ خود انہوں نے کیا۔ ہم بھی یہی  
دھاچہ دیتے ہیں کہ قصور وار کو سزا ملے بجائے اس کے کہ سب ہی کو ایک لائن میں کھڑا کر کے لغت  
طاقت کی جائے۔“ لقمان بھیا بھی پورے پورے بیوی کے سکھانے ہوئے لگ رہے تھے۔  
”میں سب سن چکا ہوں اور ابھی طرح جاتا ہوں۔ کون کتنا قصور وار ہے۔ تم سب کو  
ایک ہی لائن سے ہانکنے کی وجہ بھی یہ ہے کہ تم میں سے کوئی کسی سے کم نہیں۔ لاتوں کے  
بجوت ہوتی سب۔ جب تک میرے ہاتھ تمہاری گردنوں تک تھے، سب تیر کی طرح سیدھے  
تھے۔ اب تمہارے بچوں نے نقد نکالنے کے شرع کے تو میں نے ڈھیل دے دی لیکن میری نرمی کا  
نتیجہ یہ نکال کر تم نے گھر کو میدان جنگ بنا ڈالا۔“

”لاحول ولا۔۔۔ ابلی! تو ایسے بات کر رہے ہیں جیسے ہم لوگ میزک میں براؤزلٹ لانے  
کے بعد ان کے آگے سر جھکا کر بیٹھے ہیں۔“ عمران بھیا بڑبڑائے۔

”اور کی؟ بات غور تو ان کے درمیان ہوئی ہے اور آپ ہمیں ڈرا دھمکا رہے ہیں۔ ہم  
نے بھلا کیا کیا ہے؟“ جبران کو بھی یہ ہیڈ ماسٹروں والی زبان پسند نہ آئی۔

”تم لوگوں نے یہ کیا ہے کہ اپنی عورتوں پہ کنٹرول رکھنا چھوڑ دیا ہے۔ یہ بات مجھ تک  
پہنچنی ہی نہیں جا چکے تھی، یہ مسئلہ تو تم لوگوں کو خود مل کرنا چاہئے تھا۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں  
تمہاری بیویوں کے یوں دودھ دلاؤ کہ ان کی موت ہی نہیں آتا چاہئے تھی۔ میرا خیال تھا کہ خون  
کے رشتے کچھ لحاظ رکھیں گے لیکن یہ تو دیوانی جیٹھانی بنتے ہی بہن کا رشہ بھول گئیں

اور تم لوگ..... جہیں کیا ہوا ہے..... تمہارے رشتے کو بھی کیا دوسرا کوئی نام مل گیا ہے؟“

”ابی! عمران ٹھیک کہہ رہا ہے۔ آپ کو سب کا موقف مننا چاہیے۔ کیونکہ سب کا خون شہید نہیں ہوا۔“ مد قلا جو بڑی دیر سے چپ تھیں، دیرہ نگاہوں سے مد پارہ اور مد جہیں کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

”ہمارے رشتے کو کیا نام آج سے نہیں ملا۔“ اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔ ”کئی سال ہو گئے ہیں اس نئے رشتے کو بندھے ہوئے۔ کیا آپ کو پہلے کوئی شکایت ہوئی۔ اگر آج آپ کو شکایت ہے تو پہلے ہماری بھی تو سنیں۔ وہ دچ تو جان لیجئے جس نے ہمیں ایک دوسرے کے مقابل لاکھڑا کیا۔ پھر شاید آپ فیصلہ کرنے میں آسانی ہو کہ کون قصور دار ہے کون نہیں۔ کیونکہ کم از کم میں تو یہ الزام اپنے نہیں لے سکتی۔ اتنے سالوں تک میں نے کیا نہیں کیا اس گھر کی خوشی کے لئے آج..... آج میرے ساتھ زیادتی ہوئی ہے تو.....“

ان کی آواز بھرا گئی تو مد پارہ کو کہنے کا موقع ملا۔  
”ہاں ہاں۔ آپ نے کیا نہیں کیا..... لیکن اس گھر کی خوشی کے لئے نہیں بھل اپنی خوشی کے لئے۔ اپنی حاکمانہ فطرت کی تسکین کے لئے۔ جب تک آپ کا دل چاہا آپ نے من مانی کی اور جب آپ اور دن پر زور چلا چلا کر دل بھر گیا تو اپنے شوہر کی خبر لی۔ آپ نے مجھے دبا دبا کر اتنا مشتعل کر دیا کہ اب مجھ میں برداشت کا مادہ بالکل نہیں رہا۔“

”واہ یہ اچھا جواز پیش کیا آپ نے اپنی زیادتیوں کا۔ برداشت کا مادہ تو آپ میں پیدا ہی ہو ہی ہو رہا تھا۔“ مد جہیں نے حملہ کیا۔

”اگر جاتی ہو تو پھر بار بار آزمانی کیوں ہو۔“ تنک کر جواب دیا گیا۔  
”دیکھ لیا اب! آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے تمہارا کس نے شروع کیا۔“ عمران نے دونوں ہاتھ کھڑے کر کے فیصلہ طلب کیا۔

”عمران! تم جانے نہیں تمہاری بیوی نے اپنی بہن کو کتنی سخت بددعا دی ہے، تمہارے بچپن کے حوالے سے۔“ لقمان نے غیرت دلانے کی کوشش کی۔

”اور آپ بھی شاید انجان ہیں کہ آپ کی بیگم نے اپنی چھوٹی بہن کو ”کھوکھو جلی“ کہہ کر ہاتھ ہونے کا ٹھنڈ دیا۔“

”بس! ابی! کھڑے ہو گئے۔“ میں نے جھگڑا ختم کرنے بلوایا ہے نہ کہ مزید بڑھانے کو۔ غضب خدا کا، جہیں اب ماں اور باپ تک کا لٹا نہیں رہا۔ ختم کرو اس بے ہودہ قصے کو۔“

”ختم کرنے ہی تو آئے ہیں ابی۔“ عمران نے مضبوط لہجے میں کہا۔ اب تک چپ چاپ سب تھے مہران نے چونک کر بھائی کے چہرے پر کچھ کھوجا اور جو اسے ملا اس نے اسے غور تک دہلایا۔ وہ دل کیا تھا ابی کے اعتقاد کو دھندلانا دیکھ کر۔

”پچھلے دو سال سے میں مسلسل کوششیں کر رہا تھا کہ کسی طرح اپنا ٹیکنیک سیٹ کر لوں۔

وہ جگہ چاب کرنے کے بجائے صبح کا پہلا پریش کرنا اور شام کو اپنے ٹھیک۔ بہترین طریقہ تو یہ ہی تھا کہ رہائش گاہ کے ساتھ ہی ٹیکنیک کھول لیا جاتا تھا۔ آئے جانے میں زیادہ مشکل نہ ہو لیکن ہمارا گھر جس علاقے میں ہے وہاں اتنے بڑے اسکیل پر ٹیکنیک نہیں بنایا جاسکتا۔ میرا ارادہ ٹیکنیک کے اوپر رہا تھا۔ پھر کرنے کا تھا لیکن مد جہیں نہیں مانی۔ وہ یہ سلسلہ بغیر کر گھر میں کسی قسم کی کوئی بددعہ نہیں پھیلنا چاہتی تھی میں بھی چپ ہو گیا۔ جانتا تھا آپ اتنے چٹے ہیں اس بارے میں لیکن کیا ملاہم دونوں کو اس چپ کے بدلے میں۔ حکم کھلا اورے ساتھ زیادتی ہوئی اور آپ کوئی سبب باپ کرنے کے بجائے لاتوں کے بھوت والی ٹکی دے کر ڈرا رہے ہیں۔ آپ کے نزدیک ہماری عزت نفس اور خواہشات کی کوئی قدر ہی ہیں۔ آپ کو صرف اپنے خواب مقدم ہیں۔“

”عمران!“ ابی بے یقینی سے انہیں دیکھنے لگے۔

”لڑو، مرد بس ایک ساتھ رہو، یہ ہے آپ کا فلسفہ۔“ ان کے ذہن میں کچھ عرصہ پہلے زبان کا کچھ اصرار تھا۔

”تو تم کیا چاہتے ہو؟“ ان کے اعزاز میں مد جہیں نے قہقہے مچا دی۔

”آزادی۔“ وہ پینٹ کی جیسوں میں ہاتھ غلوں کے کھڑے ہو گئے اور سب نے ان کی طرف چونک کے دیکھا۔ لقمان اور مد پارہ بیٹا کے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ پھر نہ جانے اسوج کر مد پارہ ریڈیکس سی ہو گئی اور انکھوں ہی انکھوں میں شوہر کو ٹکلی دی۔

”آزادی.....؟ کیا میں نے تمہیں قید کر رکھا ہے؟ پولو.....“ نہ جانے ابی کا سارا کر فوراً پاں چلا گیا تھا۔

”آپ نے ہمیں اپنے خواب میں جکڑ رکھا ہے، گس رکھا ہے۔ جب تک حالات نے بہت دی، ہم نے تقدیر بھر آپ کے جذبات کا احترام کیا لیکن اب حالات اختیار سے باہر رہے ہیں۔ خود اپنی نظروں سے گر کر اپنے ہی بہن بھائیوں کے ہاتھوں ذلیل ہو کر بیٹا بھی بن گیا ہے۔ میں فیصلہ کر چکا ہوں۔ دینے تو میں ٹیکنیک کے لئے پلاٹ دیکھ دی رہا تھا لیکن بات وقت نہیں ہے کہ قصیر کے مجھبھٹ میں بڑا جائے۔ میں جلد از جلد کوئی بنگلہ دیکھ کر وہاں

خفیل ہو جاؤں گا۔ کم از کم میرے اور مدہ جیسے کے وجود سے کسی کو کوفت ہوتی ہے تو وہ اب دور ہو جائے گی۔" وہ اپنا فیصلہ بنا کر چلے پئے، مدہ جیسے مزید کسی سوال جواب سے بچنے کی خاطر شوہر کے پیچھے پیچھے ہی ہوئی۔ اپنی اور امی کی طرح فرحان اور بڑی بھائی کے لئے بھی ان کا یہ فیصلہ حیران کن تھا۔ وہ تو بہکا بولا کون کو دیکھتے رہے۔ مدہ پارہ بھائی نے لقمان بھیا کو ڈھکڑا دیا۔ وہ ہنسنے لگا۔

"یہ اچھی بات ہے کہ لکھنا خود ہے اور الزام دوسروں کے سر ڈال دیا۔ ہمیں بھلا کیا تکلیف کسی کی ذات سے اور ویدہ دلیری دیکھو ہم پر الزام لگایا جا رہا ہے عزت نفس کیلئے۔ اس سے پوچھنا تو تھا کہ میری کم آمدن کا طعنہ کس نے دیا تھا اور میرے بچوں کا دوسروں کی کمائی پر پلنے کا دعویٰ کس کا تھا۔ میں تو خوش تھا کہ بھائی بھائی کو ڈھانپ رہا ہے۔ مل کر کھانا کھا رہے ہیں چاہے بچنی سے کھائیں جا ہے مرنے سے لیکن پتا نہیں تھا کہ اس طرح کا طعنہ سننے کو ملے گا عزت نفس اس کیلئے کی نہیں، میری بھی ہے۔ ذلیل ہو کر میں بھی نہیں رہ سکتا۔ یہ چلا گیا ہے تو کیا ہوا اکل کون میں سے دوسرا اٹھ کر اپنے پیسے کی دھوٹی بھانے گا۔ بھئی ہماری اتنی پالی تو نہیں کہ ان کی طرح جنگلے خریدتے پھر بھی بھڑکی بھی سوچا ہے کہ اپنی چھت الگ کر لیں۔ عزت سے گزارا ہوگا۔ بچے کسی احسان کے بغیر کوئی بدعا ملے یا باز زندگی گزار لیں گے۔"

اپنی بات مکمل کر کے انہوں نے ڈرتے ڈرتے الٹی کی طرف دیکھا۔ وہ میر ہواڑے کسی گھڑی سوچ میں گم تھے۔ اسی منہ میں وہ دپ دپاے مسکائیں لے رہی تھیں۔ مدہ پارہ بھائی نے آگے کے اشارے کے ذریعے انہیں وہاں سے غائب ہونے کے لئے کہا۔ مبادا وہ کسی اموشن بلیک میلنگ کا شکار نہ ہو جائیں۔

"بس روشنیہ..... کیا سارے آئسوا بھی بہا لوگی۔" اپنی نے ان کے جانے کے بعد سرد آہ بھر کے شریک حیات کو ٹوکا۔ جو اہان کے رونے میں اور شدت آگئی۔

"ابھی بڑے موقع آئیں گے۔ شوق سے روتی رہتا۔ ہاں مجھے سا جزا دے! آپ نے بھی کوئی صلہ دیکھ لیا ہے یا میں آپ کی مدد کروں اور جبران ہم بھی جلدی اپنا بندہ دست کر لو، شاید آج کل مکان کوڑیوں کے مول بک رہے ہیں، تب ہی ہر کوئی اپنا اپنا لینے بھاگ رہا ہے۔ جاؤ میاں! تم کیوں پیچھے رہو..... اور مہرمان..... تم..... خیر تمہیں کیا کہوں..... تمہیں تو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ تمہارے اپنے نظریات بھی تو یہی ہیں۔ تم تو کھلا کھلا میرے خواب کا مذاق اڑا چکے ہو۔ اس وقت مجھے غصہ آیا تھا۔ شاید یہ غصہ..... لیکن اب سوچنا

ہوں۔ تم فحیک کہتے تھے۔ شاید میں ہی غلط تھا..... شاید میری خواہش ہی ناجائز تھی۔" ہمیشہ گرجنے برسنے والے خواجہ خلیق الرحمان کا لہجہ نہایت دمدم اور الفاظ گھبرے ہوئے تھے۔ مہرمان تو پ اٹھا فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے قدموں میں بیٹھ گیا اور ہاتھ تمام کر کہنے لگا۔ "میں نے کبھی آپ کے خوابوں کا مذاق نہیں اڑایا ابلی۔ اس وقت اگر میں نے کچھ ایسا سیدھا کہا بھی تھا تو قبی جھجھلا ہٹ کے زیر اثر۔ میں صرف آپ کی شدت پسندی کے خلاف تھا۔"

"میں اب بھی نہیں نہیں پار یا یہ سب ہوا کیسے؟ اگر واقعی میرا اقدام غلط تھا تو اس کے لئے تباہی کتنی دیر سے کیوں ظاہر ہوئے۔ آخر اتنا عرصہ یہ گھر میری حسب خواہش ہی تو چلا رہا ہے۔"

"وہ اس لئے کہ جب تک آپ کی خواہش ان کی خواہش سے کمرائی نہیں تھی۔ سب اپنی اپنی غرض کے بندے ہیں۔ جس کو ساتھ ہانا ہو وہ بغیر کسی غرض کے، بغیر کسی مفاد کے بھی رہتا ہے، اگر کسی کا ساتھ منظور ہو تو اس کی سوز پاتیاں بھی سہل لی جاتی ہیں لیکن جن کے دلوں میں تمناؤں..... ہو انہیں ہزار کوششوں کے بعد بھی اکٹھا نہیں رکھا جاسکتا۔ عمران بھیا کی ترقی کی اہمیت یہ گھر اور اس کا فرد ماحول رکاوٹ تھا یہ جھگڑا اس رکاوٹ کو دور کرنے کا جواز بنا اور نان بھیا جو عزت اور خودداری کا راگ الاپتے گئے ہیں، درحقیقت پانٹر شپ سے لینے ہو گئے کا کاروبار شروع کرنے والے ہیں۔ وہ اور ان کی بیگم شروع سے ہی مل بیٹھ کے رہنے کے حامی نہیں۔ وہ تو مالی حالات اجازت نہیں دیتے تھے۔ اس لئے چپ چاپ اٹتے الگ گزار دیے۔ اب جو معاشی حالت سدھرنے کے امکان پیدا ہوئے تو صحت اپنا ٹھکانا لے کر نے کی سوچی۔"

"اپنا کاروبار شروع کرنے والا ہے؟ کمال ہے اتنی بڑی بات اور میں بے خبر..... اسی لئے تو کہہ رہا ہوں تم لوگ بھی اب چائیک کوئی دھوکا دینے کے بجائے ابھی فیصلہ نہ لو، کب اور کس دن رخصت ہوتا ہے۔" انہوں نے دل پھڑ پھڑایا۔

"ابلی..... آپ..... آپ ہمیں نکال رہے ہیں گھر سے؟" مدہ تو قریب چلی آئی۔ اس نے انہیں پوچھا کہ سارا بے نیگے تھے۔ وہ اپنی سب سے چھٹی ہو کے آئسوا دیکھ کر پائے، منہ بھیر کے پھٹے گئے۔

"میں کون ہوتا ہوں کسی کو نکالنے والا۔ وہ سب بھی تو خود اپنا فیصلہ مانگے۔ تمہیں تو میں اذیت دے رہا ہوں۔ ہاں اگر اس گھر میں رہنا زیادہ پسند ہے تو فحیک ہے۔ میں ہی نہیں اپنا

بندوست کرلوں گا۔“

”ابی..... ابی پلیز۔“ وہ سسکتی گئی۔ ”میں خود سے الگ مت کیجئے۔ ان کی سرکشی کی سزا ہمیں مت دیں۔ وہ جانا چاہتے تھے، چلے گئے، کم از کم میں اس گھر کو، آپ کو اور امی کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔“

”اور میں بھی نہیں۔“ ملقا بھی اٹھ کے قریب چلی آئیں۔ ”اگر نہ ناز کو میری حاکمت پہ اعتراض نہ ہو تو۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ بڑی آیا۔ آپ میری ماں کی جگہ ہیں۔ میں نے ہمیشہ آپ کو عزت دی ہے۔ مان دیا ہے اور ان شاء اللہ دینی رکوں گی۔“ دونوں بیٹھیں خواجہ صاحب کے گھنٹوں پہ ہاتھ دھرے ایک دوسرے کے گلے گل گئیں۔ فرقان بھیا اور جبران ایک دوسرے کو دیکھ کر کھل کر مسکرائے۔

”یہ سب تمہاری جذباتیت ہے۔ خیر میں زبردستی کرنے والا کون ہوتا ہوں۔ پہلے ہی مجھ پہ زیادتیاں کرنے کا الزام ہے۔ تمہاری مرضی..... دو کہتا ہوں یہ بھائی چارہ اور کتنے دن قائم رہتا ہے۔ مجھے تو اب کسی سے کوئی امید نہیں۔“

”امید ہمیشہ زندہ رہنی چاہئے ابی۔“ مہران نے تسلی دینا چاہی۔

”تم تو خیر مجھ سے کلام ہی نہ کرو۔ یہ تو سچی باتیں تھیں۔ تمہاری بیوی جو کچھ کرنے والی ہے، وہ میں ابھی سے دیکھ سکتا ہوں۔ مجھے تو نہیں لگتا کہ وہ دلی سے نیچے اس گھر کی دہلیز پہ پاؤں بھی دھرے گی اس لئے یہ لمبے چڑے دھوے رہے۔“ کھوکھلی سی ہنسی کے ساتھ انہوں نے ہاتھ اٹھا کے اسے مزید دلا سے بے باز رکھا۔

”یہ دھوے نہیں ابی، میرا عزم ہے کہ آپ کے چہرے پہ اعتماد کی وہی جھلک مٹ لا کے رہوں گا۔“ اس نے دل ہی دل میں ارادہ کیا۔ اگر وہ معطر کی فطرت سے اس طرح آگاہ نہ ہو چکا ہوتا تو یہ دھوکا کرنے سے واقعی باز رہتا کیونکہ کسی کی بھی مرضی اور فطرت کے بغیر اس کا تعاون حاصل کرنا اس کے نزدیک جبر تھا اور وہ جبر کے ذریعے بیوی سے قربانیاں مانگ کر پھر سے وہ کہانی دہرائیں چاہتا تھا لیکن..... معطر..... اس کے اعتبار کے سہارے ہی تو اس نے اتنا بڑا ارادہ کیا تھا۔

☆=====☆

اور یہ چہ میبے کی بات ہے۔

صرف چہ میبے۔

کہنے کو تو صرف چہ میبے ہیں لیکن کیا چہ میبے بدل چکا۔

خواجہ ہاڈس کے بہت سے پرانے مکین یہاں سے جا چکے ہیں۔ کچھ نئے مکینوں کا اضافہ بھی ہو چکا ہے۔ تین ماہ قبل معطر ہمایوں، معطر خواجہ بن کر اس کے آگن میں اتڑی تو ڈیڑھ ماہ پہلے نوٹس دینا کی گود میں آئی۔

عید الفطر کی صبح بنگلہ نہ خیر تھی۔ امی جان الماری سے بڑکدور نکال رہی تھیں۔ بڑی بھابی ڈرائنگ روم میں کھڑی دھلے ہوئے پردے سے ناگدور رہی تھیں۔ یہاں کی فضا کی صفائی دھلے کل ہی کر چکی تھیں جس کا اندازہ چم چم کرتی چروں کو دیکھ کر ہی ہو رہا تھا۔ نہ اور آواز اپنے اپنے باغوں پہ لگی مہندی کے رنگ کا مقابلہ کر رہی تھیں جو کل رات ہی چھوٹی چچی نے بڑی محنت سے منشی منشی ہتھیلیوں پہ لگائی تھی۔ انہیں ملقا بھابی کی طرف سے بار بار جلد تیار ہونے کی ہدایت مل رہی تھی۔ مدناز بھابی جو ہمیشہ ہی اس موقع پہ سب سے متحرک ہوا کرتی تھی، اب ریں ریں کرتے جلو اور جھیں جھیں کرتی نوٹس میں ابھی ہوئی تھیں۔ تین سالہ بلو منشی بین، ماں پہ قبضہ جمانے دیکھ کر احتجاجاً جاک بک اٹھتا تھا۔ معطر مکین میں شیر خرابے سے بچے بلوریں پیالوں پہ بادام اور پست کی ہوا بیاں چھڑک رہی تھی جب شفقہ خاتون اندر داخل ہوئیں۔

”بیٹی! تمہاری بھیلی عید ہے۔ سراسرانی میں اور تم بچن کی ہو کر بیٹھ گئی ہو۔ چلو شاپاش جلدی سے تمہارا دھوکا تیار ہو جاؤ تمہارے ابی نماز پڑھ کے آنے والے ہی ہوں گے، اس طرح دیکھ کے خفا ہوں گے۔ چلو چھوڑو سارے کام..... خیر سے تمہاری بھابیاں ہیں ناں۔“ وہ پہلے بھی ایک بار اسے تیار ہونے کا کہہ کر گئی تھیں۔ اب اسے وہیں براجمان دیکھا تو ذرا سختی سے ڈپٹ کر بولیں۔

”بس! امی! یہ رہ گیا ہے۔ مدناز بھابی نے ہی بتایا ہے شیر خرابا، بچے سو رہے تھے تو انہیں بھی موقع مل گیا، صبح سویرے ہی شروع ہو گئیں، اب دودھ پلانے لگی ہیں تو میں نے سوچا، کم از کم ٹھنڈا کر کے پیالوں میں ہی نکال لوں، نماز پڑھ کے آنے والے ہوں گے سب۔“ اس نے حسب عادت دو پنے کے پلو سے ہاتھ صاف کیا۔

”آف تو یہ یہ بچیاں بھی نہیں..... کہہ کہہ کر کھٹک گئی ہوں کہ تیار ہو جاؤ تیار ہو جاؤ۔ کان پہ چوں ہی نہیں رہ سکتی۔ اب زبردستی ہاتھ روم میں دھکیل کے آئی ہوں۔ سوچا ان کے نہانے تک بچن کی خبر لوں۔“ ملقا بھابی بھی اٹھ آگئیں۔ ”آپ بیٹھیں امی، ناشتہ بناتی ہوں آپ بھابی کام تو بچیوں کو تیار کرنے کے بعد ہی ہوگا۔“

”میں تو اپنے کمرے میں جا رہی ہوں بھابی! وہ دونوں نہیں لیں تو وہیں بھیج دیجئے گا۔“

میں تیار کر دوں گی۔ آپ دوپہر کے کھانے کا کام نہیں، بس لوگ آگئے تو اچھا نہیں لگے گا کہ گھر والے کچن میں گھسے بیٹھے ہیں۔“

”ہاں ہاں، بس میں بلاؤں گے لئے گوشت کی ہنسی رکھنے والی ہوں۔ کباب تو رات کو بنا لئے تھے۔ وقت کے وقت لالوں کی بڑا نقل بھی مہمانانے تیار کر دی تھی۔ ہاں وہ تم کیا بنا رہی تھیں رات کو مرغی کو کوسر کو غیر وہ لگے..... اس کا کیا کرنا ہے۔“

”رات بھر کے لئے میری نیت ہونے رکھ دی تھی۔ اب کوئی کام ہی نہیں۔ بس کھانے سے آدھ گھنٹہ پہلے ادوں میں روست کر دوں گی۔“

”عید مبارک..... عید مبارک۔“

باہر سے آتی آوازوں پر ماطر سر پٹ بھاگ کر اپنے کمرے میں گھس گئی۔ نہانے کے بعد سجیے بال یونی کلپ سے اکٹھے کر کے وہ کچن میں چلی گئی تھی۔ عید کا لباس سامنے ہی بند پہ پہلا تھا وہ اٹھا کے ڈریسنگ روم میں گئی۔ جلدی جلدی لائٹ سائیک آپ کیا مہندی سے ہے ہاتھوں میں گہری سبز نقاشی سے جی کا کاج کی چوڑیاں پہنیں۔ دوسری کلائی میں پہلے ہی دو منقش ٹنگن کی حسین لمبے کی یادگار بنے ٹھک رہے تھے۔ میراں کی طرف سے منہ دکھائی میں ملنے والا پتھہ وہ کسی بھی وقت خود سے جدا نہیں کرتی تھی۔ گرین جارجٹ کے سوٹ پہ پیچ ٹکڑے کے کنٹراسٹ کے ساتھ فل انیمز کا بڑا سا دوپٹہ لٹے وہ لاؤنج میں آئی۔ ابی کو سلام کر کے دو صیروں دعا میں او بیٹا رہینا، فرقان بھیا اور جبران بھیا کو بھی عید کا سلام کیا۔ ادھر ادھر نظرس دوڑائیں نہراں نہیں نہیں تھا۔

”مہلقا، آؤ بیٹی، مہمانانہ بھی بلاؤ۔ اپنی اپنی عیدی لے لو۔“ خواجہ صاحب نے سب بھوسوں کو پکارتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

”خواجہ بی! اذرا رک جائے..... میرا مطلب ہے دوسری بھی آنے والی ہوں گی۔ ساری بھوسوں اور پوتے پوتوں کو اکٹھے ہی عیدی دے دیتے۔“ حقیقہ خاتون نے ہلکھپاتے ہوئے انہیں ٹوکا۔ جو اب خشکیں لگا ہوں سے گھورتے ہوئے وہ کچھ کہنے ہی والے تھے کہ شاید موقع کی نزاکت کا خیال کرتے ہوئے خاموش رہ گئے۔

”واہ بڑی لمبی عمر ہے بسا آپ کی۔ ابھی یاد ہی کر رہے تھے ہم لوگ۔“ جبران دروازے سے ہی نعرے مارتا پورچ کی طرف لپکا۔ لقمان اور عمران کی گاڑیاں آگے پیچھے ہی اندر داخل ہوئیں۔

”آئینہ! میں نے کہا تھا ناں کہ تم بھی میرے ساتھ یہاں رک جاؤ۔ اتنا مزہ آیا چاند

www.pdfbooksfree.pk

مات کو۔ اپنی مہندی دیکھو ذرا کیسے خوبتی ہوئی ہے اور یہ دیکھو کتنی چچی نے کیسا پیارا ڈیزائن بنایا ہے۔“ آندہ کچن کو چڑا لگی۔ کچھ دن پہلے مہلقا بھائی اسی جان کے ساتھ بچوں کو عید دینے گئیں تو وہ تائی کے ساتھ ہی یہاں رہنے چلے آئی۔

”جاؤ نادرا! چچا کو بلا کر لاؤ۔ سب اکٹھے ہی ناشتہ کریں گے۔ لو بھلا تاؤ ذرا پہلے فون کر کے بتا دیتے تم لوگ بغیر ناشتے کے کھل رہے ہو میں اہتمام ہی کر چھوڑتی۔“ حقیقہ خاتون کے ہاتھ پر پھول گئے۔ ”انہوں نے تو دوپہر کے کھانے کا کہا تھا مہلقا کو۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ امی۔ ہم کوئی مہمان ہیں؟“ مہارہ کی شہد میں ڈوبی آواز پہ خواجہ صاحب نے چوک کر منہ جیتر نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ کہتی رہی۔

”بچے رات سے ہی اتنے اکیسا تھتے، سب جگہ ہوتے ہی جانے کا شور مچا دیا اس لئے ناشتہ رہنے دیا۔“

”اور ہمارا تو دل ہی نہیں چاہا عید والے دن بھی اکیلے بیٹھ کے کچھ کھانے کو، اس لئے عمران نماز پڑھ کے آئے تو میں نے ساتھ ہی نکلے کا کہہ دیا۔ آپ کیوں بڑی آپا کی پریڈ کر رہی ہیں۔ مل جل کے کچھ بکلا کچلا ناشتہ کر لیتے ہیں۔“ منجہب نے مہلقا کے پیچھے کچن جاتے ہوئے کہا۔

”جاؤ نادرا! کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو، کہا ہے ناں چچا کو بلا کر لاؤ۔ بھائی سے کبھو ملو پدیاں اور نہراں لے کر آئے۔ میرے بچے آئے ہیں۔“ خواجہ خلیل الرحمان کی خوشی سے مرشار آواز نے نہراں کے کمرے تک سڑکا۔ وہ مہمانیت سے سکر اویا۔

”میں جاتی ہوں ابی۔“ ماطر ویسے ہی جانے کو بے چین تھی۔ موقع ملے ہی کمرے میں چلی آئی۔

”یہ آپ اندھرا کئے کیوں بیٹھے ہیں۔ اس نے آگے بڑھ کر دبیز پردے ہٹانے کا ہے تاکہ روشنی ہو لیکن عقب سے اس نے جھٹکے کے ساتھ اسے کھینچ کر اپنے ساتھ لگا لیا۔

”جیساں بھائی رکھ دی۔ میں جتیاں بھجائی رکھ دی۔“

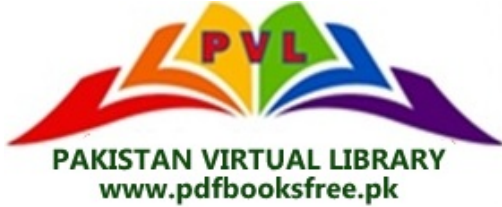
وہ شرارت سے ہولے ہوئے منگنا یا اور وہ جھنجھٹ گئی۔

”آپ یہ بات کبھی نہیں بھولیں گے..... ہے ناں۔“

”اب میری اک من لے لو.....“

اب میری اک من لے لو.....“

اس کی آواز میں شرارت اور زیادہ رہنے لگی تو ماطر نے معنوی خشکی سے گھورا۔



## شاید

محبت کو پا کر کھودینا اتنا بڑا سراغ نہیں ہوتا، اس کرب سے تو انسان گزری جاتا ہے۔ اس سے زیادہ اذیت ناک مرحلہ تب ہوتا ہے جب انسان پر اپنی محبت کو پالنے کے بعد یہ انکشاف ہوتا ہے کہ جسے چاہا تھا وہ کسی اور کی طلب میں دیوانہ ہے۔۔۔۔۔

اس لوکی کا قصہ جس نے ایک "شاید" کے خوف سے اپنی زندگی میں اندھیرے بھر لیے تھے مگر دوسروں کے ہاتھ میں "شاید" کا جگنو تھما کر ان کا راستہ روشن کر رہی تھی۔

www.pdfbooksfree.pk

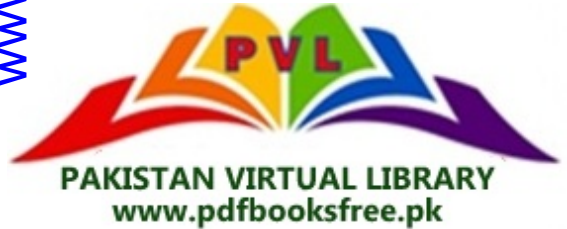
"اچھا طریقہ ہے عید مبارک کہنے کا۔"

"ارے تمہیں سامنے پائے تو میں سارے طریقے بھول جاتا ہوں میرے میاں مٹھو۔ میں تو آج تک ڈھنگ سے تمہارا شکر یہ تک ادا نہیں کر پایا۔

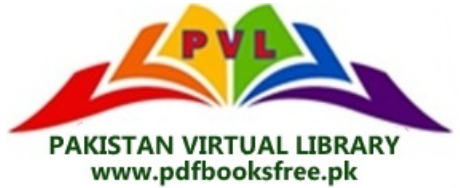
تم نے مجھے الہی کے سامنے سراٹھا کر بیٹھنے کے قابل کر دیا۔ میں سوچتا تھا کتنا مشکل ہے ان کا کھویا ہوا اعتبار لوٹانا لیکن تم نے سستی آسانی سے یہ مرحلہ سر کر لیا اور الہی بھی جان گئے، جنہیں ساتھ رہنا ہو، ان کے لئے بازو اور کھوادو جو جانا چاہے ان کے لئے روز و رات کھول دو۔ زبردستی کا ساتھ صرف بے زاری اور نفرت کو جنم دیتا ہے۔ دیکھ لو وہی بھابھیاں جو ایک دوسرے کو دیکھ نہیں پاری تھیں، آج ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے انکھی آئی ہیں۔ یہ تو دنوں کے سوئے ہیں۔ اس میں زبردستی کیسی۔ ہو سکتا ہے الہی کی طرح انہوں نے بھی کوئی خواب دیکھ رکھا ہو اپنے گھر کے لئے۔۔۔۔۔ الہی یہ بات سمجھ گئے ہیں بلکہ وقت انہیں سمجھا گیا ہے، اسی لئے انہوں نے مکمل سے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے۔ اب اچانک کچھ اور کھودینے کا خوف ان کی آنکھوں سے دور جا چکا ہے۔ انہوں نے برسوں پرانے خوابوں کو تھپکنا چھوڑ دیا ہے۔"

"اؤںہوں۔۔۔۔۔ چھوڑ دیا نہیں۔۔۔۔۔ طنائیں اب ہمارے ہاتھ میں تھما دی ہیں۔" معطر نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

☆=====☆=====☆







وہ میری محبت کا پہلا چہرہ ہے۔ نہیں وہ میری محبت کا ہر چہرہ ہے۔ یا شاید وہ تو میری محبت کا وجود ہے۔

میں نے اس سے محبت تب کی تھی، جب میں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔  
یا نہیں، نہیں، میں تو اس سے بھی بہت پہلے سے اس سے محبت کرتا آیا ہوں۔  
میں نے اسے ہر طرح سے چاہا ہے۔ میں نے اس سے ہر طرح کی..... ہر قسم کی محبت کی ہے۔

کیا محبت کی بھی تمہیں ہوا کرتی ہیں؟

شاید نہیں یا شاید ہاں۔

کہیں محبت عقیدت میں رنگی ہوتی ہے۔ کہیں جوگ کی بکھ مارے ہوتی ہے۔ کہیں عبادت کے وضو سے پاک ہوئی ہوتی ہے تو کہیں پاکیزگی کے نور سے دک رہی ہوتی ہے۔  
اور کہیں محبت، غرض کے کالے بالوں کے سائے میں دھندلائی ہوئی سی ہوتی ہے..... کہیں ہوس کی بدبو سے گھبرائی ہوئی ہوتی ہے۔ کہیں طلب کی تیش سے بھڑکی ہوئی تو کہیں خوابوں کی کرچیوں سے اندھی ہوئی آنکھوں پہ ہاتھ کھ کے چلائی ہوئی۔

میں نے اس سے ہر طرح اور ہر قسم کی محبت کی ہے کیونکہ میں تو اس سے اور صرف اس سے محبت کرتے رہنا چاہتا تھا۔ اس سے ہائپر زاوہ ہے۔

☆=====☆

وہ میری فرست کرن تھی۔ میری سگی تایا زاد مگر میں اپنی عمر کے آٹھویں برس اس سے متعارف ہوا۔ شاید بلکہ یقیناً اس سے پہلے بھی ایک آدھ بار اس سے ملا ہوں گا۔ مگر سرسری کیونکہ وہ اپنی ماما اور دادی جو کہ میری بھی دادی تھیں کے ساتھ ایبٹ آباد میں رہا کرتی تھی۔

دادی، پاپا، بے گے حد اصرار پہ سال میں ایک آدھ بار چند روز کے لئے ضرور آیا کرتیں مگر..... غریب! ہم لوگ بھی کبھی وہاں نہیں گئے۔ پاپا اپنے برس میں معروف اور ماما کے الگ معمولات میں چمچتوں میں اکثر تانا کے گھر کرچی ضرور چایا کرتا تھا۔ مگر دادی کے ہر بار بلائے پہ بھی ایبٹ آباد کبھی نہیں گیا۔ خدی تو میں شروع سے قحطی مریضی کے خلاف کوئی مجھے کسی بات کے لئے مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ بھلا اور جیسے ہنگاموں والے شہر سے اٹھ کے میں ایبٹ آباد کیوں جاتا جہاں کی ہوریت کے قصے میں ماما سے سن چکا تھا۔ دادی سے میری انسیت بس یوں ہی تھی۔ یوں بھی وہ کوئی قصے کہانیاں سنانے والی، لوری گانے سنانے والی یا طے کے بتانے والی اور دادی تو قصے نہیں، وہ تو ہر وقت نیا سنا دینا چھانکنے والی، چھڑی کا سہارا لے کر چلنے والی اور نمازیں وغینہ پڑھنے والی دادی تھیں۔ ان کا لاڈ بس یہی ہوتا کہ جہاں مجھے دیکھیں، ہاتھ کے اشارے سے پاس بلا کر ذرا کی ذرا اپنی تلاوت یا بیچ روک کر میرے چہرے پر چھوٹ ماردیتیں۔ ان کے کب ہمہ وقت حرکت میں رہتے چاہے بیچ ہاتھ میں ہو یا نہیں ہو۔ میرا تو خیال تھا کہ ان کے لیوں کو بٹنے کی عادت ہوگئی تھی۔ ضرور سوتے میں بھی وہ ہلے رہتے ہوں گے لیکن ایسا نہیں تھا وہ اٹھتے بیٹھے ہر وقت کسی نہ کسی درد میں معروف رہتیں۔ اگر ان سے کچھ پوچھا جاتا تو آنکھیں موند کے اسی قوازع کے ساتھ وہ پہلے اپنا درد مکمل کرتیں پھر جواب دیتی اپنے میں چاہے سوال کرنے والا ہورہے وہاں پلٹ جاتے۔ مجھے حیرت اس بات کی تھی کہ آئی ریٹنا خیل نے ان دادی جان کو کیا سوچ کر اپنی حفاظت کے لئے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ جب بھی وہ چند دن یہاں گزارنے آتیں، آٹنی کے فون پہ فون آتے.....  
”اماں! جلدی لوٹ آجے، بڑی گھبراہٹ ہو رہی ہے، اکیسے میں ڈر لگ رہا ہے وغیرہ وغیرہ“

دراصل بڑے پاپا یعنی میرے تاتا شادی کے دو سال بعد ہی وفات پا گئے۔ وہ شادی کے کچھ روز بعد لاہور سے ایبٹ آباد منتقل ہو گئے تھے۔ وہ جیلی برس سے ہنٹ کر کچھ کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ایبٹ آباد میں ایک بڑا عیالشان قسم کا ہوٹل قائم کیا، قایم اشاری طرز کا..... ان کا خیال تھا کہ اس ہوٹل کی تعمیر سے ایبٹ آباد بھی مریضی انسیت اختیار کر لے گا اور ان کا ہوٹل باذوق سیاحوں کی پہلی پسند نظرے گا لیکن وہ یہ دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہے۔ ہوٹل تو ان کے خوابوں کے عین مطابق بنا کر وہ اس کا نام اور اونچا ہوتا دیکھنے سے پہلے ہی ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال کر گئے۔ آٹنی راجیلہ نے اسی گھر میں زندگی کے باقی دن گزارنے کا فیصلہ کیا جہاں شوہر کی زندگی کے آخری دن گزارے تھے۔ پاپا نے ہوٹل کی

میمنٹ کی ذمہ داری اٹھانے سے معذرت کر لی۔ لاہور میں ان کا اپنا اتنا پھیلا ہوا برنس تھا۔ یوں بڑے پایا کا وہ خوب تعبیر کی صورت لینے کے بعد بھی بکھر گیا۔ ہوئی گیا، آگنی کے لیے یہ رقم زندگی گزارنے کے لئے کافی تھی۔ مگر بھی تھا، دادی ان کی تنہائی اور بیوی کا خیال کر کے ان کے پاس رہنے لگیں۔ پایا کے اطمینان کو اتنا کافی تھا۔ اسی لئے ہمارا وہاں جانا نہ ہونے کے برابر تھا اور ہاں بیچ زادہ کو جانا بھی شاید نہ جانے کے برابر تھا۔

اسے میں نے جب جانا، جب اسے پہلی بار دیکھا۔ ہاں میں دیکھنے ہی اسے جانے لگا تھا۔ شاید آپ کو یہ بات عجیب لگے کہ ایک آٹھ سال کا بچہ اور کسی کو پہلی نظر میں ہی جانے کا دعویٰ..... میں آٹھ سال کا ضرور تھا مگر بچہ نہیں تھا۔ میرے احساسات، میری سوسائیں اور میرے جذبات شروع سے ہی بہت پیچھے رہے ہیں اور وہ ہاں بیچ زادہ..... شاید وہ بھی میرے ہی جیسی تھی۔ اپنی عمر سے بہت آگے سوچنے والی اور اپنی عمر سے بہت بڑی شخصیت رکھنے والی۔ اسے دیکھ کر یہ بالکل ننگ رہا تھا کہ وہ اتنے بڑے سامنے سے گزر کر آئی ہے۔

میں سکول سے واپس آیا تو یہ جانتا تھا کہ آج ماں اور پایا ایبٹ آباد سے واپس آنے والے ہیں اور ان کے ساتھ ہی دادی اور ہانی بھی۔ آگنی راجیلہ کی تدفین اور قتل کے بعد وہ ان دونوں کو اپنے ساتھ لا رہے تھے۔ آگنی راجیلہ پہلے ہی ہارٹ ایک میں جا رہی تھیں۔

تیز دھوپ میں کار پورچ سے گزر کر جب میں وسیع لاؤنج میں داخل ہوا تو مجھے سب کچھ ٹھنڈا ٹھنڈا..... بڑے سکون سا محسوس ہوا۔ میں نے سامنے رکھے آف وائنٹ صوفے پر دادی کے کندھے پر سر رکھے بیٹھی اس کی لڑکی کو دیکھا جس نے ہلکے زریں مہین رکھا تھا۔ لاؤنج میں جلتی تین نیوب لائٹیں، بارہ قندیلوں والا فائوٹس اور دو آرائشی لیپ ٹھنڈے دیے کی صورت ہو گئے۔ سیاہی بھر بیٹھ گئی۔

”اوجڑا آسعد“ دادی نے مجھے تم کمرے سے دیکھ کر دوسرا ہانڈو کیا اور مجھے اپنے پاس بلایا۔ وہ یوں ہی ان سے چوکی رہی۔ نظر اٹھا کے بھی نہ دیکھا۔ وہیے تو میں دادی سے دور دور ہی مل لینا بہتر جانتا تھا لیکن اس روز یہ نہیں کیسے..... چیک ایک طرف رکھ کے، مٹنا طبی اعزاز میں ان کی طرف بڑھتا چلا گیا، انہوں نے بازو میں بھر کے مجھے اپنے دوسرے شانے سے لگا لیا۔ پایا اور ماں بھی سر جھکا کر بیٹھے تھے۔ میں نے دادی سے لپٹے لپٹے پھرے اسے دیکھا، اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھگا ہوا تھا اور میرے چہرے سے کئی آنچ کے فاصلے پر تھا، اس کے باوجود مجھے اس کے آنسو اپنے گال بھگوئے محسوس ہوئے۔

میری آنکھیں جلتے لگیں۔ اس کی سسکیاں سن کر میرے گلے میں پھندے سے اٹکنے

گلے، مجھے تھوک لگانا بھی دشوار محسوس ہو رہا تھا۔ ایک اس نے بیٹھی چلیکی اٹھا کے میری طرف دیکھا کہ ریز سے رو رو کے متحور ہوئی آنکھوں میں لال ڈورے تھے۔ میں نے آگنی اداسی اور کون نہیں دیکھی..... اب تک نہیں دیکھی جتنی اسی وقت، اس روز ان آنکھوں میں دیکھی تھی۔ میرے گلے میں لگا پھندا اچانک کل گیا۔ میری ہانگی بندھ گئی..... میں رونے لگا..... پتہ نہیں کیوں..... شاید میں ان آنکھوں کی دیرانی سے خوفزدہ ہو گیا تھا..... شاید ماحول کی افسردگی مجھ پر اثر انداز ہو گئی تھی۔

دادی نے میری کمرہ سہلائی، ہاں مجھے روتاد دیکھ کے سیدھی ہوئی۔ اس نے اپنی زہم اٹھیں سے پتے گال پر آنسو صاف کئے، میرے بال پیار سے سہلائے..... مجھے اور رونا آگیا۔ یہ میں آج تک نہیں سمجھ پایا کہ آخر میں رو یا کیوں تھا؟ آگنی راجیلہ سے میری دانگی نہ ہونے کے برابر تھی۔ آٹھ سال کے عمر سے میں اکاد کا سرسری ملاقاتیں یا پھر میری کھارونوں پر ایک آٹھ منٹ کی بات۔ اتنا زور و زنج یا زہم دل میں بھی کبھی نہیں کر سکا کہ دیکھ یہ یوں رونے بیٹھ جاتا۔ اچھی کچھ دن پہلے ہی تو آگنی کی ڈنڈہ کی خبر میں نے خاموشی سے سنی تھی اور ماں اور پایا کے ایبٹ آباد جانے کے بعد اکیلے کمرے میں دندنا تے ہوئے خوب بیٹھ بھی کئے تھے۔ وہ، دادی کے پہلو سے اٹھ کے میرے پاس آگئی تھی، اس نے میرا سر اپنے سینے سے لگا لیا تھا اور میرا ہاتھ جتے ہوئے مجھے چپ کر رہی تھی۔

”آگنی! اسعد بہت حساس بچہ ہے۔ ہاں؟“ اس نے کہا۔

میں ایک جھٹکے سے اس سے الگ ہو گیا۔

”ہانی! اسعد بہت مائنڈ کرتا ہے اگر اسے بچہ کہا جائے تو“ ماں نے جیسے اسے خبردار کیا تھا۔ میں نے بھی وارننگ دینی نظروں سے دیکھا۔ اس کی اداسی جلی آنکھوں میں جسم کی ہلکی سی لہر آئی۔ میرا سر ایک بار پھر سہلا کے وہ کہنے لگی۔

”ہاں یہ تو ہے۔ سحر کوئی بچہ توڑا ہی ہے۔ وہ تو بہت سمجھ دار ہے۔“ اور میں واقعی سمجھ دار تھا اس لئے بھاپ گیا کہ وہ مجھے سہلانے کے لئے یہ لالی پاپ تھما رہی ہے۔ ورنہ اس کا دیکھنے کا انداز، میرے بال سہلانا، پچکارنا ہوتا لہجہ..... یہ سب ظاہر کر رہے تھے کہ وہ مجھے بچہ سمجھتی ہے۔ مگر میں احتجاج نہ کر سکا۔ یہ میری پہلی غلطی تھی، تھکرا ڈالنے کی..... پھر زندگی بھر میں اس سے کوئی احتجاج نہ کر سکا۔ حالانکہ میں اس کا ہاتھ پرے جھٹک کے کہتا جاتا تھا۔

”میری بزرگ بننے کی کوشش مت کرو۔“

لیکن کہہ نہ سکا کہہ بھی دیتا تو کیا ہوتا۔ میرے کہنے سے ہمارے درمیان موجود آٹھ

سال سٹو نہ جاتے۔

ہاں وہ ہانیہ پھر زادہ، مجھ سے پورے آٹھ سال بڑی تھی۔

☆=====☆

وہ ایسی تھی کہ اس کو دیکھتے ہی میرا دل اس سے دوستی کرنے کو چاہنے لگا۔

حالانکہ میری آٹھ سال کی زندگی میں ایسا نہیں ہوا تھا کہ کسی کو دوست بنانے کی خواہش یوں یکا یک بھڑکی ہو۔ میں آہم آزاد تھان نہ تھی اپنی پسند، اس کے باوجود میرے دوستوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ اپنے کلاس فیڈرٹوں میں ذہنی طور پر خود سے بہت کم تر محسوس کرتے ہوئے گھبرا جاتا تھا اور شاید یہی گھبراہٹ ان پہ بھی طاری ہو جاتی تھی، جب وہ میرے منہ سے ایسی گفتگو سنتے جو ان کی عمر کے لڑکے شاید ہی کرتے ہوں۔

میرے پیارا کی عادت تھی کہ وہ ناشیہ کرنے فیصل پر پیشہ سب سے لیت آتے، میں سکول ان کے ساتھ ہی جایا کرتا تھا اس لئے اپنا بیک فاسٹ کر کے مجھے ان کا انتظار کرنا ہوتا۔ انہیں دس پندرہ منٹ میں بیک فاسٹ بھی کرتا ہوتا، نیز جیسے ہی پڑھنا ہوتا اور جب میں نے اس عمر میں انہیں نیز جیسے پڑھ کے سنانے کی ڈیوٹی اپنے ذمے لے لی جب مجھے روانی سے پڑھنا بھی نہیں آتا تھا۔ ایک دو ہفتے میں ہی میں بغیر اسکے انہیں انگلش اور اردو کے اخبار پڑھ کے سنانے لگا جب تک میرے دوسرے کلاس فیڈر حروف کو ملا کے پڑھنا ہی سیکھ رہے تھے۔

یوں میری اردو اور انگلش کی ریڈنگ سب سے بہتر ہو گئی۔ مجھے بھی اس کام میں حرحر آنے لگا۔ خود کو بڑا محسوس کر کے بہت اچھا لگتا تھا کیونکہ ظاہر ہے میری عمر کا تو کوئی بچہ اخبار پڑھنا ہی نہیں تھا۔ میرے نزدیک یہ بڑوں کے مشاغل میں شمار ہوتا تھا اور اگر میں یہ کرتا تھا تو ظاہر ہے کہ میں بڑا ہی شہرہ دار ہی ہوں۔ وہی سال میں مجھے یہ تک پتہ چل چکا تھا کہ کون سی خبر اہم ہے اور کون سی غیر اہم، کبھی خبریں سیاسی کہلاتی ہیں اور کون سی تجارتی اور کون خبروں کو حالات حاضرہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ اب تو کبھی کبھی پایا ہے کہ خبر پر دشمن بھی کرنے لگا تھا اور سکول جا کر بھی کلاس فیڈر سے تازہ پڑھی خبریں سنا کر اپنی قابلیت کا رعب بھجھاڑتا۔ وہ رعب میں تو کیا آتے، مجھے عجیب و غریب جان کر درد ضرور ہو جاتے، البتہ پھر میری جبرل نالچ سے خاصے متحاشش اور دیکھنے سکول میں ہونے والے کوثر پروگرامز، ڈیجیٹل ٹیوشن وغیرہ میں آگے کرتی رہیں۔ ان سرگرمیوں نے میرے اندر مطالعے کے شوق کو حرحر ابھارا۔ اب میں نے پایا ہے کہ اگر اپنے لئے شعوری بکس منگوانا شروع کریں۔ سنڈریلا، سلپیٹنگ بیوٹی، رامین ہڈ، اینڈر لینڈ ایک بار پڑھنے میں تو حرحر آیا لیکن اب وہ مجھے پور کرنے

www.pdfbooksfree.pk

لگیں۔ شاید انہیں پڑھنے سے میرے خود ساختہ ”بڑے پن“ کو محسوس پہنچتی ہو۔

میں حسن پرست بھی تو بہت تھا۔ مجھے تو پھر زبانی وہ پسند نہیں جو خوش شکل اور خوش لباس ہوں۔ جیسے میں ان کی گڈ بک میں تھا یا نہیں۔ مس مارے سے میں سخت خار کھا کر تا، حالانکہ وہ جبرل نالچ کی پچھڑیں اور میں اس سبکدستی میں بہت اچھا تھا۔ نتیجتاً مس مارے کا بھی فیورٹ سٹوڈنٹ تھا اور ساری کلاس میں سے وہ مجھ پہی زیادہ مہربان رہا کرتیں، مجھے ان کی مہربانی اور نرمی اور انہیں بھاتی تھی۔ قدرے سیاہ رنگت، باہر کو انگریزے گال، اندر کو جسنی آنکھیں، ٹیڑھے میز سے دانت اور موٹے موٹے ہونٹ جب وہ سکرا میں تو میرا دل چاہتا اپنی آنکھیں زور سے بند کرلوں۔ اس کے برعکس مجھے مس لٹل بہت پسندیں۔ جب کہ وہ محسوس کی پچھڑیں اور یہ وہ واحد سبکدستی تھا جس میں، میں کمزور تھا اور اپنی اس کمزوری کو دور کرنے کی خاص کوشش بھی نہیں کرتا تھا..... کر کرتا تو کلاس میں فرسٹ پوزیشن میری ہی ہوتی۔

مس لٹل کو میری ذہانت، حاضر جوابی، آئی کیو لیول اور اردو، انگلش کی ریڈنگ سے کوئی سرکار نہ تھا، ان کے سبکدستی کے لحاظ میں سے ایک غیر ذمہ دار، لا پرواہ اور خاصا ذفر سٹوڈنٹ تھا۔ وہ محسوس کو سیریس نہ لینے کی وجہ سے مجھے اکثر ذہنی و ذہنی دشمن، لیکن ان کی تمام تر ناپسندیدگی کے باوجود مجھے ان کی کلاس میں بیٹھنا اور انہیں دیکھتے رہنا پسند تھا اور یہ پسند جس بے ضرری تھی، محسوس ہی لیکن اس مصیبت کے باوجود میں کبھی کسی سے یہ نہ کہہ سکا کہ مجھے مس لٹل کے گالوں میں پڑنے والے ڈھیل کتنے پسند ہیں۔ جو مجھے میں لب بھجھ کر دیکھنے سے اور نمایاں ہونے لگتے ہیں اور جب کی روز انہیں غصہ نہ آتا تو میں صرف ان ڈھیل کو دیکھنے کے لئے کوئی نہ کوئی فضول حرکت ضرور کیا کرتا۔ میرا کوئی دوست ایسا نہیں تھا جس سے میں یہ راز شیئر کرتا اور نہ ہی اب تک مجھے دوست بنانے کی کوئی خاص ضرورت محسوس ہوئی تھی حالانکہ میں اپنے ہی کلاس کی واحد اولاد تھا لیکن مگر میں اور سکول میں اپنی تنہائی سے مطمئن تھا۔ یہ میری خود ساختہ بادشاہت تھی اور میں اس میں کسی کی مداخلت برداشت کرنے کی خواہش نہیں رکھتا تھا۔ میری کتابیں، میرا آئی ڈی، میرا کیرہ، میری ویڈیو میگز، میری سائیکل اور میں، سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ ایسے میں وہ ہمارے گھر آگئی اور میرے دل میں اس سے دوستی کی خواہش جاگ اٹھی۔

وہ ہانیہ پھر زادہ..... ایسی تھی کہ اسے دیکھتے ہی میں نے اسے دوستی کے رشتے میں بانٹنا چاہا۔ میں نے بتایا ہے تاکہ میں نے اس سے ہر طرح کی اور ہر قسم کی محبت کی ہے۔ تو یہ دوستی شاید ہی اب محبت کی تھی کہ جو آنے والے سال مجھ پہ آشکار کرنے والے تھے۔

میراجی چاہتا ہائی کا ہاتھ پکڑ کے اپنے کمرے میں لے جاؤں، اسے اپنی کتابیں دکھاؤں، اسے بتاؤں کہ اس کے پیر بالکل سنڈر بلا کے ہیروں جیسے نازک ہیں، اس کی رنگت بالکل سنو واٹ جیسی ہے اور اس کی آنکھیں بالکل ونڈر لینڈ کی ایٹس کی طرح کھلی ہوئی روشن ہیں..... اس کے ساتھ ویلے جو کیمزہ کیرم اور لوڈ وکیلوں اور اس سے ہارنا چلا جاؤں۔ وہ میرے کمرے کی صفائی، سلیٹ اور ڈیکوریشن سے خاصی امپریس ہوئی اور جب میں نے اسے بتایا کہ یہ سب میرا کارنامہ ہے تو وہ اور بھی حیران ہوئی۔

”زبردست، مجھے بہت خوشی ہوئی ہے جان کر کہ تم اتنے ڈسپلنڈ ہو۔“ شاید وہ ایک بار پھر پچہ کہتے کہتے رکی تھی۔

میں نے ساری کا کس اس کے آگے دھیر کیں اور سنڈر بلا اور سلیٹک بیوٹی سے اس کی ایسی ایسی نمائش تلاش کی، جو وہ خود بھی نہ جانتی ہوگی۔ خوش تو وہ خیر کیا ہوئی، البتہ حیران پریشان جی بھر کے ہوئی۔

”ہیں..... ہیں؟ یہ کیا کہہ رہے ہو سحر؟ آریو جوگ؟“ اس کی آنکھوں میں بے یقینی دیکھ کے میں قسم کھانے والے انداز میں اصرار کرنے لگا۔

”میں جی کہہ رہا ہوں ہائی! آپ اتنی ہی خوبصورت ہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔“ وہ ہنسنے لگا۔ میں پہلی بار اسے ہنسنے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہ بے ساختہ ہنسی چلی جاری تھی یہاں تک کہ اس کی شفاف آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔

”تو جاب..... جاب کو میں خوبصورت لگ رہی ہوں۔ بالکل سنڈر بلا کے جیسی..... یا بالکل باربی ڈول کی طرح۔“ اس کے لہجے میں پتا نہیں کیا تھا کہ مجھ پہ چاکا انکشاف ہوا، نہ صرف وہ میری بات کو مذاق سمجھ رہی ہے بلکہ میرا مذاق بھی اڑا رہی ہے۔ میرا دل بھگنے کے رہ گیا۔ سر ہماتی ہوئی آواز میں، میں نے ایک بار پھر کہا۔

”یقین نہیں کرنا تو نہ کریں، میں تو بھر بھی یہی کہوں گا۔“

اسے ایک بار پھر ہنسی آئی، مگر میری سنجیدگی دیکھتے ہوئے اس نے ہنسی سے گریز کیا اور اپنا سر ہتھیلوں پہ لٹکا کے بیٹھ گئی۔ میں اس کے بندھے ہوئے سیاہ رنگی بالوں والے سر پہ پھیلی لائی ٹائم وود سیاہیوں کو دیکھنے لگا۔ جن کے سرے بے رنگ، مگر چمک دار تھے۔ میں نے ہولے سے ان تانوں کو چھوا۔

”آپ نل پالش نہیں لگاتیں؟“

اُس نے سر اٹھایا۔ مسکراہٹ اب بھی اس کی سیاہ آنکھوں میں جھولنا چھو رہی تھی۔

”لگاتی ہوں..... مگر کبھی کبھار۔“

”آپ نماز پڑھتی ہوں گی شاید اس لئے۔“ میں نے قیاس کیا۔ اس کی آنکھیں ذرا سی پھیلیں اور بارو بلند ہوئے۔ میں نے مزید وضاحت کی۔

”نل پالش سے وضو نہیں ہوتا ناں۔“

”تھیں کیسے پتا آتی ہے بتایا؟“

”میں نے ابھی پچھلے دنوں اخبار میں پڑھا تھا ایک کالم میں لوگ ایسے ہی سوال کرتے ہیں، نماز، وضو دیکھ کر غلط۔“

”اور تم وہ پڑھتے ہو۔“ اس نے سوال نہیں کیا تھا بلکہ خود سے کہا تھا۔ ”آئی کانٹ بیو

اٹ، آئی جسٹ کانٹ بیو اٹ۔ تم اخبار پڑھتے ہو اور وہ بھی، مذہبی کالم سمیت۔“

”نہیں، ہمیشہ تو نہیں۔ میں زیادہ تر شارٹ اسٹوری یا جوگی، پنکتر وغیرہ پڑھتا ہوں۔

کبھی کبھی پاپا کو کوئی کالم پڑھ کے سنا دیتا ہوں ان کے کہنے پر اور لاسٹ سنڈے دادی نے مجھ

سے یہ کالم سنا ہے تو کہا تھا اس لئے یاد رہ گیا ہے اور پتہ ہے میں تو اکثر ماما کو مزے مزے کی

ڈشز کی رہی بھی پڑھ کے سنا ہوں، مگر ان کے پاس پکانے کا ٹائم ہی نہیں ہوتا اور صادق تو

اتنی سڑیل ہے کہ میری کسی بات پہ پکان ہی نہیں دھرتی، اپنی مرضی سے پکاتی ہے سب کچھ۔“

”انٹرٹیننگ، تم تو بڑے کام کے لڑکے ہو۔“ لفظ پچہ اس کی زبان کی ٹوک پہ پھٹنے کو تیار

بیٹھا تھا، مگر شاید وہ میری غلطی کے خوف سے سہماتا تھی۔

”میرا خیال تھا تم صرف کا کس پڑھتے ہو، لیکن لگتا ہے تمہیں مطالعے کا خاصا شوق ہے

اور مگر تمہیں اچھی اچھی بکس گفٹ کی جائیں تو تمہیں اچھا لگے گا۔ ہے ناں؟“

”کیا آپ مجھے بکس گفٹ کریں گی؟“ میں نے پوچھا۔ پھر اثبات میں جواب ملنے پر

فورانگی میں سر ہلا دیا۔

”نہیں، پہلے میں آپ کو گفٹ کروں گا۔“

”وہ کیوں؟ اچھا چاہتا ہوں بڑے ہواس لئے۔“ وہ مسکرائی۔

”مذاق مت کریں۔“ میں نے ٹوکا تو پل بھر کے لئے اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

”ہیٹا وہ سوچ رہی ہوگی کہ آخر مجھ سے کس طرح کا برتاؤ کرے۔

”اچھا چلیں، آپ پہلے وے دیجئے گا۔“ میں نے مفاسحت اختیار کی۔

”آفٹر آل۔ ایڈیڈ فرسٹ۔“

اس کی آنکھیں ایک بار پھر کھلیں۔ میں اسے خوش کرنے کے لئے یہاں لایا تھا لیکن یہ

☆=====☆=====☆

”ہیلو سدا کیا ہو رہا ہے؟“

گرمیوں کی چھٹیاں تھیں۔ میں دن کا زیادہ تر وقت کمرے میں ٹی وی دیکھتے ہوئے، گیمز کھیلنے ہوئے یا کس پڑھتے ہوئے گزارتا۔ شام کو میرا ٹیوٹر آ جاتا، دو گھنٹے اسٹڈی کے بعد میں پاپا کے ساتھ جم چلا جاتا۔ وہ ٹینس کھیلتے، فریڈز کے ساتھ کافی پیتے، میں سونگ کرتا جاتا۔ ہائی سے میری دوستی تو مگلو گی جی مگر کوئی خاص پروان نہ پڑھ رہی تھی۔ کم از کم میری نظر میں۔ میں اس سے جس دو چیز کا متقاضی تھا، وہ دینے سے قاصر تھی۔ ایٹ آباد میں وہ یف ایف ایس کے ایگزامز دے کر آتی تھی۔ یہاں آتے ہی اس کا رزلٹ بھی آ گیا۔ پری انجینئرنگ کے میٹرک سے وہ پورا آرتی تھی اور یہ اس کا جنون بھی تھا۔ انجینئرنگ یا پیوڈرٹی میں پڑھنے کے بعد وہ یوں پڑھائی میں بھٹ جاتی جیسے اگلے ہی ماہ فائنل ایگزامز دے کر انجینئر بنانے والی ہو۔ میں پڑھائی کے لئے اس کی سنجیدگی دیکھ کر حیران ہوتا اور ساتھ ہی خوفزدہ بھی۔ کہ بڑی کلاسز میں جا کر مجھے ایسی بھی خوفناک نظر آتے والی موٹی موٹی کتابوں کو دن سولہ سولہ گھنٹے تک پڑھنا پڑے گا۔ اسٹڈی کے علاوہ فی الحال اس کی اور کوئی مصروفیت نہیں لی اور نہ ہی میرے سوا اور کسی سے دوستی تھی۔ جب بھی وہ فارغ ہوتی، میرے پاس آ جاتی رہیں اس چند منٹ کی قوت کے انتظار میں سارا سارا دن گزار دیتا۔ میں اس بار پڑھتیاں گزارنے کراچی بھی نہیں گیا تھا اور شام کو پاپا کے ساتھ جانے میں بھی اتنا کافی کیا کرتا تھا لاکھ شام کو بلکہ سہ پہر کو دو گھنٹے سو گھر گزارتی تھی اور اس کے بعد نئے سرے سے تازہ دم ہر پڑھنے لگ جاتی، لیکن اس کے باوجود اس کے ساتھ چند منٹ گزارنے کے علاوہ مجھے کچھ نہ ہونے دیتا تو رنج و دینا اور پھر ایک دن اس نے مجھے شام کی جائے پیتے ہوئے ٹوک دیا۔ ”یار سدا! تم کس قدر دل ہو۔ سارا دن ٹی وی دیکھتے ہوئے پورے ہوتے؟ کیا ارے خیال میں دن بھر میں صرف دو گھنٹے اسٹڈی کے لئے کافی ہیں؟“

”جتنا ہمیں سکول میں پڑھایا جاتا ہے اس کے لئے تو دو گھنٹے بہت ہیں ہانی۔ کم از کم بے لئے تو بہت ہیں۔“ ایگزامز میں کچھ ایسا کراہم دے دیتا ہوں مگر وہ بھی صرف پاپا ماما کی لئے، تو ویسے اس کی بھی کوئی خاص ضرورت نہیں ہوتی۔“

”ہوں۔۔۔ اور دو کا فیڈلٹ۔۔۔ کا فیڈلٹ ہونا اچھی بات ہے مگر اور دو کا فیڈلٹ اور وہ بھی اسٹڈی کے لئے۔ زیادہ اچھی بات نہیں۔ میرا سکول میرے بھی اچھا رہا ہے، نہ پوزیشنز یعنی ری ہوں، لیکن کبھی یہ سوچ کر اسٹڈی کو پڑی نہیں لیا کہ۔۔۔ میں تو بس میں

دن اس کے لئے حیران ہوئے گا تھا۔

”اوکے بٹل مین۔۔۔ فریڈز شپ؟“ اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ جسے میں نے تھانے میں دیر نہ لگائی۔

”مجھے بھی کس پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ ہماری خوب گزرے گی۔ میرے پاس ابھی بھی اپنی کچن کی سب کچس محفوظ ہیں۔ میں وہ تمہیں پڑھنے کے لئے دوں گی۔“

”وہ کیوں؟ میں وہ کس کیوں نہیں پڑھ سکتا جو آپ اب پڑھتی ہیں۔“

”وہ کس۔۔۔ اچھا ٹھیک ہے پڑھ لیتا۔“ اس نے جان پھرانے کو ہاں مہری، اس کے خیال میں مجھے باصر کاظمی، پروین شاکر اور فرحت عباس شاہ کے شعری مجموعوں اور بشری رحمن اور بانو قدیر کے ناولز میں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی اور تب تک واقعی مجھے دلچسپی بھی نہیں۔

اس کے بعد میں نے اس کے ساتھ مختلف گیمز کھیلے اور جیسا کہ میں نے کر چکا تھا کہ اس سے ہار کے اسے خوش ہونے کا موقع دوں اور پھر ایک ایک میں اپنی کسی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ دانش طور پر اچھی خاصی بے وقوفیاں کرنے کے باوجود میں ہی ہر گیم جیت رہا تھا۔ میں اچھے کے رہ گیا۔ انجمن شاید میرے چہرے سے ہو رہی تھی جسے بھانپ کے اس نے پوچھا۔

”کیا بات ہے سدا! پورے ہو؟“

”نہیں۔۔۔ ٹائٹ ایٹ آل۔“ میں نے اس خیال سے کہا کہ وہ پوری دلچسپی سے کھیل رہی تھی۔

”تو پھر نہ کیوں انکار رکھا ہے۔ کم آن بار، جیتنے چلے جا رہے ہو پھر بھی خوش نہیں ہو۔“ اس کے کہتے ہی میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ میں نے بغور اسے دیکھا۔ مجھے اچانک خیال آیا کہ وہ کوشش جس میں میں ناکام ہو رہا ہوں، وہی کوشش وہ کامیابی کے ساتھ کر چکی ہے، یعنی جان بوجھ کر ہارنے کی۔

”اس لئے خوش نہیں ہوں کہ یہ جیت میری نہیں ہے آپ جان بوجھ کر ہار رہی ہیں۔“ وہ گھبرا گئی۔

”نہیں سدا! ایسی بات نہیں۔“ لیکن میں حریف کچھ سننے کے بجائے اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے سخت غصہ آرہا تھا۔

”پلیز سدا! دیکھو ناراض مت ہو۔ اچھا پراس۔۔۔ پراس کرتی ہوں اب ایسا نہیں ہوگا۔“ اس نے میرا ہاتھ قدام کے مجھے کھینچا اور میں سدا رضوان، جو ایک بار مجھے سے اکڑ جاتے تو اسے بہلانا ماننا نا ممکن ہو جاتا ہے۔ چپ چاپ گھٹنے ٹیک کے بیٹھ گیا۔

ہوں، مجھے اتنا سر کھانے کی کیا ضرورت؟“

”ہاں تو آپ کوئی فورٹھ اسٹینڈرڈ میں تو نہیں۔ اتنی تو موٹی موٹی کبس ہیں آپ کی، میری کبس تو ان کے آگے جتنی سی لیگیں کی، ان کے لئے دو گھنٹے کافی ہیں۔“ میں اپنی بات پہ اڑا رہا۔  
”بھرمی..... تمہاری کوئی اور ایکٹیوٹی بھی تو نہیں۔ جب دیکھو کش یا بیلہ پہ اوندھے لیٹے لیٹی دی دیکھ رہے ہوتے ہو۔ ٹیک لگ گی تا تو اگل جیدی لگو۔“ اس نے میرے بال اپنی انگلیوں سے بکھر دیئے۔

”آؤٹ ڈور گیمز بحث کے لئے زیادہ بہتر ہوتے ہیں۔ ان ڈور گیمز سے منسلک ایاتھ ڈیولپ ہوتی ہے مگر فری ہیکس بھی انسان کو فٹ رہنا چاہئے۔“

اس کے بعد میں نے چاہتے ہوئے بھی شام کو جم خانہ جانے کا تافہ نہیں کیا۔ البتہ دن کا ابتدائی حصہ بھی میں اپنے طریقے سے ہی گزارتا رہا، ہانی تو یوں بھی گھر پہ نہیں ہوتی تھی، پایا آفس اور ماما نے آئی ٹیوٹ، وہ کوننگ، پیٹنگ، پیویشن ٹریننگ، فلاور میکنگ وغیرہ وغیرہ جیسے آرٹ سکھانے والا ایک آئی ٹیوٹ کئی سالوں سے بڑی کامیابی سے چلا رہی تھیں اور اس وقت لاہور میں ان کے انٹرنیٹ کلاسز کا بیڑا بڑھتا تھا۔ مگر میں کئی تعلیمات میں تو وہ دو دشمنوں میں کلاسز شروع کر دیتا تھا، اس قدر رش بڑھ جاتا تھا۔ اگرچہ انہوں نے ہر ڈیپارٹمنٹ کے لئے ٹرینڈ پیپرز کی تھیں مگر پھر بھی وہ وہاں باقاعدگی سے جاتیں اور آفس ورک دیکھتیں۔

میں تو اب ان دونوں کی انتہا رہے کی مصروفیت کا عادی ہو چکا تھا اور بالفرض اگر کسی روز وہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک خلاف معمول کسی وجہ سے گھر پہ ہوتا تو مجھے عجیب سے چینی اور بے آرامی ہی محسوس ہوتی۔ مگر مانی کے سلسلے میں یہ بات نہیں تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ آج گھر پہ ہے مگر جیسے وہ میرے کمرے میں آئی، میں کل اٹھا۔

”ہیلو سدا! کیا وہاں ہے؟“

اس نے میرے برابر رکھا کونٹر کشن سیدھا کر کے ٹیک لگائی اور بیٹھے ہوئے میرے شانے پہ بٹلی سی دھپ بھی لگائی۔

”کچھ بھی نہیں، یہ ڈرامہ دیکھ رہا تھا۔ آپ آج گھر پہ؟“

”ہاں، آج میری کلاس پنک پہ جارہی ہے۔ سو میں نے سوچا، آرام کیا جائے۔“

”کیوں آپ کو پنک پینڈ نہیں؟ مجھے بھی بہت بورنگ ہے۔ فضول میں اتنے سارے

لوگ جمع ہو کر شور کرتے ہیں۔“

”خیر ایسی بات نہیں کہ مجھے پنک پینڈ نہیں ہے یا لوگوں میں وقت گزارنا اچھا نہیں لگتا۔“

www.pdfbookfree.pk

دراصل لمبے سر سے میری جان جاتی ہے۔ وہ لوگ منگلا ڈیم جا رہے ہیں اور پھر شکر پڑیاں کا بھی پروگرام ہے۔ مائی گاڈ، پنک کھٹے جانے میں، پھر پانچ کھٹے واہس آنے میں..... میں تو ایک ہی دن میں دس کھٹے کے سڑکا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ ویسے بھی کالج کس انتہائی خراب حالت میں ہے، پانچ کھٹے کا راستہ بھی مشکل سات کھٹے میں پورا ہوا ہوگا۔ اسی لئے صبح چار ساڑھے چار بجتے نکلے کا پروگرام تھا۔“

”اوگاڈ، یہ صبح تھوڑا ہی ہے، یوں کہیں کہ آجی رات کو جانے کا پروگرام تھا۔ اچھا! وہاں آف نہیں گئیں۔ ہم گھر پہ خوب انجوائے کریں گے آپ کی آج کی یہ چھٹی..... پنک تو انتہائی فضول سا کام ہے۔“

”تمہیں بروہ کام فضول کیوں لگتا ہے سعد! جو اس کمرے سے باہر نکل کر کرنے والا ہو۔“ اس کے اچانک سوال پہ میں سوچنے لگا کہ اس بات کا کیا جواب دوں۔ میرے کچھ کہنے سے قلم دوڑا ہوا لکھی۔

”پرسوں سنڈے ہے اور آج کل ہفتے میں دو تین دن تو ضرور بارش ہوتی ہے۔ دعا کرو، پرسوں بھی موسم اچھا ہو۔ ہم دونوں جلو پارک چلیں گے پنک منانے پھر میں تمہیں تھانڈا کی کر پنک بورڈ کام ہے یا حیرے کا کام ہے۔“ اور میں نے ہائی بھری۔

☆=====☆=====☆

”اتنی دیر لگا دی آج بیٹا؟“

میں پایا کے ساتھ سونگ کر کے واہس لوٹا ہی تھا کہ کچھ دیر بعد وہ آگئی۔ مجھے اسی وقت پتا چلا کہ دو بج کی یونیورسٹی کے لیے نکل گیا مگر کوئی ہے۔ ماما نے اسے دیکھتے ہی تانیر سے آنے کی وجہ پوچھی۔

”اور یہ کیا کچھ اٹھا رکھا ہے؟“ انہوں نے اسے مختلف سامان اٹھائے دیکھ کر پوچھا۔

”یہ سب..... یہ آئی کل کی پنک کی تیاری ہے۔ میں اور سعد کل پنک منانے جلو پارک جا رہے ہیں۔ آپ چلیں گی؟“

”میں؟ سو ری بیٹا، کل تو میرے انٹرنیٹ میں دن ڈس پارٹی ہے۔ یوں بھی چھٹی کا دن آرام کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ تم لوگ جاؤ، انجوائے کرو..... اچھا ہے صبح رہے گا۔ لیکن یہ سب تم کیوں لائی ہو؟“

”آئی! پنک کے لئے صرف پنک پہ جانا ضروری نہیں ہوتا، پنک کے دوسرے داڑمات بھی چاہیے ہوتے ہیں۔ صبح میں سب چیک کر کے کئی قسمی امداد سے بھی پوچھ لیا

کیا تھا بلکہ آسان نہ چھائے سر کی بادلوں کی موجودگی میں چلتی بھٹتی ہوا کس بڑی بھلی لگ رہی تھیں۔ ہم لوگ ناشتے کے فوراً بعد تقریباً نو بجے گھر سے نکلے تھے اور آدھ پون گھنٹے میں وہاں پہنچ گئے تھے۔ چھٹی کا دن تھا اور وہی ایسا سہانا اس لئے خاصی پسند آیا ہوئی تھیں۔

”ارے، یہ کیا بارش۔“ اچانک پھوار پر اس نے چونک کر کہا۔  
 ”لو ساری چٹک کا مزہ خراب۔ اب کیا گاؤں میں بیٹھ کے چٹک نمائیں گے۔“ میں نے ایک منٹ قبل پچھانی چٹائی تہہ کرتے ہوئے بے دلی سے کہا۔  
 ”کیوں؟ اس چھتری کو بھول گئے کیا؟“ اس نے رشید کو ابس پلٹنے کا اشارہ دیا۔

بڑی ہی رنگین چھتری کے نیچے خود کو گھسائے ہم دونوں سر سبز گھاس پہ بیٹھتے ہوئے دنیا جہاں کی باتیں کر رہے تھے۔ وہ مجھے اپنے بچپن کے قصے اور اہمیت آبادی یاد دیاں سناری تھی۔ میں سکول میں آنے سے روز روز مٹا ہونے والے اپنے اور دیگر کلاس فیلوز کے سر کے سنار ہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ ہاتھ آگے کر کے بارش کی تیز پھوار کو اپنی پھٹی پٹی جمع کرتی اور پھر جھٹک دیتی۔ دو تین بار اس کی یہ حرکت دیکھنے کے بعد میرا بھی دل چاہا یہ تجربے کرنے کو، اب جب جب وہ ہاتھ آگے کرتی، میں بھی کر دیتا۔ سارا دن کی یہ پھوار بس دس بارہ منٹ تک بری اور موسم کو مزید خوبصورت کرنے کے بعد غائب ہو گئی۔ ہم دونوں کو ہی جھوک ستاری تھی۔

ہانی نے چٹائی پچھانی، فروٹ باسکٹ ڈھنٹ ڈھنٹ پٹ اور ڈھنٹ پھول گھاس اور پھلیں نکال کر سجائیں۔ شپ، ریڈار آن کیا اور ہم اپنا شاندار رانچ کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اس کے بعد میرے اسرار کرنے سے یہ پوچھنے لگے کہ یہ بھی تیار ہو گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ جیسے وہ پانی سے خوفزدہ تھی اور اسی لئے پوچھنے لگے کہ یہ بھی تیار ہو گئی لیکن اپنی گھبراہٹ وہ مجھ پہ ظاہر نہ کرنا چاہ رہی تھی۔ بوٹ میں بیٹھتے ہی میں نے خود کو مزید برا بھروسہ کیا اور جب وہ سپیڈ تیز ہونے اور پانی کے جھاگ بلند ہونے پر گھبرا کے چھپے ہوتی تو مجھے اسے تسلی دیتے ہوئے اور ”ڈونٹ ڈری، میں ہوں ناں آپ کے ساتھ۔“ دہراتا اور بھی اچھا لگتا۔

”جائے پیو گے؟“ رشید کو ایک کپ چائے بھیجے کے بعد جب وہ اپنے کپ میں چائے قہر ماس سے انڈیل رہی تھی۔ اس نے سرسری انداز میں مجھ سے پوچھا۔ میں چائے کا عادی نہیں تھا لیکن اس وقت پتا نہیں کیوں میں نے سر ہلا دیا۔ شاید میں چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے خود کو برا ذاتیات کا پتا چاتا تھا۔

”کچن روٹر، ڈرم ان گلس اور سینڈویچز تو مزے کے تھے ہی مگر آپ چائے بھی بہت اچھی بناتی ہیں، باہیہ۔“ میں نے بالکل پاپا کے اسٹائل میں کہا، جب کبھی ماما اور پاپا شام کی

تھا۔ گھر میں نہ تو کوئی چٹک، باسکٹ جی نہ ہی کوئی چھوٹا وائٹر کولر۔ اب اگر گریوں میں چند گھنٹے باہر گزارنے ہیں تو واٹر کولر کا ہونا تو ضروری ہے۔ ایک یہ چٹک باسکٹ لی ہے اور ایک یہ چٹائی۔ یہ ڈیپنڈز بھلی واٹر گھاس، کپ اور پائلس۔“

”تم یونیورسٹی کے بعد راکٹ میں سر کھاتی رہیں؟ کمال ہے بیٹا! کیا یہ تمہارے کرنے والے کام ہیں؟ مجھے فون کر دیتیں، ڈرائیور سے منگوا کر گھر بھجوا دیتا۔ خیر بتاؤ اور کیا کیا چاہئے؟ میرے شیریے کل پہلی بار اکیلے چٹک پہ چارہ ہے ہیں، تیار کیا شاندار ہونی چاہئے، لسٹ بنا دو ابھی رشید سے منگوا دیتا ہوں۔“

پاپا کی آفر پہ اس نے تسلی سے بیٹھ کے لمبی چوڑی لسٹ بنائی۔ ان میں سے کئی چیزوں کے بارے میں تو مجھے پتہ ہی نہیں تھا کہ ان کا کیا کیا جانے گا۔ رشید اس کا مطلقہ بہ سامان لے آیا تھا اور وہ سارے دن کی محنت اتارنے کے بجائے کچن میں جا کر کل کی تیاری کر رہی تھی۔ ماننے اس سے کہ ابھی کہ وہ صادق سے بنانے کا کہہ کر خود آرام کرے مگر وادی سے منع کر دیا۔ ”رہنے دو نا رہ! میں دیکھ رہی ہوں کہ کتنے روز بعد وہ اپنے رنگ میں لوٹی ہے۔ آج لگ رہا ہے جیسے وہ اپنے گھر میں ہے، اپنے لوگوں میں۔۔۔۔۔۔ اسے یہ اپنا بیٹا جی بھر کے محسوس کر لینے دو۔ ہانی بہت سمجھ دار بچی ہے، اسے اپنے آسوپ پچھنے کا سلیقہ ہے، دیکھو، کس طرح وہ خود کو کچن کے دکھ سے باہر نکالنے کے لئے خود ہاتھ پیرا رہی ہے۔“

وادی کم ہی لمبی بات کی تھیں، مگر میں ان سے متعلق نہیں تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ہانی خود کو بھلانے کے لئے خوشیوں کے بھانے ڈھونڈ رہی ہے۔ مگر میں جانتا تھا کہ وہ مجھے خوش کرنے کے بھانے ڈھونڈ رہی ہے۔

میں نے بتایا تو کہ میں اس کی پہلی نظر میں جانے لگا تھا، پچھاننے لگا تھا اور اسی پچھان نے تو مجھے اس کے قریب جانے پہ مجبور کیا تھا۔ وہ بہت اچھی تھی۔ بہت ہی اچھی۔۔۔۔۔۔ بلکہ گزرتے سالوں نے یہ ثابت کر دیا کہ میرا اپنیہ جیڑا وہ بہت سلیمان علی جیڑا وہ کے بارے میں اندازہ صد فی صد درست تھا۔

پاپا کی پچھان پہ ہماری سواری نکلی۔ شاہانہ سواری، آگے رشید کے ساتھ والی سیٹ پہ ہانی کے ہاتھ کی بٹی کئی مزید ارچیزوں سے بھری ہوئی باسکٹ اور ہاٹ پاٹ رکھے تھے۔ پچھلی سیٹوں پہ ہم دونوں کے علاوہ اور بہت سا سامان رکھا تھا۔ مجھے دو لوگوں کی چٹک پہ ساتے ساڑو سامان کو دیکھ کر غشی آ رہی تھی۔ مگر وہاں جا کر اندازہ ہوا کہ ان میں سے کوئی چیز بھی فائو نہیں تھی۔ موسم خاصا خوشگوار تھا۔ صبح کے وقت پہلی ہوندا بائدری ہوئی تھی، مگر اس نے جس پیرا نہیں

”یہ بتاؤ کون سا پلے یا کون سا پروگرام تمہارا انجور ٹ نہیں ہے۔ جب دیکھوئی وی سے چپکے رہتے ہو۔“ اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ مگر میں نظر انداز کرتے ہوئے دل جیسی سے لی وی دیکھتا رہا۔

یہ 90 ویں دہائی کا پہلا سال تھا اور اگرچہ اس دہائی کے وسط تک ڈش انٹینا کی سہولت گھر گھر پہنچ چکی تھی، بلکہ اس دہائی کے اختتام تک کیبل کچر بھی فروغ پا چکا تھا جس نے ہر شخص کو بیک وقت سوچو چلو سے متعارف کروادیا تھا مگر یہ 1991ء تھا۔ ڈش انٹینا ابھی خاص تھا، عام نہیں ہوا تھا اور جہاں جہاں تھا یعنی جیسے کہ ہمارے گھر..... وہاں بھی تفریح سے زیادہ معلوماتی استعمال میں ہی آتا تھا۔

”واب تو ختم ہو گیا..... چلو آؤ لان میں چلتے ہیں، بڑا اچھا موسم ہو رہا ہے۔“ پروگرام کے ختم ہوتے ہی ہانی نے پھر کہا۔  
”کیا اچھا ہے.....“ اسی گری سے میں نہیں جا رہا اور نہ ہی آپ جانیں گی مئی۔“ ہانی سے رفتہ رفتہ اب وہ میرے لئے مٹی ہو چکی تھی۔

”واؤ..... بولڈ اینڈ دی یونی ٹل..... اس کا تو لاسٹ ایپی سوڈ بھی آپ کی درجہ سے کس کروا تھا میں نے۔“ میں نے دائیں تیز کر دیا۔ بولڈ اینڈ دی یونی ٹل ان دنوں اس چینل پہ چلنے والا سب سے مقبول سوپ تھا۔ اس کا ٹائٹل ہی چل رہا تھا کہ ہانی نے میرے ہاتھ سے ریوٹ چھینا۔

”تم یہ سب دیکھتے ہو؟ ہانی ہوں میں آئی کو اور اب بھی تمہارے کمرے سے ڈش انٹینا کا کنکشن اُترواتی ہوں۔“ اسے غصے میں دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔

”کیا یہ غلط نہیں ہے؟“  
”سعد! اس قسم کے پلے دیکھنا تمہارے لئے ٹھیک نہیں۔ کیا تمہارے ماما، پاپا کو علم ہے کہ تم یہ چینل دیکھتے ہو۔“

”وائے ناٹ..... ان ٹیکٹ ماما نے ہی کہا تھا کہ میں اس چینل کو ضرور دیکھ کر کیا کروں اچھی طرح ڈراما ز وغیرہ..... ان سے میری انگلیں اُپر دوہو گی۔“

”انگلش.....“ وہ سر جھٹک کر رہ گئی۔ ”صرف انگلش ہی کیوں؟ اور بھی بہت کچھ اہم رو ہو رہا ہوگا۔“

”وائے؟“ اس کی بڑبڑاہٹ تب میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔  
”ہانی نے لی وی دیکھا، مریخ خان والا پلے آ رہا ہے۔“ اس نے فی الحال مجھے سمجھنا ضروری

چائے کے وقت اکٹھے گھر پہ ہوتے اور مائیکلفا خوب چائے بنا تیں جب وہ یونی ایک سب لیتے ہی سر بلا کے یہ تفریحی گھلتا کہتے لیکن ہانی نے پہلا گھونٹ بھرتے ہی عجیب سا منہ بنا کے کپ رکھ دیا۔

”صرف یہ چائے ہی تھی، جسے بنانے کا کام میں نے صادق کو سونپا تھا اور یہ چائے تو قدامت بھی نہیں مئی۔“ میں شرمندہ ہو گیا۔

”اور ایک بات بتاؤ، تم مجھے ہانیہ کیوں کہتے ہو؟“  
”کیونکہ یہ آپ کا نام ہے۔“ میں اس کے عجیب سے سوال نما اعتراض پہ حیران ہوا۔

”ہاں وہ تو ہے لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ تم مجھے میرے نام سے پکارو۔“  
”نہیں، ضروری تو نہیں، مجھے یہ نام دیے بھی خاصا مشکل لگتا ہے، میں آئندہ سے آپ کو صرف ہانی کہہ کے بلاؤں گا۔“ میں نے طے کر لیا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور صاف لفظوں میں مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

”تمہارے خیال میں کیا یہ مناسب نہیں کہ تم مجھے نام سے بلائے کی بجائے کچھ اور کہو مثلاً بائی، آئی..... وغیرہ وغیرہ آخر میں تم سے بڑی ہوں اور خامی بڑی ہوں۔ دوسری بات یہ کہ مجھے نام سے پکارنے والے بہت ہیں، رشتے سے پکارنے والا کوئی نہیں۔ تم میرے نام کے ساتھ کوئی رشتہ لگاؤ مجھے تو مجھے اچھا لگے گا۔“

”آپ نے مجھ سے دوستی کی تھی اور دوستی میں کوئی بڑا چھوٹا نہیں ہوتا۔ اب اگر آپ کو خیال آ رہا ہے کہ آپ مجھ سے بہت بڑی اور سمجھ دار ہیں اور میں ایک بے وقوف سا لڑکا ہوں تو آپ بے شک مجھ سے دوستی ختم کریں۔“

”اچھا یعنی سوری، دیری سوری، آئندہ ہماری دوستی میں کوئی بھی بڑائی چھوٹائی والا معاملہ نہیں آئے گا۔ چلو اب موزیک کمرہ۔ میں یہ تھو بڑا دیکھنے کے لئے تمہیں یہاں نہیں لائی۔ چلو ایسا کرتے ہیں، اسکرینل نکالے ہیں۔“

”نہیں، سائیکلنگ۔“ میں نے اس کی بات رد کر کے اپنا مشورہ پیش کیا اور پھر یہ میری عادت بن گئی۔ میں ہمیشہ اس پر اپنی رائے قویٰ کی کوشش کرتا، اپنی مرضی چلانے کی ضد کرتا اور وہ ہمیشہ مان جاتی۔

☆ ===== ☆

”یہ میرا انجور ٹ پلے ہے۔“ میں نے اسے بتایا اور اس کے ہاتھ سے میگزین لے کر سا پلے پر رکھ دیا تاکہ وہ بھی پوری توجہ سے میرے ساتھ لی وی دیکھے۔



خیال نہیں کیا البتہ پچھل تبدیل کروانے میں ضرور کامیاب ہوگئی۔ اس کے بعد وہ اکثر چپک کیا کرتی کہ میں وی پی کی یاد دیکھ نہ پاؤں اور دیر ہو چو کہوں سی مودوی لکائی ہوئی ہے۔ کبھی بھی وہ خود مجھے سلیڈز پر انکس مودوی کے نام بتاتی اور پھر میرے ساتھ ہی بیٹھ کے دیکھتی، مختلف ٹرانس لکشن، کامیڈی یا پھر کارٹون مودوی۔

اس کے آنے سے اور کسی کو قرفظ بڑا ہوا نہ ہو، مجھے ضرور پڑا تھا۔ ماما اور بابا کی وہی مصروفیات تھیں، بلکہ اب ماما میرے متعلق اور بھی سے فکر ہو گئی تھیں۔ پہلے چوتھوڑا بہت دھیان انہیں میری اسلٹ پر اور صحت کے بارے میں رکھنا پڑتا تھا، وہ بھی دادی اور ہانی کی وجہ سے رفتہ رفتہ کم ہوتے نہ ہونے کے برابر ہو گیا۔

ہنسی اپنی اسٹڈیز میں پوری طرح سے انواو ہونے کے باوجود بھی میری طرف سے غافل نہیں ہوئی تھی۔ یہی لگاؤ اس کا دادی کے لئے بھی تھا۔ اپنے کمرے میں وہ صرف تب پائی جاتی جب پڑھ رہی ہوتی، بصورت دیگر وہ میرے ساتھ لان میں یا پھر دادی کے کمرے میں وقت گزار کرتی اور صرف کسی کی وجہ سے میں وادی کے پورے کمرے میں بھی گھنٹہ گھنٹہ بھر بیٹھا رہتا۔ ان دنوں میں ادویلوں کو ہاتھ، جب کہ وہ پی ای کے فاضل انگریجوں سے کر آج کل فراغت کے سزے لوٹ رہی تھی۔ میں سکول سے آکر سیدھا دادی کے کمرے میں چلا جاتا، جہاں وہ ان کے کبل میں دیکھی بیٹھی کانی پی رہی ہوتی یا چلوغزے کے کھا رہی ہوتی، اس نے میرے لئے ایک بندھن میں چلوغزے پھیل کر رکھے ہوتے جو وہ ہاتھ ملاتے ہوئے میری منہ میں منتقل کر دیتی۔ کھانا کھا کر ہوتے ہیں اسے سکول کی دن بھر کی رپورٹ دیا کرتا۔

اگرچہ میری اچھی دوست تھی، مگر اب میں اتنا کچھ دادرور ہو چکا تھا کہ اس سے کئی باتیں چھپانے لگا تھا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اسے میری کون سی بات ناگوار گزرے گی اور کس پودہ نوکے گی..... لہذا میں نے ایسی باتیں اس سے کرنا ہی چھوڑ دیں۔ پہلے میں نے بڑی چٹائی سے اسے کھل کے بارے میں اپنی پسندیدگی سے آگاہ کیا تھا۔ وہ سن کر بہت غصی تھی لیکن پھر اس نے مجھے نوکنا شروع کر دیا۔ صورت کی بجائے سیرت پودہ دینے کا کیکھر جھاننا شروع کر دیا۔ مجھے سیرت والا فلسفہ کچھ میں نہیں آتا تھا اور نہ ہی یہ بات کہ کسی خوبصورت چیز کو پسند کرنا اور بد صورت سے نفرت کرنا برا کیسے ہو سکتا ہے۔

میرے بیوہ کے آنے سے پہلے وہ خود میرا سارا کلاس ورک چیک کرتی، یہی وجہ تھی کہ اب بیوہ مجھے زیادہ توجہ سے پڑھانے لگے تھے، کیونکہ انہی اکثر ان سے اس بارے میں ڈسکس

کرتی تھی۔  
 اُس روز بھی سکول سے آنے کے بعد میں سیدھا دادی کے کمرے میں چلا گیا۔ دادی  
 تخت پر جا کر نماز پڑھا، کسی وظیفے میں مصروف تھیں اور ان کے بستر میں کمرنگ مکمل اوڑھے  
 وہ دم دراز تھیں۔ گھٹنوں کے سرے پر اس نے کوئی میگزین دکا رکھا تھا۔ شاید اسے سہاے کچھ بھی  
 پڑھ رہی ہو۔ اُس وقت ہی کونکلاس کے لیے بال بکٹے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی جی بجی لے ہوئے تھے۔ مجھے  
 اس کے بال بہت پسند تھے اور میں اکثر ہی اس سے انھیں کھار کھینے کی فرمائش کیا کرتا۔  
 ”پلیز جی! کم از کم آج کی پارٹی میں تو میز اسٹائل کچھ پیچ کر لو اور کچھ نہیں تو انھیں کھلا  
 ہی رہنے دو۔“

”بھئی، مجھ سے یہ مت کہا کرو۔“ وہ بال کھلے رکھنے کے تصور دے ہی گھبرا اٹھتی تھی۔  
 ”مجھے سخت پریشانی ہوئی ہے اس ہماڑ کے پھیلانے سے۔ میں اس ڈھلی ڈھالی چوٹی میں ہی  
 کفر خیل رہتی ہوں۔“

اور اب وہ دھلی دھالی چوٹی، بلکی، تار بجھی ہوئی خرد لائوں کی سورت ٹپکے آسانی تھپکے پہ پھیلی تھیں۔ سردی کی شدت سے اس کے گورے چہرے کی ساری گلابیاں ایک دہم برف ہو چکی تھیں اور سیاہ بالوں کے ہالے اور گہرے سرخی کھل کے سائے میں یہ سفیدی کچھ زیادہ ہی نمایاں ہو رہی تھی۔ اب بھی وہ مظہر مجھے یاد آتا ہے، تو برف پوش واڈیوں کے نظارے میرے تصور میں پھیل جاتے ہیں۔ میں شوز اتار کر کھل میں گھس گیا۔

”اوں ہوں پیچھ تو کر کے آؤ۔“ اس کے لوکنے کے باوجود مادے سستی کے میں نے  
سے من نہ ہوا۔ وہ مجھ سے آج کے ہجر کے بارے میں پوچھ گئی، میں اسی کے نیچے پر سر  
کے لینا، آہستہ آہستہ اسے بتانے لگا۔ میری آواز سست پڑنے لگی، لہجہ اٹکنے لگا، گلے بند  
ہونے لگیں..... شاید خندہ مجھ پر غالب آ رہی تھی..... اس کے بالوں سے آتی عجیب سی خوشبو  
مہک میرے حواسوں پر مڑھشت چھگی دے رہی تھی۔ آخر کار میں بارگیا۔ اب مجھ میں مزہ  
ایک لفظ کہنے کی سکت نہ رہی تھی۔ میرا سر جھولنے ہوئے اس کے شانے سے اٹکا۔ اس نے  
میرے اوپر کسل برابر کیا۔ میں بکلی خوشدلی کے زیر اثر تھا اور قریب تھا کہ گہری خندہ میں چلا جاتا  
کہ رادی کی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔

”سعد یہیں سو گیا ہے؟“

”جی..... پھر زور ہے ہیں۔ رات دیر تک پڑھتا رہتا ہے، اسی لئے آتے ہی کھانا کھائے بغیر سو گیا۔“

”اس سے کہہ دیتیں کہ اوپر اپنے کمرے میں جا کے سو جائے۔ خیر چلو تم تو اٹھو، سوئے دو اسے یا کم از کم اس کا سر ہی نیچے پر رکھ دو۔“

ان کے لہجے سے چھلکتی نگاہیں ناگواری محسوس کر کے میری نیند کے بلکڑے ذرا دم مہم ہوئے۔ مجھے لگا نہیں میرا اپنے بستر پہ سونا پسند نہیں آیا۔

”ابھی اس کی نیند بھی ہے، کہیں جاگ نہ جائے۔ ذرا دیر میں کرتی ہوں۔“ ان کے برعکس یعنی سر گھونٹوں کے انداز میں بول رہی تھی۔

”چلو اچھا ہے جاگ جائے۔ بھوکا سو گیا ہے اور وہ بھی اس طریقے سے..... نہ لباس تبدیل کیا نہ ہاتھ دھویا۔ میں جگاتی ہوں اسے۔“ اس سے پہلے کہ وہ مجھے پکار میں یا شانے سے پکار کے بلاتیں، بتنی کہہ رہی۔

”پلیز دادی! اسونے دیں۔“ اس نے شاید میرے اوپر بازو پھیلا دیا تھا۔ کسل کی دیر تہہ کے اوپر مجھے اس کے ہاتھ کی نری محسوس ہوئی۔

”ہانی! نا سمجھ مت بنو۔ واضح الفاظ میں سمجھا رہی ہوں کہ تم بچی نہیں، نہ ہی سدا بچہ رہا ہے۔ اس طرح کی بے تکلفی، بے جوابی کے زمرے میں شمار ہوتی ہے۔ تمہارا اس کے ساتھ اتنا قریب ہونا مجھے بالکل پسند نہیں، جذباتی وابستگی ایک الگ چیز ہے، اس پہ مجھے اعتراض نہیں مگر یہ لیٹنا، جھنڈنا..... میں ایسے الفاظ استعمال تو نہیں کرتا جی جتنی کمرے میرے اشاروں کنایوں کو سمجھتی نہیں پار ہیں۔ اب کیا یہ ٹھیک لگ رہا ہے اس کا تمہارے شانے پہ سر رکھ کے سونا، بہر حال وہ تمہارا نامحرم ہے۔“

سنجیدگی سے ان کا بیان اتنی ہالی آہستہ سے نفس دی۔

”نامحرم؟..... دادی..... نامحرم اور یہ سعد..... یہ اتنا سا؟“

”میں نے کہہ دیا کہ سعد اب اتنا نہیں رہا۔“ عام حالات میں مجھے دادی کا یہ اعتراض برا خوش کن لگتا۔ مگر وہ جس طرح کہہ رہی تھیں ایسا لگ رہا تھا جیسے برا ہونا کوئی جرم ہے جس کی پاداش میں مجھے ہانی سے دور رہنے کی تعویذ سنائی جانے والی ہو۔

”پلیز دادی! آپ تو کبھی ایسی باتیں نہیں کرتی تھیں۔“ اس کے لہجے میں بھی وہ گہرا ہمت تھی، جس نے انکا کی مجھے گہرا لپٹا۔

اس کے لہجے سے چھلکتی ناگواری اس بات کا ثبوت تھی کہ اسے بھی دادی کی یہ بات بالکل پسند نہیں آئی۔

”نہ میں اس کی معصومیت پہ شک کر رہی ہوں نہ تمہاری پاکیزہ نیت پر، یہ ایک اصولی

بات ہے اور یہ اصول میں نے یا تم نے وضع نہیں کئے۔ یقیناً ان میں کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہوگی۔ اگر سعد معصوم ہے تو اسے معصوم رہنے دو۔ اس کی عمر گہری اور معصومیت کو کسی امتحان میں مت ڈالو۔“

”میری سمجھ میں آپ کی باتیں نہیں آ رہیں۔“ اس نے نرمی سے میرا سر کھٹکا کے نیچے پہ کیا۔ میں ذرا سا کسمسا..... احتجاجاً۔

”ضروری نہیں کہ جو بات سمجھ میں آجائے وہی مانی جائے۔“ یہ دادی کا کہنا تھا مگر میرا نظریہ مختلف تھا۔ ہانی کی فطرت یہ ہو سکتی تھی کہ وہ دادی کے نظریے سے متفق نہ ہونے کے باوجود آرام سے ان کی بات مان لگی مگر میں جب تک کوئی بات نہ ماننا تھا جب تک مجھے یقین نہ آ جاتا کہ یہ بات ماننے میں میرا کوئی فائدہ ہو سکتا ہے۔

☆=====☆=====☆

ہنی نے مجھے اپنی کتابیں پڑھنے کی اجازت کی یاد دی کہ مجھ پہ ایک اور درکل کیا۔ پروین شاکر کی ”خوشبو“ دیر تک میرے اندر کومہکانا رہی۔

چہرہ میرا تھا، نگاہیں اس کی خاشکی میں بھی دو باتیں اس کی

اس میں ایسا کیا تھا جو میں سمجھ نہ پایا۔

نہ شام ہے نہ چھٹی رات ہے نہ پچھلا پھر عجیب رنگ تیری جہنم رنگیں سے ملیں

اس کی آنکھوں کی سرمئی سیای اور چہرے کی گامیاں مجھ پہ مکمل سی گئیں۔ وہ مجھے بہت حسین، بہت دلکش، بہت منفرد اور بہت اچھوتی سی لگنے لگی۔ اسے مسکراتا دیکھ کر میں خوش ہوتا..... اس کی اداسی پہ مجھے غصہ آتا لگتا۔ ہر اس چیز پہ جو اس کے غصے کا باعث ہو سکتی تھی۔ وہ میری تعریف کرتی تو اپنے آپ پہ فخر ہونے لگتا..... کسی بات پہ ٹوک دیتی تو ہفتوں خود سے شرمسار رہتا۔

میں نے جان لیا کہ میں اس سے پیار کرنے لگا ہوں۔

مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے۔

ہانیہ بچہ زادہ سے..... جو مجھے اچھی تو بہت پسین لگتی تھی، جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا، مگر ان سات سالوں میں وہ میرے اتنے قریب آجائے گی اس کا اندازہ مجھے اس وقت نہ ہوا تھا۔ یہ محبت ہی تو ہے، یہ محبت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ مجھے پورا یقین تھا۔ میں..... سعد

رضوان بیزارادہ پندرہ برس کی عمر میں محبت کے بارے میں چند تفلیمیں پڑھ کے اور کچھ تفلیمیں دیکھ کر گویا محبت کی ساری غلامی سمجھنے کا دعویٰ کرنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ مجھے اس سے بچی محبت ہے۔

مجھے یقین تھا کہ وہ بھی ضرور مجھ سے محبت کرتی ہے مگر کسی فلم کسی ڈرامے یا کسی افسانے میں کسی لڑکی نے خود محبت میں پہل کی ہے جو وہ کرتی؟

مجھے یہ بھی یقین تھا کہ جیسے ہی میں اسے اپنے دل کی ساری بات بتاؤں گا وہ ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ آنکھیں پت پٹا کر دے جائے گی۔

مجھے یہ بھی یقین تھا کہ کم دنوں کے ایک ہونے میں بظاہر کوئی رکاوٹ نہیں سوائے میری کم عمری کے اور وقت گزرے میں کیا ہو سکتی ہے۔ یہ پتہ نہیں چلے گا اور ایک کے بعد دوسرا دوسرے کے بعد تیسرا سال گزرے گا۔ میری ایجوکیشن کمپٹ ہو جائے گی..... اور نہ بھی ہو تو کیا فرق پڑتا ہے..... بس زیادہ نہیں تو میں، انکس کا ہی ہواؤں تو پاپا سے کہہ دوں گا کہ سنی سے میری شادی کرادیں۔ بس یقین بھی تھا کہ پاپا میری بات مان جائیں گے۔ زندگی کو سوچنا کتنا بھل ہے اور سوچ ہی سوچ میں زندگی بھی کتنی بھل لگتی ہے۔

☆=====☆=====☆

”ہانی! میری تو خواہش تھی کہ تمہارا رزلٹ آتے ہی یہ کام شروع کر دیتی، مگر تمہاری جاب کی خد کے آگے تمہارے انکل ہار گئے۔ اب پرنسپل لائف میں آئے ہوئے بھی تمہیں ایک سال تو ہونے ہی والا ہے اور میرے خیال میں تمہارا یہ شوق خاصی حد تک پورا ہو چکا ہوگا، اس لئے میرا اور تمہارے انکل کا فیصلہ ہے کہ اب تمہاری شادی کے سلسلے میں شادی کی سے کچھ سوچا جائے۔ ان کے ایک دوست نے اپنے بیٹے کے لئے بات کی ہے۔ اچھا لڑکا ہے، تمہاری طرح انجینئر ہے، اپنی کمپنی ہے، ویل ٹون ٹیلی، ویل میٹرو، گڈ لک، ہم پہلے اسے اور اس کی فیملی سے مل لو اور سوچ مجھ پر اپنی رائے دے دینا، تاکہ کم بات آگے بڑھا سکیں۔“

اس روز چھٹی کی وجہ سے ہم سب ہی ناشتہ پکارتے تھے جب ماما نے ڈبل روٹی پیچ لگاتے ہوئے یہ تفصیلی بیان ایک ہی سانس میں دہرا دیا۔ اگرچہ ماما بھی ہانی کے ساتھ ایک مشتاق ماں تو درکنار ایک دوست نما مہربان آہنی کی طرح پیش نہیں آئیں مگر ان کا رویہ بہت درشت یا لئے دینے رہنے والا بھی نہیں تھا، اس کے باوجود وہ نہ جانے کیوں ماما سے خائف رہا کرتی۔ ان سے بحث کرنے یا سوال کرنے کا تو اس نے کبھی سوچا تک نہیں تھا۔ جاب کرنے کی خواہش بھی اس نے پاپا سے ہی بیان کی تھی۔ اب بھی وہ خاموشی سے سر جھکانے ان کو سختی رہی۔

میرے اندر طیش کا ایک اُبال اٹھا میں جھج جھج میں بیٹھ کر، بیڑہ ٹھوکر کے ساتھ چھپے گھبنے کے بعد تیز قدموں کے ساتھ باہر نکلے گا۔ سب نے مجھے حیرت کے ساتھ دیکھا۔ میری پشت سے پاپا کی آواز آئی، وہ مجھ سے اس بد نظیری کی وجہ پوچھ رہے تھے۔

”آپ سب کچھ مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں پاپا؟ آپ نے ماما سے پوچھا کہ وہ یہ سب کیوں کر رہی ہیں؟“ میرے جوابی سوال میں وہ حیران ہوئے۔

”کیا مطلب؟ تمہاری ماما نے تم سے تو کچھ نہیں کہا، وہ ہانی سے بات کر رہی تھیں۔“

”میں تو میں کہہ رہا ہوں کہ کیوں کر رہی ہیں وہ یہ بات؟ ہانی کی مرضی کہ وہ جواب کرے یا کچھ اور..... ایک سال کرے یا دس سال۔ اس کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ ماما کس طرح کر سکتی ہیں؟“ ماما کے تو شاید وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں اس طرح کا کوئی واضح اعتراض کر سکتا ہوں۔ وہ ہلکی سی ہونٹیں۔ دادی کے چہرے پہ بھی ناگواری تھی اور ہانی یوں ہی الجھی الجھی بیٹھی تھی، کچھ کچھ خوفزدہ سی۔

”تم ان سدا! تمہاری ماما نے کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ ظاہر ہے آخری فیصلہ ہانی کا ہوگا۔ تم نے سنائیں کہ انہوں نے اسے ارسلان سے اور اس کی فیملی سے ملنے کا کہا ہے۔“

”کیا کہا ہے ماما؟“ میں نے اپنی بات کا ٹکڑا دی۔

”نہی کہ، وہ سوچ سمجھ لے اور جواب دے تاکہ بات آگے بڑھائی جاسکے یعنی دوسرے لفظوں میں یہ کہ ہر حال میں جواب ہاں میں ہی دینا ہے۔ اسی طرح قوت آگے بڑھ سکے گی۔ وہ یہ بھی تو کہہ سکتی تھیں کہ سنی کے جواب کے بعد فیصلہ ہوگا کہ بات آگے بڑھائی جائے یا ختم کی جائے۔“

”ختم کر دہت ہو گیا۔“ ماما کے ہبر کا کیا نہ لبریز ہو گیا۔

”سعد رضوان، تم اپنی حد پار کر رہے ہو۔“ انہوں نے مجھ سے کہا، لیکن شعلہ بارنگا میں ہانی پر مرکوز تھیں جنہیں محسوس کر کے اس کے ہاتھ میں تھما جائے گا کپ بکا سارز گیا۔ میں اس ”عزت افزائی“ پہ احتیاجا داک آؤٹ کر گیا، لیکن میرے کمرے کے ادھ کٹے دروازے سے وہ ساری بحث مجھے آسانی سنائی دے رہی تھی۔ اب ماما، دادی کی حمایت حاصل کرنے کے لئے دلائل دے رہی تھیں۔

”کیا غلط کیا میں نے؟ کیا بانی ہماری ذمہ داری نہیں اور کیا بھائی زندہ ہوتیں تو وہ ایسا کچھ نہ کرتیں، بلکہ شاید اب تک کر بھی چکی ہوتیں، ہماری فیملی میں کب لڑکھان اس طرح دوسروں کی ملازمت کرتی پھرتی ہیں۔ اسے رضوان نے کہا تھا، کہ وہ کام کرنا چاہتی ہے تو ان

کی فرم جوائن کر لے لیکن ہائی کو ضد سوار تھی، اپنے بل بوتے پہ کچھ کرنے کی، یہ سوچ کر ہم دونوں نے اجازت دے دی کہ اس کے دل میں خیال نہ آنے کہ اس کی خواہشات کا احترام نہیں کیا جاتا۔ اب بھی اتنا اچھا پروپوزل، میں جانتی تو آٹھ ہند کر کے ہاں کر دیتی مگر میں نے پوری آزادی دی کہ وہ سوچ کچھ کر فیصلہ کرے۔“

”تم ٹھیک کر رہی ہو مگر اس میں ہائی کو قصور وار کیسے ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ اس نے تو کچھ نہیں کہا جو تم اس پہ مگر رہی ہو یا گلہ کر رہی ہو۔“ دادی کو پسند نہیں آیا کہ وہ ان کی لاڈلی پوتی پہ خفا ہوں۔

”تو آپ کا خیال ہے سعد یہ ساری کوساں بلا وجہ کر کے گیا ہے۔“ ان کے کہنے پہ میں چونک گیا۔

”بھلا ما کو کیسے پتا چلا کہ.....“

راز کھل جانے کے احساس سے میں خوفزدہ نہیں ہوا بلکہ بک سا ہو گیا لیکن ماما..... وہ تو کچھ اور کہہ رہی تھیں۔

”ہائی نے ہمیشہ اپنے اور میرے درمیان فاصلے رکھے ہیں۔ میں سعد کی ماں ہوں لیکن جذباتی طور پہ وہ اپنے باپ کے زیادہ قریب رہا ہے، لیکن جب ہائی اس گھر میں آئی تو مجھے لگا کہ میری زندگی میں ایک بچی کی کی پوری ہو جائے گی مگر اس نے کبھی مجھے ماں تو کیا..... کچھ بھی نہیں سمجھا۔ کبھی مجھ سے کچھ نہیں کہا..... کوئی فرمائش، کوئی ضرورت، کوئی شکایت..... کچھ بھی چاہنے ہوتا ہے اکل سے کبھی، اپنی دادی سے کبھی جیسے میں..... میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ اس کی کچھ نہیں تھی۔ یہ صرف اپنے چچا کے گھر میں رہ رہی ہے اسے کچھ بھی چاہنے ہوتا، کوئی بھی بات منوانا ہوتی یہ صرف رضوان سے کبھی اور اب بھی نہیں ہوا ہے۔ اگر اسے اس جگہ شادی نہیں کرنی، یا..... یا اس کی کوئی اور مرضی ہے تو اسے مجھ سے بات کرنی چاہئے تھی، مجھ پہ اعتماد کرنا چاہئے تھا۔ آخر میں اس کی ماں کی جگہ لیکن اس نے سعد کے ذریعے یہ بات پہنچائی ہے اور بہت غلط طریقے سے پہنچائی۔ وہ ابھی بچہ ہے اور اسے ان معاملات میں مہمیت کر ہائی..... تجربے انہیں نہیں کیا۔“

ماما کی اتنی طویل بات میں میرے لئے بہت سی تکلیف وہ باتیں تھیں۔ ایک نہیں..... بہت سی۔

میں بے چین ہو کر اٹھا اور ادھ کھلے دروازے سے ڈائننگ ٹیبل کا منظر دیکھنے لگا۔ ہائی اپنی کرسی سے اٹھ کر ماما کے گلے لگ گئی تھی اس نے ان کے پیچھے سے اپنے بازو ان کی گردن

میں جا مل کر رہ گئے تھے اور اپنا گال ان کے گال سے ملائے آنسو بہا رہی تھی البتہ اس کی آنکھوں سے کہیں نہ لگ رہا تھا کہ یہ آنسو کی تکلیف یا رنج کی وجہ سے نکل رہے تھے بلکہ اس وقت ان آنکھوں سے ایک اونی چمک ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ سرت سے کپکپاتے لہجے میں ماما کو یقین دلارہی تھی۔

”آخری ایسی کوئی بات نہیں..... میں نے کبھی اس فاصلے کو دانستہ برقرار رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ اس کو اتنا سا احترام ضرور کروں گی کہ اس فاصلے کو پانے کی بھی کوشش نہیں کی۔ چاہئے کہ باوجود بھی اور اس کی وجہ صرف میری جھجک تھی اور آپ سے کچھ کہنے، کسی فرمائش کے کرنے کی نوبت ہی کبھی نہیں آئی، آپ نے میرے بغیر کبے میری بر ضرورت کا دھیان رکھا بالکل ایسے جیسے کوئی ماں رکھتی ہے۔ اسی طرح شکایت کرنے والی کوئی بات ہوتی تو کرتی، رہا سوال جا ب کے مسئلے پہ آپ کے بجائے اکل سے بات کرنے کا معاملہ تو دادی کا کہنا تھا کہ شاہد اکل کو میرے چاب کرنے پہ اعتراض ہو سالیے میں نے ان سے اپنی خاموشی ظاہر کی اور پلیز آئی! آئی سوز، سعد سے میری اس بارے میں کبھی کوئی بات نہیں ہوتی۔ اگر مجھے اس سلسلے میں کوئی بات کرنا ہوتی تو میں دادی یا آپ سے کروں گی۔ میں نے ہی اکل شادی کے بارے میں کچھ سوچا نہیں تھا پسند نا پسند کا سوال تو بعد میں اٹھتا ہے۔ سعد تو بس.....“

”لیکن اب وہ اتنا بھی نہیں رہا کہ بات کو سمجھ نہ سکے۔“ ماما نے اس کے کال ختہ پتہ کے اپنی ناراضی ختم ہونے کا مسئلہ دیا اور پھر سے مجھے موضوع بحث بتایا۔

”آج نہیں توکل، یہ کام تو ہونا ہی ہے۔ کیا اس کی ضد کی خاطر تمہیں مگر بٹھاے رکھیں گے کہ کبھی، سعد رضوان کی مرضی سے، وہ ہائی کو روک دینا دیکھ سکتا۔“

”افوہ، ماما کو آخری سی بات سمجھ میں نہیں آئی، ویسے بہت قائل بنتی ہیں۔ کیا حرج ہے اس میں اگر وہ میری خاطر ہائی کو گھر میں رکھ لیں، اس گھر میں..... ہمیشہ کے لئے..... میری خاطر۔“

میں سوچتا رہا اور رستہ راہ، اختیار، اور سوچتا رہا۔

”آخری آپ کی جائے بالکل غلطی ہو گئی ہے۔“ ہائی نے اس موضوع کو ختم کرنے میں جھلک کی اور وہ کہا جس کی میں اس سے توقع کر رہا تھا۔

”یہ چاہئے لیجئے اور کس اب یہ فکریں چھوڑ دیں۔ میری جانب سے پلیز، پلیز کسی قسم کا کوئی اندیشہ ذہن میں نہ لائیں جو اب بہتر سمجھتی ہیں میرے لئے وہی لیجئے اور سعد کی بات چھوڑیں، وہ بہت جذباتی ہے اور کچھ نہیں۔“

”نہیں! ہائی! اور سرکل اور منہ پٹت تو شروع سے ہی تھا اور اس کا آج کا رویہ دیکھ کر

مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ میں نے اس کی ذمہ داری سراسر رضوان کو سونپ کر تخت غلطی کی ہے۔ رضوان نے اسے پکڑنے میں کوئی کرشمہ نہیں چھوڑا اب اماں! آپ ہی بتائیے اس کی عمر ہے گھر کے ایسے معاملات میں دخل دینے کی؟ ماں سے جواب طلبی کرنے کی؟ وہ اپنی حد سے آگے بڑھ رہا ہے۔“

”تم کچھ زیادہ ہی ری ایکٹ کر رہی ہو۔ سعد، عمر کے اس جیسے میں ہے جہاں اپنے بڑے ہونے کا احساس دوسروں کی نسبت زیادہ شدت سے ہونے لگتا ہے۔ وہ صرف اپنے ہونے کا احساس دلانا چاہ رہا تھا، خود کو اس گھر کے اہم معاملات میں شامل کر کے اپنی اہمیت۔“

”رضوان! تم بے جا حمایت مت کرو۔“ دادی نے بھوکی سائیڈ لی۔

”وہ اس گھر کا اگلا بیٹا ہے۔ اس کی اہمیت کب ختم نہیں کی گئی لیکن اس طرح کا رویہ..... یہ واقعی مناسب نہیں آج کل کے یہ بات خود تیار ہونے لے زیادہ نقصان دہ ثابت ہوگی۔“ میں نے ایک زوردار دھماکے کے ساتھ اودھ کھلا دروازہ بند کر لیا۔ اب میں اور کچھ نہیں سننا چاہتا تھا۔

جس بات کا ذوق تھا، وہی ہوا۔ ہانی، اماں کے جذباتی بیان سے ٹریپ ہو گئی۔ میں اس کی فطرت سے اچھی طرح آگاہ تھا اور اب صرف اماں کے اس بے ستمی سے اپنے ہونے کو دھونے کے لئے اس نے راضی خوشی اپنے بارے میں سارے فیصلے کرنے کے اختیارات انہیں سونپ دیئے اور اماں..... وہ اس اختیار کے اچھے آتے ہی بڑے جوش ہو کر اپنے ارادوں کو کس تیزی سے پایہ تکمیل تک پہنچا کر لیں گی، یہ میں جانتا تھا اس لئے میں روٹھ گیا، اماں..... ہانی سے اور اپنے آپ سے۔

☆=====☆

یہ ناراضی شاید بہت دن تک چلتی..... یہی ہو سکتا تھا، وہ مجھے مبالغہ نہیں مگر اس کی نوبت ہی نہ آئی۔ مجھے خود یہ ناراضی ترک کر کے اس کی طرف بڑھنا پڑا۔ اس نے دادی کی وفات کا ایسا اثر لیا تھا شاید اپنی اماں کی ذبح کا بھی نہ لیا ہو۔

میرے نزدیک تو یہ ایک معمول کی بات تھی جیسے کوئی بھی چیز ایک مدت پوری کرنے کے بعد ختم تو ہو جاتی ہے ایسے ہی ایک دن ایک روز دادی نے بھی تو..... مگر ہانی کے لئے یہ واقعی ایک حادثہ تھا، ایک سانحہ تھا، ایک مہینہ ہونے والا تھا مگر وہی کہ اس صدمہ سے باہر نہ آ رہی تھی۔ اس کی روٹی روٹی آنکھیں دیکھ کر خواہ مخواہ میری پگھلوں پر ریت چھینے لگتی۔ اس کے

کمرے کے بند دروازے کے پیچھے سے ابھرتی سکیاں میرے حلق میں پھر سے وہی کانٹے اگھانے لگتیں۔

کچھ دن تو میں اسے ایسے ہی کھانے پینے ہر چیز سے بے نیاز، روتا دیکھتا رہا پھر نہ رہ سکا۔ چالیسویں سے پانچ روز پہلے ہی اس کا جنم دن آ گیا۔ وہ ہمیشہ سے اس دن کا آغاز دادی کی دعاؤں سے کرنے کی عادی تھی۔ یہ دن اس کے روتے ہوئے زخم کو نئے سرے سے اودھیرنے کا باعث بنتا تھا۔ اب اماں نے خود میری مدد و طلب کی۔

”سعد! تم کیسے دوست ہوا سننے والوں سے اسے حال سے بے حال دیکھ رہے ہو۔ جاؤ، اس کے پاس بیٹھو، ادھر ادھر کی باتوں سے اس کا دھیان بٹاؤ۔“

”دادی کے جانے کا ایک فائدہ ہوا۔“

ری کی باتیں تو مجھے نہ آتی تھیں۔

لیکن کم از کم مجھے یہ بھی نہیں کہنا چاہئے تھا، کیا بتاؤ کچھ اٹھا کے میرے سر پہ مار دیتی۔ اب بھی بات کہہ بیٹھنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں اس قدر نامقول فقرہ ادا کر چکا ہوں اور وہ بھی سخت بے موقع، جب کہ درحقیقت میں کوئی زیادہ غیر مناسب بات کرنے بھی نہیں جا رہا تھا۔

”دیکھو نا، دادی کی ذبح سے اب اماں کچھ عرصہ کے لئے تمہاری شادی کا شور مچانا بند کر دیں گی۔“ میں نے ڈرتے ڈرتے وضاحت کی۔ اس کے سونکے لبوں پہ ایک بھولی ہنسی سی سرکراہٹ آئی اور لبوں کی اچانک چوٹکٹ ہولے سے نچوکر داہیں پلٹ گئی، اس نے سر جھٹکا۔

”تم بھی نا سدا! ایک بات کو سر پر سوار کر لیتے ہو۔“ اس کی آواز دھیمکی ہوئی تھی۔

”میں یا تم؟ پتا ہے پورا ایک مہینہ ہو گیا ہے تمہیں لبوں کمرے میں بیٹھ کے روتے ہوئے۔ اس ایک مہینے میں تم نہ آؤں گی ہو، نہ بچن میں جا کر صادقہ کی خبر لی ہے جو میرے ڈونیاں بھر بھر میں اظہار شروع ہو گئی ہے اور کونک انکلی بھی اس نے لیلوں کے حساب سے ڈالنا شروع کر دیا ہے۔ چار روز پہلے بھی اماں نے زبردستی تمہیں نہانے سے مجبور کیا تھا اور پسوں تم نے آخری بار بال برش کئے تھے، ہے نا؟“ میں نے پورا پورا حساب لگایا۔

”ارے تم تو تھو برش تو کر رہی ہو نا..... پائے بھی مہینہ نہ کر دیا ہے۔ دکھاؤ..... میں راسا آگے ہو اور پھر پورا دادا کاری کرتے ہوئے گھر کے پیچھے ہوا۔

”اوں، ہوں گندی پٹی..... کم از کم دانت تو صاف کرو۔“ وہ ہنسنے لگی۔ ”بوتیز۔“

اس روز اس میں اتنی تبدیلی آئی کہ اس نے خود سے لاپرواہی برتا چھوڑ دیا۔ اسے دلوں

بعد اس کا آفس میں پہلا دن مجھے بہت کھنکھن لگا۔ وہ لوئی تو میں لان میں ریکٹ لئے اسی کے انتظار میں تھا۔ ”اوہ پلزز، سدا! آج نہیں۔ بہت تھک گئی ہوں۔“ میرا موڈ بھانپ کر اس نے منٹ کی۔ میں نے نزدیک کی رکھی ٹرائی آگے کھینچی۔

”چائے حاضر ہے مانی کوئین! پیچھے اور تھکن مٹائے، ساتھ میں تپے والے سوسے، پیزا اور ڈش بے فکر ہو کر کھا لے گا جناب۔ ان میں سے کسی پہ بھی صادقہ کا ہاتھ نہیں لگا، یہ میں تمہارے لئے آکھٹلی خود لے کر آیا ہوں۔“

”تھکنس یار! آج تو میں لٹچ بھی نہیں لے سکی۔“ وہ وہیں بیٹھ گئی اور چائے اور اسٹیکس کے ساتھ انصاف کرنے لگی۔

”تم تو واقعی بہت گندری بچی ہو، ہاتھ منڈک نہیں دھویا۔“

”میں آج سائیٹ پر نہیں گئی۔ آفس ورک تھا اور آف ہونے کے بعد میں فریش ہو کے دین میں بیٹھی تھی۔“

”کل کا کیا پروگرام ہے؟“

”کل کا؟ شاید سائیٹ پر..... وہ رک کر سوچنے لگی۔

”ارے ہاں، کل تو آف ڈے ہے۔ اتنے دن سے روشنی و سڑب تھی اس لئے چھٹی والے دن کا بھی اہم روز نہ ہوا۔“

”ہاں ہے، ہم پورے چار ماہ سے جلیون گئے۔ پہلے میرے ایگزمن تھے، پھر..... کل چلیں؟“ میں پروگرام پہلے ہی بنائے بیٹھا تھا۔ اس نے جہان نہ بنانا بھی چاہا، مگر میرے آگے اس کی ایک نہ چلی۔

اس دن مجھے اس پہلے دن کی یاد شدت سے آئی، جب پہلی بار میں اس کے بہت مجبور کرنے پر یہاں آنے پر آمادہ ہوا تھا۔ کل وہ میری اٹھنی تمام کے مجھے تمہاری تھی اور آج وہی سب کچھ میں کر رہا تھا۔ اس کے پیوندہ گاہکوں کے پیش میں نے رکھے تھے۔ دبیر کا آخر تھا۔ دھند بھری اس صبح کو بچک پہ نکلے گا فیصلہ عجیب سا تھا۔ مگر میں اس کی ”اٹھنی تھانے“ کے جوش میں موسم کی شدت تک بھلائے بیٹھا تھا۔ آج مجھے اپنا آپت بہت بڑا، بہت ذمہ دار سا لگ رہا تھا اور..... وہ ایک چھوٹی سی راستہ بھگی اداس سی شہزادی، جس کا دل بھلائے کی ذمہ داری مجھ پہ عائد کی گئی ہو۔ اس دن میں نے ”بڑے پن“ کا ہر احساس شدت سے محسوس کیا۔ کچھ یہ فخر میرا سینہ چوڑا کرنے کو کافی تھا کہ اسے اس سوگوار کیفیت سے باہر لانے میں سب ناکام رہے، سوائے میرے یعنی وہ میرا کہا باقی ہے۔ میرا اثر ہے اس پہ، میں وقت

فوق اس احساس کو اور آجا کر رہا تھا، کسی نہ کی طرح تپتے سے۔

”صرف شال، اس قدر سردی ہے، چلو اندر، پہلے کوئی سویٹر پہن کے آؤ اور سوکھی۔“ یا پھر۔

”بھوک تو نہیں لگی، یہ پکڑے میں نے خود فرائی کئے ہیں، کھاؤ تم آج کل اپنی ڈائنٹ پہ بالکل توجہ نہیں دے رہیں۔“

”کافی لوگی، سردی خاصی ہے۔“

”بھوک پہ چلیں..... اگر موڈ نہیں ہے تو بے دو۔“ وغیرہ وغیرہ اور وہ بھی میری ہر بات بغیر چوں و چرا کے مان رہی تھی، یعنی کہ بالفاظ دیگر اس نے میرے بے پن کو تسلیم کر لیا تھا۔ میں کچھ اور ڈر رہ گیا۔

”تو تم ایسے ہی کہہ رہی تھیں کہ آج کل کون بچک پہ چاتا ہے۔ اتنی سردی میں لوگ بیٹر کے آگے سے اٹھنا تک گوارا نہیں کرتے وغیرہ، یہ دیکھو، یہ جو اتنے سارے کھلو آئے بیٹھے ہیں یہ کیا پاگل ہیں۔“ یا بیڑا اپنے ساتھ اٹھا کے لائے ہوئے ہیں۔ مس ہتی! جنہیں آنا ہوتا ہے وہ موسم نہیں دیکھتے، نہ بارش، نہ طوفان، نہ سردی نہ گرمی..... بس آجاتے ہیں..... ملے۔“

میں معنی خیز انداز میں سکرایا تو وہ چونکی۔ ایک نظر اس نے بھی ارد گرد بیٹھے کھلو پہ ڈالی اور میری بات کا مطلب بھانپ گئی۔ اس کی خاموشی سنی مجھے اور شٹی۔

”ہنی! ابھی تم درخت پہ اپنا نام لکھیں۔“ ایک لڑکے کو درخت کے تنے پہ نام کھودتے دیکھ کر میں نے کہا تو وہ زور سے ہنس پڑی۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں، دل کی شکل بھی بنانا اور اس میں ایک عدد تیر کھونچنا تو ہرگز مت بھولنا اور ساتھ میں کوئی دھواں دھار شعر بھی ہو تو کیا ہی کہنے۔“

”تم میری ہر بات کو مذاق میں کیوں اڑاتی ہو؟“

”کمال ہے۔“ وہ میرے ہنسنے کو جرات سے دیکھنے لگی۔

”تم مذاق کرو تو ٹھیک ہے اور اگر میں جوا یا کچھ کہوں تو ناراض۔“

”میں نے مذاق نہیں کیا تھا، میں سیر بس ہوں۔ میں واقعی اس درخت پہ اپنا اور تمہارا ام لکھنا چاہتا ہوں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ..... کہ شادی..... شادی کے بعد جب کبھی تم سے دیکھو گی تو تمہیں کیسا لگے گا۔“

بہت ہمت کر کے میں نے اپنا کہا اور رک کے اس کا رد عمل دیکھنے لگا۔ میرا دل لمحے بھر کے بلے سکڑا گیا تھا۔ یہ جانے وہ کیا کہہ دے۔ مگر وہ ویسے ہی دھیلے قدموں کے ساتھ کھاس

خود ملا کی طرف متوجہ ہو گئی جولان میں پہنچی تھیں۔

☆=====☆=====☆

میری آنکھوں میں چھپی اک کی سی روشنی  
میں نے جب بھی بات کی اک کی سی روشنی  
میں تو کچھ ایسا ہی تھا، جو کہا بے ربط تھا  
لیکن اس کے ساتھ بھی اک کی سی روشنی  
کیا سنا اور کیا کہا، کیا پڑھا اور کیا لکھا  
کچھ کہی کچھ اُن کہی، اک کی سی روشنی  
اس کے میرے درمیان اک تعلق کا گمان  
بن گیا جب دل لگی، اک کی سی روشنی

اور کی تو واقعی وہی تھی، کوئی کئی..... کہیں نہ کہیں..... میرے سمجھانے میں..... یا اس کے  
سمجھنے میں..... یا میری محبت میں..... یا اس کے ضبط میں کچھ تو تھا۔ اگر میں غیر جانبداری سے  
تجزیہ کرنے بیٹھوں تو تب بھی جتنا تصور مجھے اپنا لگتا ہے، اتنا ہی اس کا بھی نظر آتا ہے۔  
چلو ٹھیک تھا، مجھے محبت کا قریب نہ آتا تھا، مجھے اظہار کا سلیقہ نہ تھا۔ میری جسارت تو دیکھو کہ  
خود سے آٹھ برس بڑی لڑکی سے محبت کر بیٹھا جو میرے اپنے ہی تایا کی بیٹی ہے۔ میری حفاظت تو  
دیکھو، اس کے التفات کو محبت سمجھ بیٹھا۔ اس کی عنایت کو الفت جان لیا اور میری جلد بازی یہ تھی  
کہ میں نے محبت کا پینے کا موقع دینے بغیر کیا کھایا اتنا کر اس کے سامنے دھریا۔

اور پھر ان ہی دنوں میرا وزٹ آ گیا۔ میں نے کیا کہا اُسے لے کر اپنے سکول میں دیکھا رڈ  
کا قلم کیا تھا۔ البتہ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا سوچ لیا اور اپنی کوڈز آفر کیا۔

”یار! کارنامہ تو تم نے ایسا کیا ہے کہ مجھے، تمہیں ڈر دینا چاہئے لیکن خیر..... وہ پھر کبھی  
کسی، تمہاری ٹریٹ بھی چھوڑنی نہیں چاہئے لیکن کیا خیال ہے ڈر کے بجائے کل کا بچہ نہ رکھ  
لیں، تم مجھے دیر سے آغوش سے پک کر لیٹا۔ تمہیں تو پتہ ہے کہ میں ڈر برائے نام ہی لیتی  
ہوں، صرف دودھ یا سوپ۔ اب ایسے سستے میں تو تمہیں نہیں چھوڑ سکتی۔ تم پہلی بار اپنی جیب  
ڈسٹی کر رہے ہو تو اس خوشی میں کل کا ناشتہ بھی گول کر دوں گی تاکہ بچہ زبردست رہے۔“

میرے لئے یہ بھی بہت بات کہ وہ میرے ساتھ بچہ کرنے پر تیار ہو گئی ہے۔ اس سے بہتر  
موقع اور کوئی ٹیس تھا اس پر اپنے چند لمحوں کو آشکار کرنے کا اور لاپرواہی کرنے کے بعد مجھے یہ بھی

پہنچتی، میری ٹھوکر سے ایک پتھر مسلسل آسمے دھکیلتی لا رہا وی سے کہتے تھے۔

”اس روز تو بڑا شکر ادا کر رہے تھے کہ کسی نے کہا یہاں ملا کی توجہ دینی میری شادی کی فکر  
سے اور اب خود ذکر لے کر بیٹھ گئے اور اس بات کا چھوڑ دے کہ دیکھ کر مجھے کیسا لگے گا، یہ  
سوچو کہ میرے شوہر کو کیا لگے گا، اپنی زوجہ محترمہ کا نام ایک دوسرے نام کے ساتھ درخت پہ  
گندہ دیکھ کر۔ کیوں میرا مستقبل خدو دل کرتے ہو سسر سعد رضوان میرزا داہ۔“  
”ایسی کی بھی تمہارے شوہر کی اور اس کے سوچنے کی۔“ میں نے دل ہی دل میں خوب

گالیاں دیں۔

”آج تو دھوپ بھی نہیں لگتی۔ خاصی سردی ہو رہی ہے، چلو واپس چلتے ہیں۔“

”مگر ابھی تو پونک بھی نہیں کی۔“

”پاگل ہوئے ہو، میری پہلے ہی قلفی جم رہی ہے، تم پھیل پے جانے کی سوچ رہے ہو۔  
میرا خیال ہے آج تو کوئی بھی اس طرف کارخ نہیں کرے گا۔“

میں پہلے ہی اس کی لا پڑا وی ہے۔ مل بھن رہا تھا کہ وہ میری کسی بھی بات کو سمجھنے کی  
نہیں لے رہی، اب اس طرح اپنی چلانے پر مزید ناراض ہو گیا۔ واپس جانے پر رضامند تو  
ہو گیا مگر ای سوچے ہوئے منہ کے ساتھ۔ وہ راتے مجھے سمجھنے ماننے کے لئے جتن کرتی رہی۔  
”ایک تو تمہارا کچھ باتیں چلتا، کب بات پے ناراض ہو جاؤ اور مجھ سے تو تمہیں  
دشمنی ہے اور کسی سے رشتہ نہ رشتہ، مجھے ہنسنے میں وہ بار یہ نخرے ضرور دکھانے ہوتے ہیں۔“  
آخر کار بارمان کے اس نے کہا..... جب کار گیٹ سے گھر کے اندر داخل ہو رہی تھی۔

”تم سے دشمنی نہیں، محبت ہے۔“ میں اچا پک کہہ رہا تھا۔

وادی کے جانے کے بعد میں جس انداز میں اس کے قریب آیا تھا، اس سے میرے اندر  
اعتدال پہلے کے مقابلے میں گونا گونا بڑھ چکا تھا۔ وہ بکھری ہوئی تھی، جھکستے تھے اور میں نے اسے سنبھالا  
تھا، بھلا یا تھا، یہ نخرے مجھے مضروب دے پا کر کر گیا، اس لئے میں اتنی بڑی بات اسے کہہ بیٹھا۔

”جن سے محبت ہو، ناراضی بھی ان سے ہی ہوتی ہے۔“

”اور یہ جو میں سمجھنے بھر سے تمہاری تمہیں کرتی پھر رہی ہوں اور آج سے نہیں بلکہ کسی  
سالوں سے تمہاری ہر خاموشی پر کرتی آئی ہوں یہ بھی صرف اور صرف میری محبت ہے۔“ اس  
نے کار سے اُترتے ہوئے کہا۔

”جتنی محبت تم مجھ سے کرتے ہو، اس سے کئی گنا زیادہ میں تم سے کرتی ہوں..... ارے  
آئی! آپ گھر پہ.....؟ آپ تو آج آئی شاہ کے ہاں جاتا تھا۔“ میرے وجود کو پر لگا کر وہ

لگنے لگا تھا کہ میں نے اب اپنے بچپن کو نکل طور پر خیر باد کہہ دیا ہے، یہی مناسب وقت ہے۔

وہ رات مجھ پہ بہت بھاری کڑی لڑائی ایک بچپان تھا جس نے میرے پورے وجود کو اپنے قبضے میں لے رکھا تھا، ایک سستی قحی جو میری رگوں میں سلاطنت کر رہی تھی، ایک بے چینی کی جو میرے حواسوں پہ چھائی ہوئی تھی۔ میں بھی افسانہ تھا۔ کبھی بیٹھتا تھا۔ کبھی باہر نکل کر اس کے کمرے کے دروازے کے باہر کھڑا ہوجاتا، کسی آہٹ کے۔ کسی روشنی کے انتظار میں..... مگر وہ جو رات دیر تک پڑنے کی عادت تھی، اب آفس جوتان کرنے کے بعد رات کو جلدی سونے لگی تھی۔

کبھی میں دی آن کر لیتا، کبھی ڈیک بے دم سرحدوں میں کوئی گانا سننے لگتا۔

میں راتنگ نکل پہ جا بیٹھا۔ مجھے ڈانری لکھنے کی عادت نہیں تھی نہ میرے پاس کوئی ڈانری تھی۔ میں وہیں رہ کر کھے راتنگ پیڑ اپنے پاؤں کا غبار نکالنے لگا۔ میں نے سب کچھ ڈالا۔ جو میں محسوس کر رہا تھا۔ جو میرا دل چاہ رہا تھا۔ سب کچھ..... ایسا کرنے کے بعد مجھے خود میں ڈراستھیلے کے آثار نظر آئے۔ میں نے کھڑی دیکھی، پونے پانچ سو رہے تھے۔ میں نیند سے بے حال ہو کر بیدار ہوا اور سو گیا۔

سازمے گیارہ کے قریب جب میں بیدار ہوا تھا تو صرف ایک دھن سوار تھی کہ مجھے ایک ڈیڑھ گھنٹے تک ہنی کے آفس پہنچنا ہے، وقت کم تھا اور تیار ہی زیادہ۔ ابھی تو مجھے راستے سے اس کے لئے ٹکٹ اور بوسے بھی لینا تھا۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر میں افشاری میں تیار ہو کے گھر سے نکل گیا۔ ایک گھنٹہ شاٹنگ میں صرف ہوا۔ کچھ میں ہی نہ آ رہا تھا کہ کیا لوں۔ ہر چیز سے نظر پھلتی پھلتی بالآخر ایک رنگ پہ جا پڑی۔ بلاشبہ میں وہ پیش قیمت انگوشی صرف ایک ننھے سے ڈائننگ سے تھی بے انتہا خوبصورت رنگ دہی تھی مگر میں اسے خرید نہیں سکتا تھا۔ حسرت سے اسے دیکھتے ہوئے آخر کار میں نے ایک تختہ پسند کر ہی لیا۔ یہ ایک بے دست و پاچ تھی، بے معدناؤں کی، سلور کمری جو بے شک اس رنگ جتنی چینی تو جتنی گرائی ضرور تھی کہ نہ صرف میری اس ماہ کی پوری پاکٹ مٹی نکل گئی بلکہ جھپٹے کچھ حیرت سے کی گئی تھی اور کل رزلٹ کی خوشی میں پاپا کی طرف سے ملی رقم بھی صرف ہو گئی اس کے باوجود مجھے انگوشی کے لئے کا مال تھا۔ میں نے لے کر لیا تھا کہ جب بھی میرے پاس اتنی رقم نہ ہوئی میں یہ رنگ ضرور لوں گا۔

ارمانی کے سوٹ میں، ہاتھ میں سرخ گلابوں کا بوسے تھا، جیب میں خوبصورت پیکیٹ میں رکھی رسٹ واپچ لے، میں اس کے آفس کے باہر اس کا انتظار کر رہا تھا اور مجھے سخت مایوسی ہوئی اسے دیکھ کر وہ عام سے چلے میں تھی۔ پون تو وہ خوش و خوش بھی تھی اور خوش لباس بھی مگر آفس جانے کے لئے پتہ نہیں کیوں اس نے مخصوص طرے کے ڈریسز تیار کروا۔

رکھے تھے۔ اس وقت بھی وہ بچکے بزرگ کے چلن مرید کے سوٹ میں تھی، بچکے بزرگ کی مثال اوڑھ رکھی تھی جس پہ جمہوری اور سرسٹی دھاریاں تھیں، براؤن لیدر کا شولڈر بیگ اور دیا ہی بدلنا سا بند جوتا۔ وہ مجھے ایسی پسنند تھی لیکن آج کے دن کے لئے میں نے پتہ نہیں کیا کیا سوچ رکھا تھا۔ رات میرے ہر تصور میں وہ وحش رنگ بڑھن اوڑھ کے آتی رہی تھی۔

سری دیوی کی طرح صفوں کی سفید ساڑھی کا سینک پلہ لہراتے ہوئے۔

ماذھوری کی طرح مجسمیل شرارے کی کرتیں ٹھکراتے ہوئے۔

سنڈر ریل کی طرح جالی کی میکی کو کاڑے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے اٹھا کر شیشے کی سینڈل میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے۔

سنو وائٹ کی طرح سیب سے رخساروں پہ گلاب کی کلیاں سہلاتے ہوئے۔

اور وہ..... کیا تھا جو وہ آج مجھ سے ملنے کی خاطر ڈرا سا اہتمام کر لیتی۔

ہال ہی کھلے چھوڑ لیجی جس کی میں اکثر فرمائش کیا کرتا تھا۔

”واؤ، سعد رضوان عزیز زادہ! آپ کہاں سے ہو کر آ رہے ہیں اور کہاں کا ارادہ ہے؟“

اس نے میری تیار یوں کوسر سے جڑک دیکھ کر پوچھا۔

”میں گھر سے ہی آ رہا ہوں اور کیا بھول گئیں، آج ہمیں اکٹھے بیچ بھی کرتا ہے۔“

”بھولتی کیوں؟ بس ڈرا تمہاری جج دجج دیکھ کر ٹھکڑو ہو گئی تھی کہ شاید تمہارا نہیں اور کا بھی پروگرام ہو۔“ وہ آگے بڑھی اور ڈرائیونگ سیٹ کو خالی پا کر گھوم کے سوال کیا۔

”ڈرائیونگ نہیں آ پ؟“ میں بھی نہیں بار کہا ہے، ابھی تو ڈرائیونگ۔“ اس نے اتنا ہی کہا اور

میری اتنا ہی بھری خود ساختہ لا پرواہی کو دیکھ کر حیرت منہ پر دے کر ارادہ ترک کرتے ہوئے

ہاتھ اٹھا کر گیا۔

”لاؤ چاہی، میں ڈرائیونگ کرتی ہوں۔“

”کیوں، کیا میری ڈرائیونگ اتنی بُری ہے۔“ میری غیرت پہ کاڑی تازہ پانڈ لگا۔

”ڈرائیونگ نہیں، تمہاری عادتیں بُری ہیں۔“ میرے شرافت سے چاہی نہ دینے پر اس

نے خود ہی جھجھٹ لی۔

”کیوں آج کے اہم دن میں رنگ میں بھگ ڈالنے والی بات کرتے ہو۔ ہم تمہاری

کامیابی کو تسلیم نہ کرنے جا رہے ہیں، یہ نہ ہو کہ بغیر لائسنس کے ڈرائیونگ کرنے پہ تمہارا

چالان ہو جائے اور میرا بیچ اچھوڑا جائے۔“

میرے جگڑے مزاجوں کی قطعاً پرواہ نہ کرتے ہوئے وہ ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کے



پیشہ کی لیکن میں نے اسے اٹھادیا اور خود رانیوٹنگ کی۔ اس کے ذرا برابر لفٹ نہ کرانے والے انداز میرے پیمان اور اضطراب میں مزید اضافہ کر گئے۔ میں نے جڑ بڑھوتے ہوئے اسے وہاں سے اٹھادیا اور اس کے صبح کرنے کے باوجود رانیوٹنگ کرنے لگا۔

ایم ایم عالم روڈ پہ شہر کے تمام بینکے اور نامور ریسٹورنٹس کے آگے ٹریفک جام تھا، بلیغ ٹائم کا حال تھا۔ سب ریسٹورانوں کے آگے پارکنگ کے لئے جگہ تلاش کرنی گاڑیوں اور ان میں بیٹھے لوگوں کو جبرانی دے دیکھتے ہوئے ٹکھنے لگا۔

”ارے، کیا لوگوں کو گھر میں کھانا ملنا بند ہو گیا ہے، دیکھتے تو تھوٹنگ کی دے رونے روئے جاتے ہیں اور یہاں ریسٹوران کبھی خالی ہی نہیں ہوتے، میرا نہیں خیال کہ اس روڈ کے کسی بھی ریسٹورنٹ میں ہم دو گھنٹے سے پہلے داخل ہو پائیں گے، ایسا کروا کے سب ٹرن لے کر رائٹ پہ جڑ جاؤ، ایک غار ریسٹورنٹ بنا ہے شاید وہاں جگہ مل جائے۔“

لیکن اس کے مشورہ دیتے دیتے میں گاڑی کو ”کھانا“ کی پارکنگ میں پھنسانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

”اترے میڈم! میں نے یہاں رات کو ہی بنگلہ کر دلی تھی۔“

”بریلیف ایجنان سے بھوک کے مارے شہر ہو رہا تھا، میرا تو ارادہ تھا، کہیں جگہ نہ ملی تو ہیزا مٹ سے ہیزا پیک کروا کے یونیورسٹی رانیوٹنگ کے دوراں میں ہی پیٹ پوچا کر لیں گے۔“ اس نے پہلے سے ریزرو ٹیکس پہ بیٹھے ہوئے کہا تو اس کے اس پچھلے ارادے پہ میرا موڈ بگڑ گیا۔

”تمہیں تو صرف پیٹ پوچا کی پڑی ہوئی ہے۔ اگر ڈرائیوٹنگ کرتے ہوئے۔۔۔ اور وہ بھی لاہور کی سڑکوں پر۔۔۔ ہی کھانا کھانا تھا تو اس سے کہیں بہتر ماحول میں گھر بھی لے گیا جاسکتا تھا، لیکن میں ایسے بھلاں لے کے ساتھ آج کا خوبصورت دن ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا، اس لئے میں نے ایڈوائس بنگلہ کر دلی۔ ایسا رومانٹک ماحول، رومانٹک ترین دن اور بچے لگ رو مانگ ڈنر۔“ میں نے ٹیکس پہ دوٹوں کہیں لگاتے ہوئے ڈراما سا آگے جھک کے کہا۔ میرے اس طرح رومانٹک کی تکرار کرنے سے وہ کچھ کچھ سمجھ کر نظر آنی لیکن اگلے ہی لمحے جھٹک کر سڑادی۔ اب اٹھنے کی باری میری تھی۔ آخر وہ میری کسی بات کو سمجھ کر گئی؟ کیوں نہیں لگتی؟ کب تک مذاق سمجھ کے ہاتھی رہے گی؟

میں نے اسے چٹکانے کا تہیہ کر لیا تھا، اس لئے اس کی متنبہی نظروں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہتا رہا۔

”بس ایک کی ہے۔۔۔ بلکہ ایک نہیں دو۔ ایک تمہاری طرف سے۔۔۔ ایک میری طرف سے۔ تمہاری طرف سے تو یہ ہے کہ تم اس رومانٹک لے کے کھانے پورے کرنے کے لئے خاص تیار ہی نہیں آئیں۔ ارے ارے ماٹن مت کرو، تم ایسے بھی اچھی لگ رہی ہو، بہت اچھی۔۔۔ مگر مجھے دیکھو بھی تو ایسے ہی اچھا لگتا ہوں بلکہ بہت اچھا۔“ میں کالر جھارتے ہوئے اتر آیا۔

”لیکن تم سے ملنے کے لئے خاص باہتمام سے تیار ہو کے آیا ہوں اور ایک تم ہو کہ۔۔۔“

”بہت ہو گیا سہ۔“ اس نے مجھے گھورا۔ وہ میری باتوں کو ابھی تک ایک گستاخانہ مذاق سمجھ رہی تھی اور چونکہ مذاق میں بھی وہ گستاخی برداشت نہیں کرتی تھی، اتنی عزیز تھی اسے اپنی خود ساختہ بزرگی اس لئے اب مجھ پہ حد نافذ کر رہی تھی اور میں تھا کہ ساری حدود و قیود ایک ہی جہت میں پھلانگنے کے درپے تھا۔

”اور جو کی میری طرف سے ہے وہ میں پوری کئے دیتا ہوں۔“ میں نے کوٹ کے اندر ہاتھ ڈالا اور گلاب کی ادھ کھلی سرخ گلی ایک خوش رنگ و خوش وضع میز ٹیکل کارڈ پہ رکھ کے اس کے سامنے پیش کی۔ وہ چند لمبے کچھ نہ گھنٹے کے انداز میں دیکھتی رہی جیسے فیصلہ نہ کر پاری ہو کہ یہ عملی مذاق نہیں اسی زبانی مذاق کا ایک حصہ ہے یا حقیقت۔ میں پہلے سے جانتا تھا کہ اسے میری بات کو مذاق کی بجائے حقیقت کے طور پہ تسلیم کرنے میں کچھ وقت لگے گا اس لئے اس کا ہاتھ نہ بڑھانا مجھے مایوسی میں جکاتا نہیں کر سکا، بلکہ اس کی خاموشی میری ہمت بندھانے لگی۔ وہ کچھ دیر میرے چہرے کو کوجی رہی اور جب وہ حوصلے سے کبھی اسے مذاق کی بجلی سی رتن نہ ملی تو اس کی یہ خاموشی غیر متوقع نہ رہی، بلکہ ایک واضح ٹیکسی اعتبار کر گئی۔ میری آنکھوں کی چلیوں میں ناچنے سے لے لے چڑ ہے اس پہ آشکارا ہوتے ہی اس کی آنکھوں نے سر دھری کی کہرا اڑھ لی۔ ایک انجینی کی نظر اس نے اپنے آگے پڑے اس کے گلابی پتلی سرخ والے کارڈ پہ ڈالی، جس پہ گھر لے گلابی رنگ کا ایک دل اور سنبھلے الفاظ میں ایک بے حد ہذبانی سی نظم درج تھی اور جس کا کارڈ کے برابر وہ دروازہ لگا ہوا گلاب کی گلی میں دھری تھی۔ اس کا کارڈ پہ تحریر نظم پہ ایک نظر دوڑانے کے بعد اس کی صبح پشیمانی ٹیکسی کی ٹھکن آلود ہوئی۔

”یہ سب کیا ہے سعد رضوان؟ اگر مذاق ہے تو بہت ہی گھٹیا اور اگر۔۔۔“

”اور اگر حقیقت ہے تو بے حد خوبصورت۔“ میں نے اس کی بات کاٹی۔

”اور یہ حقیقت ہی ہے انی!“

”دیکھو سعد! مانا کہ تم بڑے ہو گئے ہو یا یوں کہنا چاہئے کہ جوان ہو گئے ہو۔ لیکن

لے صرف اپنی خوشی کو منانے کے لئے میں تمہیں یہاں لے آیا اور ایسی باتیں کر رہا ہوں۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ جسے تم عمر کا تقاضا سمجھ رہی ہو یا جوانی کا اہمال وہ تو ایک سامنے کی طرح بچپن سے میرے ساتھ ساتھ ہے۔ اگر آپ تمہارے کہنے کے مطابق میں اپنی سادہ بدھ کچھ کچھ ہوں تو یہ بتاؤ بچپن کے جذبات میں تو کوئی کھوٹ نہیں ہوتا نا؟..... تب تو دل ہر برائی، ہر لرزش، ہر بے ایمانی سے پاک ہوتا ہے، جس کے بارے میں جو بھی جذبہ رکھتا ہے، چاہا اور بے ساختہ رکھتا ہے تو سچی! آج یہ ہے کہ میں تمہیں بچپن سے چاہتا رہا ہوں، یہ کوئی کل پرسوں کی اچانک پیدا کی ہوئی محبت نہیں ہے۔ میں نے کئی سالوں تک اسے دل میں چھپا کر رکھا ہے۔“

”سدا!“ اس نے ایک گہری اور طویل سانس بھری اور میرے روہانے چہرے پہ ایک عجیب سی نظر ڈال کر بولی۔

”میں بھی تمہیں بچپن سے چاہتی آ رہی ہوں۔“

میرے دل کو اچانک پرک گئے۔ بڑے بڑے جو آن میں مجھے ساتویں آسمان تک اڑا کے لے گئے اور اس آذان میں، میں اس کی نظر کے عجیب ہونے پہ غور نہ کر سکا۔

”لیکن سدا.....“

اس کے لیکن نے میرے ہر قہقہے کے رکھ دیئے۔ میری پرواز ختم کے ساکت ہو گئی۔

”خدا کے لئے اس چاہت کو وہی چاہت رہے دو، بچپن کی چاہت جو ہر کھوٹ، ہر بے ایمانی سے پاک ہوتی ہے۔ اس بے منت لئے کھیل مت لگاؤ۔ میں اب بھی تمہیں ویسے ہی چاہتا چاہتی ہوں، جیسے تمہیں پہلی بار دیکھ کے چاہنے کی چاہ میں جا گئی تھی۔ میرا کوئی بہن یا بھائی نہیں تھا اور تمہیں دیکھ کے میرا دل چاہتا تھا کہ میں اس پیارے سے بچے کو.....“

”ہی!“ میرے پر، بارڈول سمیت کٹ گئے اور میں نیچے کرتے ہی بیچ پڑا۔ میری چیخ سے بے نیاز وہ کھنکھاتی۔

”تم بھی اکیلے تھے، میری صورت میں تمہیں بھی ایک ساتھی ملا۔ سچی وہ تھی ہماری دوستی، اپنائیت اور دانگلی کی، لیکن پتہ نہیں کیوں اور کس کے بھکاوے میں آ کر تم اس خوبصورت رشتے کو مسخ کرنے پہ تلے ہو۔ تم نا سمجھ ہو، اسے تمہاری نوعمری کی بھول سمجھ کر میں نظر انداز کر دوں گی، اگر تم یہ وعدہ کر دو کہ اس فضول واقعے کا ذکر بھی آئندہ ہمارے درمیان کبھی نہیں آئے گا۔“

”کیسے نہیں آئے گا؟ ہمارے درمیان اگر کچھ ہے تو یہی ہے، اگر کوئی رشتہ ہے تو یہی

تمہارے آس پاس میرے علاوہ کوئی اور لڑکی Available نہیں تھی، تب بھی اس ایڈ ونچر سے پہلے تمہیں کم از کم ایک بار تو اپنے اور میرے تعلق کے بارے میں سوچنا چاہئے تھا۔“

”تمہارا اور میرا تعلق؟..... میں اسی تعلق کے بارے میں تو بات کر رہا ہوں اور اس بارے میں ابھی طرح سوچنے کے بعد ہی بات کر رہا ہوں۔“

”خاک سوچا ہوگا تم نے۔ بلکہ کچھ عرصے بعد جب تم واقعی تنہید کی سے یہ سوچ کے کہ تم نے مجھ سے کیا کچھ کہا تو تمہیں خود سے بھی شرم آئے گی میرا سامنا کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔“ وہ مشتعل ہو رہی تھی اور اپنے اشتعال کو دبانے کی خاص کوشش بھی نہیں کر رہی تھی۔

”سدا! عموں کا یہ حصہ خطرناک ہوتا ہے مگر اتنا بھی نہیں کہ انسان ہوش گنوا بیٹھے۔ تم تو رشتوں کا تقدس بھی بھلا بیٹھے ہو۔“ وہ مجھ پہ اس طرح صحن طعن کر رہی تھی کہ بالآخر مجھے بھی غصہ آ گیا۔

”کیا تقدس؟ تم میری خالد ہو، بیوی بھی ہو، مائیں ہو؟ یلو؟“ میرے ترخ کے کہنے پہ وہ شعلہ بارانظروں سے مجھے دھمکتی رہی، مگر سر جھک کے اپنا چہرہ اٹھانے لگی۔

”تم دو سدا نہیں رہے جسے جانے کا پانی نہ کبھی دھوئی کیا تھا۔ تم تو ایک اجنبی ہو، دوسرا اجنبی اور میں کسی اجنبی سے بات تک کرنا پسند نہیں کرتی، کیا کہ اس کے ساتھ کہیں خجلاعت گزاروں۔“

اسے اس طرح بات کے شروع ہونے سے پہلے غم کے کڑے اشعے دیکھ کر میں نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ کھینچ کر اسے واپس کر سکی تھیں چاہا۔ اس نے فوراً ہی زوردار طریقے سے میرا ہاتھ جھٹکا۔ اس سے پہلے بھی کئی بار میں نے اس کا ہاتھ تھامنا تھا، اسے چھو تھا مگر وہ یوں براہم نہ ہوئی تھی۔

”تم شامت بناؤ سدا!“ اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ کہاں ہے تو آواز دبا کے مجھے سمجھ کرنے لگی۔

”تمنا تو تم میرا جادو ہی ہوئی! میری پہلی بات سے بغیر ہی تم میں ناراض ہونے جاری ہو۔ میرا قصور کیا ہے..... آخر میں نے ایسا بھی کیا کہہ دیا ہے۔“ میں روہانہ ہو گیا۔

اپنی ہی آواز کی سکیپاٹ نے مجھے احساس دلایا کہ میں جتنا بد اپنے کی کوشش کر رہا ہوں ابھی اتنا ہوا نہیں جب تو اس کی تنگی سے گھبرا کے میرے آئس جھٹکے کو بے تاب تھے۔ میری آنکھوں کی نمی اور لہجے کی بے جا رنگی نے شاید اسے بھی کھٹکا کر دیا تھا۔

”تم یہ توئی کیسے صادر کر سکتی ہو کہ چونکہ مجھے اپنے آس پاس کوئی لڑکی نظر نہیں آئی اس

ہے۔ تم خواہ اسواں ہی چڑ کو میرے اوپر زبردستی توہینے کی کوشش مت کرو، جس کے بارے میں میں تمہارے حوالے سے کبھی سوچ بھی نہیں سکتا۔

”تم حد سے بڑھ رہے ہو، معذرت کرنا یا عذامت کا اظہار کرنا تو درکنار تم اپنی فضول سوچ پر شرمندہ تک نہیں ہو رہے۔“ اس نے گلاسز اٹکھوں پہ چڑھائے، مثال درست کرتے ہوئے اپنا چٹک اور موہاں اٹھایا اور واپس جاتے جاتے پلٹ کر کہا۔

”سعد رضوان! یہی بات اگر تمہارے سوا کسی اور نے مجھ سے کی ہوتی تو مجھے غصہ آتا۔“ شہید غصہ مگر..... صرف غصہ..... تم سے سن کر تو میں پچھتاوے اور ذلت سے مر می جاری ہوں۔“

وہ چلی گئی۔ میں یہ بازی اپنی جلد بازی کے ہاتھوں ہار چکا تھا اور بہت بُری طرح ہار چکا تھا۔ لرزے ہاتھوں کے ساتھ میں نے ٹیبل سے پڑا کارڈ اور گلاب اٹھایا، واپس کوٹ کی اندرونی جب میں ڈالا اور لوٹکڑاتے قدموں کے ساتھ اس کے پیچھے پیچھے باہر نکلا۔ وہ روڈ کے کنارے کھڑی شاہی ٹیکسی کا انتظار کرتی تھی، مگر اس روڈ پہ ٹیکسی وغیرہ کارگزرم ہی ہوتا تھا۔ میں کار پورس کر کے اس کے نزدیک لے آیا۔

”ہئی! بیٹھو، میں گمر ہی جا رہا ہوں۔“ میں نے اس کی جانب دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

”پہلی بات..... مجھے آئندہ ایسے کسی نام سے مخاطب مت کرنا، میرا نام ہانیہ بیڑزادہ ہے اور دوسری بات..... مجھے اس نام سے بھی کبھی مخاطب مت کرنا..... بلکہ کسی نام سے بھی نہیں۔“ اس کے لہجے میں چٹان کی سی جتنی تھی جس کے بوجھ تلے دب کر میرا ہراساں کھلا جا رہا تھا۔

”اور آخری بات سعد رضوان بیڑزادہ! ہو سکے تو مجھے بغیر نام کے بھی مخاطب مت کرنا، مجھ سے کبھی ایسے بھی مت ملنا جیسے سہرا کوئی کسی انجینی سے ملتا ہے۔ میں تم سے اجنبیت کا رشتہ بھی نہیں رکھنا چاہتی۔“

اس نے حد ہی کر دی۔ میرا ہارا ہوا ٹیس..... کھلا ہوا احساس..... اور ٹھوکر کھایا دل بھر گیا۔

”یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔“

”تم ہوتی کوں تو یہ فیصلہ کرنے والی کہ میرے لئے کیا بہتر ہے کیا نہیں۔“ میں گاڑی سے نکل کر ایک دم اس کے سامنے آ گیا۔ پتا نہیں میرے چہرے پہ کیا تھا کہ وہ ہلن بھر کے لئے خوفزدہ ہو گئی۔

”تم مجھے جانتی نہیں ہو، تمہارے اور میرے درمیان شناسائی نہیں ہے، میں تمہیں مخاطب تک نہیں کر سکتا، تم سہرا بھجھ سے کسی انجینی کی طرح بھی نہیں ملنا چاہتیں۔ مگر تمہیں یہ فکر کیوں ہے کہ میں کیا کرتا ہوں۔ کیا نہیں، تم کیوں کسی انجینی کے لئے کسی غیر کے لئے ”بہتر“ کا فیصلہ کرتی پھرتی ہو۔ میری مرضی، جو میرا دل چاہے گا میں کروں گا، میں تم سے پیار کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا، چاہے تم مجھے پچھانے سے بھی انکار کر دو۔ تم ایک ہزار ایک چہرے بھی بدل کے میرے سامنے آؤ گی تو میں تمہیں پچھان لوں گا۔“

ایک برف کی سل میرے رُخسار پہ ڈراخ سے آن گری، بے ساختہ اپنا دایاں ہاتھ بائیں رُخسار پہ پھیرتے ہوئے، میں نے حیرت سے اس کے غضب ناک چہرے کی جانب دیکھا۔

”کیا واقعی اس نے مجھے چمڑ مارا ہے؟“

مجھے یقین نہ آ رہا تھا، گال پہ ہوتی سنابٹ تھیں دلا ری تھی مگر یہ سب اتنا چابک ہوا تھا کہ نہ میں اس کا اظہار تھا کہ دیکھ سکا نہ ہی اپنی بلندہ ہوتی آواز کے شور میں اس چمڑ کی گونج محسوس کر سکا۔ گال پہ ہاتھ رکھے میں دور تک اسے دیکھتا رہا۔ جو پیدل ہی آگے کی جانب چل پڑی تھی، اس کے قدموں میں معمول سے زیادہ تیزی تھی اور اس کا ہر اظہار قدم مجھے ایک اور بھر پور چمڑ کی طرح دل پہ پڑتا محسوس ہو رہا تھا۔ میری آنکھیں پانی سے بھرتی جاری تھیں۔ میں گلیں جھپک رہا تھا۔ اس کا دور ہوتا وجود دم اور دھملا ہوتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ ایک ہلکے بزنسٹیل کی طرح نظر آنا بھی بند ہو گئی۔ پتا نہیں وہ سڑک کا موڑ مڑ چکی تھی اس لئے میں اسے دیکھنے سے قاصر تھا یا پھر..... آنکھوں کے آگے اتنا سیلاب جمع ہو چکا تھا کہ جھپکی جواب دے گی تھی۔ میں سو اپنے آس پاس قاتلانا دیکھنے والے کا دکا افراد سے بھی بے خبر تھا جو تھمسر سے یہ دیکھ رہے تھے۔ ایک لوٹروالے کو ایک لڑکی کو پچھپھرنے پہر بازار بھر پڑا..... شاید یہ خبر شام کے چٹ پٹے اخباروں میں بھی چھتی۔

☆=====☆

کہتے ہیں آفت بیہوش کی ایکلی نہیں آتی، اپنے ساتھ قیامت، قہر اور طراب وغیرہ کو بھی سمیٹ لاتی ہے۔

سالوں سے میں جس لمحے کا انتظار کر رہا تھا، وہ سامنے آیا تو ایک آفت ہر طرف مچا کے چلا گیا۔ مجھے اپنا دل..... اپنا وجود..... اپنی سوجھیں..... سب کچھ خالی خالی سا لگ رہا تھا۔ کسی آفت زدہ شہر کی طرح.....

گھر آیا تو ایک اور قیامت میری منتظر تھی۔

ایسی بھی ہوں گی جن پر تم شرمندہ ہو گے۔ ایسا کچھ نہ کرو کہ شرمندگی اتنی بڑھ جائے کہ آنے والے نکل میں تم اپنے زکر سے ہوئے کل سے منہ چھپا کر پھر دو۔ ابھی یہ بات ہمارے درمیان ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ یہ جلد سے درمیان ہی ختم ہو رہی ہے۔“

میری غیر موجودگی میں پایا کا میرے پیڑروم تک آتا بھی ایک اتفاق تھا۔ وہ رات کو میرے اچھے رزلٹ کے سلسلے میں پارٹی دینے کا آئیڈیا ریجنٹ کو کر چکے تھے کہ دادی کی ذمہ دہ فوراً بعد ایسا فنکشن رکنا مناسب نہیں، مگر خدانے سے میری شاندار کامیابی کی خوشی سنیا لے نہ سنبھل رہی تھی۔

تب پایا کو خیال آیا کہ بڑے بیٹانے پر نہ سکی، وہ ایک ٹیلی فون کے ذریعے سے اس خوشی کو سلیمریٹ تو کر سکتے ہیں۔ اسی مقصد کے لئے وہ آؤس جانے سے پہلے میرے کمرے میں آئے تھے، تاکہ مجھ سے پوچھ سکیں کہ میں دعی سنگھ پر یا کینیڈا میں سے کہاں جانا پسند کروں گا، لیکن وہاں اپنے فطری محسوس سے بے قرار ہو کر جب انہوں نے ٹیلی فون پر اپنی دعی سے پہلے کاغذ کو بڑھا تو میں کہیں اور ہی ہٹ گیا تھا۔ جی ہاں امریکہ۔

مجھے انہی طرح سمجھا لے، بجھانے کے باوجود میں ان کی ٹیلی فون نہ توئی تھی یا پھر وہ مجھے اتنی دیر بھیج کر، اس حرکت کی سزا دینا چاہتے تھے یا پھر ان کا خیال ہوگا کہ اس سر ملے پہ جب کہ میں خود اپنے فعل پر شرمندگی محسوس کر رہا ہوں (ان کے خیال میں) تو مجھے ہائی سے دور رکھنے میں ہی بھلا ہے۔ تاکہ میرے دل سے جلد از جلد اس سوچ کا اثر زائل ہو سکے۔

مئی اور پایا دونوں نے میرے جذبات کا جس طرح تجزیہ کیا تھا اور ان کی باتوں کی روشنی میں جب میں نے خود اپنا احتساب کیا تو مجھے بھی واقعی یہ لگنے لگا کہ یہ محبت نہیں صرف وقتی لبال تھا۔ میری حماقت تھی، عمر کا تقاضا تھا۔ جوانی کا نشہ، ماحول کا اثر۔ والدین کی طرف سے ملی ہے جا آزادی اور میڈیا کی بدولت وقت سے پہلے ”باطلم“ اور ”پاشعور“ ہو جانے کا نتیجہ۔ ہاں شاید۔ یہ محبت نہیں تھی۔

مگر اس گھر سے نکلنے ہوئے، سفر کے ایک ایک پل میں اور دیارِ غیر میں آنے کے بعد بھی، اگر میرا دل کی چیز کے کھونے کے خوف سے بار بار سکاڑا تھا تو وہ بھی ایک خوف تھا کہ اب پتا نہیں کب مجھے ہائی کا چہرہ دیکھنے کو ملے تو کیا یہ خوف، یہ ترپ، یہ عریضی، یہ دکھ۔ یہ سب عمر کا تقاضا اور جوانی کا خواہ تھا نہیں یہ تو شاید۔ ہاں۔ شاید یہ محبت ہے۔

اپنی عمر کے چند عرصوں میں میرے دل نے بڑے بڑے وقتوں سے اس محبت کا اعلان کیا تھا اور میری ہر سن نے پوری صداقت سے اس کی تصدیق بھی کی تھی، لیکن اب عمر کے سولہویں

پایا پر اس دن جو چرچہ ٹوٹا تھا، وہی قہر وہ مجھ پر برسانے کے لئے بالکل تیار تھے۔

بھری سڑک پہ پڑنے والا ٹھیکر۔ اور ارد گرد کھڑے اجنبی لوگوں کے سامنے ملنے والی ذلت نے مجھے اس طرح زمین میں نہ ڈکا تھا مگر پایا کو اپنے کمرے میں موجود کچھ کران کے ہاتھ میں دے گاغذات کو پچکان کر جو بظاہر مجھ پر گزرا، اس کا بیان میرے کس سے باہر ہے۔ یہ دعی شخص تھے جن پہ میں ساری رات اپنا غبار نکال کر نکلتا رہا تھا۔ پایا اپنی تمام تر روشن خیالی کے باوجود اندر سے اب بھی وہی رواجی باب اور چچا تھے، میرے لئے اسٹے نہیں بننے کر اپنی سنجیدی ہائی کے لئے۔ ان کے لئے یہ کلمہ کھلا دے جا جاتا، بے باکانہ اظہارِ محبت ایک لمحہ ہوگا، اس پہ مستزاد یہ کران کی سنجی کے بارے میں ایسے جذبات کا اظہار کرنے والا ان کا اپنا ”بھنہار“ بیٹا ہو۔

”کیا بکواس ہے یہ؟“ انہوں نے کھولتے ہوئے لچھ میں پوچھا اور میرے آگے وہ کاغذ لہرائے، میں سر جھکا کر دھ گیا۔

”وہا۔۔۔ پایا۔۔۔“ مجھے بالکل کچھ نہ سوچ رہا تھا کہ کیا کہا جائے۔

”تم اس قدر گھٹیا حرکت کر سکتے ہو، اس کا اعتراف بھی نہ تھا مجھے، اپنی جتنی حرکت کی کیسے تم نے؟“ اپنے ہی گھر میں۔ اپنی ہی فمیلی کی لڑکی۔ اور وہ بھی ایسی لڑکی جس کے ساتھ تم اس گھر میں، بہن بھائیوں کی طرح پلے بڑھے۔“

ان کی کڑوی کھلی باتیں میرے اندر تک نہ ہرانا دیتی رہیں، میں سر جھکا کر خاموش کھڑا تھا مگر میرا دل ان کی ہر بات کو درد کر رہا تھا۔

مگر یہ سب فی الحال ان سے کچھ کہنا بے کار تھا۔ وہ میری کوئی بات سننے کے موڈ میں نہیں لگ رہے تھے، میں ان کا قصہ دیکھتے ہوئے وقتی طور پر ہائی کا ٹم بھول گیا تھا، لیکن اب پھر مجھے اس کے ہاتھوں ملنے والی تیز لگن مل گئی۔

”اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو پایا کو خاموش کرانے کے لئے میری ایک ہی بات کافی تھی، کہ۔۔۔ پایا ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں، لیکن ابھی تو ہمیں کب رسکا۔ بے بسی نے مجھے اور تازہ دلا دیا۔ میری خاموشی سے تنگ آکر پایا خودی غلطی سے بڑھ گئے۔ نزدیکی آکر میرے شانے پہ ہاتھ رکھ کے ہلکا سا داؤ ڈالا اور پہلے سے لازم یہ لچھ میں کہنے لگے۔

”دیکھو بیٹا! وقت بھی ایک سانس نہیں رہتا۔ اسی طرح جذبات اور خیالات بھی بھی ایک سے نہیں رہے، ہر وقت کے جذبہ الگ الگ اور ہر عمر کے خیالات الگ ہوتے ہیں، جب تم یہ درد زار دو گے تو اس عمر کی بہت سی یادیں ایسی ہوں گی جن پہ جنہیں ہنسی آئے گی، بہت سی

سال میں داخل ہوتے ہوئے یہ یقین ڈنگا گیا تھا اس میں ایک سرسرا ہوا "شاہد" شامل ہو گیا تھا۔

☆=====☆=====☆

اور میری عمر کے اٹھارویں سال نے اس "شاہد" کو بھی لڑکھڑانے پہ مجبور کر دیا۔ مجھے امریکہ آئے دو سال ہونے کو تھے، اگرچہ پاکستان میں بھی اپنی فیملی بیک گراؤڈ کی وجہ سے جس سیٹ آپ کا گھر تھا، وہ کوئی کم رنگ رنگ اور پیش نہ تھا۔ مگر امریکہ کے شہر نیویارک میں رہنا ایک الگ ہی بات تھی۔ یہاں میں اپنے ماسوں کے گھر میں تھا جو پچھلے پچیس سالوں سے یہاں فیملی کے ساتھ سیٹل تھے اور یقیناً اگر وہ نہ ہوتے تو بابا اپنے اس بیٹے کو جو ان کے خیال میں مجز رہا ہے کبھی ایسے ماوراءِ ادا معاشرے میں تھا بھیج کر اس کی مکمل برپادی کا سامان نہ کرتے۔

ممکنہ امریکہ میں رہنے کے باوجود میری دادی کے ٹاپ کی خاتون تھیں اور حیرت انگیز طور پہ انہوں نے اپنی اولاد کی تربیت بھی ایسے ہی کی تھی ان کی دونوں بیٹیاں شادی شدہ تھیں، جن میں سے ایک کو تو وہ شادی کر کے پاکستان ہی کے شہر ملتان رخصت کر چکی تھیں، جب کہ دوسری کی شادی توجہ جی میں رہنے والے ایک پاکستانی سے کی تھی، تیسرے نمبر کا اکلوتا بیٹا مجھ سے کم از کم چار پانچ سال بڑا تھا اور میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔

لیکن ممکنی مجھ پر دوسری پابندیاں نافذ نہیں کر سکتی تھیں جیسی کہ پورے استحقاق کے ساتھ اپنے بیٹے پہ لاکو کرتی تھیں، ظاہر ہے میں ان کا سراسر اعزاز تھا ان کے شوہر کی بہن کا بیٹا۔ وہ میرا ہر لحاظ سے خیال رکھیں، مجھے مکمل گھر بھرا ماحول اور سکون میرا تھا۔

ظاہر ہے کہ پہلے پہل تو میں اداس ہی رہا۔ خاص طور پہ ان حالات میں جس طرح مجھے یہاں بھیجا گیا۔ سب سے زیادہ غصہ مجھے پانی پہ آتا تھا جو اس دن کے بعد میرا سامنا کرنے پہ بھی تیار نہ تھی۔ حتیٰ کہ میرے امریکہ جانے کی خبر پہ بھی اس نے یہ خود ساختہ گریز ترک نہ کیا۔ چند دن ایسے ہی جلتے کڑھتے بے کسی کے عالم میں گزرے۔ مجھے اپنے وجود پہ کسی بے جان چیز کا گمان ہوتا جسے جب چاہے کوئی اٹھا کے کہیں بھی رکھ سکتا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ بے بسی، بے زاری اور جھنجھلاہٹ کی دھند چھٹنے لگی۔ میرا ایڈمیشن ہو گیا۔ میں باہر نکلے لگا۔ دوست بننے لگے۔ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"اور..... میں تو امریکہ میں ہوں، نیویارک سٹی میں، جہاں آنے کے خواب لڑکے دیکھتے ہیں۔"

اپنی مرضی نہ جلتے اور اپنے جذبول کو معافیت قرار دینے جانے کی ساری فرسٹریشن نکالنے کا بھرپور موقع تھا۔ یہاں مجھے اپنے اندر کا غبار کا غندوں سے نکالنے کی ضرورت نہ تھی۔ میں جو چاہتا کرتا، جس سے چاہتا تھا، ہاں ماسوں کے گھر میں رہنے کا ایک لحاظ ضرور تھا کہ میں مزے ضرور کر رہا تھا، مگر حد سے آگے نہ بڑھ پاتا۔ یہی ذر تھا کہ اگر ماسوں کو چاہا جلی گیا تو بات پایا تک جتنے میں دیر نہ لگے گی اور یہاں سے آگے وہ پتہ نہیں مجھے کہاں بھیجیں گے۔

کرستینا، روڈھ، ہاسٹافا، کیے بعد دیگرے ان سب سے دوستی کے دوران میں بار بار یہ احساس چلا کہ میں محبت میں گرفتار ہو گیا ہوں اور ہر بار ان سے کسی ایک سے بریک آپ ہونے کے بعد اپنے اس دم کو جھٹلاتے ہوئے میں سوچتا۔

"رہیں، اگر یہ محبت ہوئی تو اس احمق لڑکی کو کسی دوسرے لڑکے کے ساتھ دیکھ کر مجھے ہنسی نہ آتی بلکہ غصہ آتا، دکھ ہوتا۔ یہ محبت نہیں تھی بلکہ اس کی نیلی آنکھوں اور سنی اسکرٹ کا جادو تھا جو جتنی جلدی چڑھا، اتنی جلدی اتر گیا۔"

کل تک تو میں روڈھ کے بارے میں سمجھتی کہ یہ سوچ رہا تھا کہ وہ کرستینا جیسی فلتز اور بے باک نہیں۔ اگر وہ باہر بھی لڑے تو شادی تک بات آگے جا سکتی ہے اور آج اس بلیک بیوٹی ہاسٹافا کے آئیڈل ٹرائل والے لڑکوں کو دیکھ کر روڈھ کی سنہری رنگت چمکی لگنے لگی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ میری یہ محبت بھی محض ظہنی تھی۔

اور جب تیسری بار ہاسٹافا سے ملنے کے بعد بھی دل میں کوئی ٹھٹھل نہ چمکی تو میں نے فرض کر لیا۔

"بار بار یہ محبت وغیرہ کچھ بھی نہیں..... سب بکواس ہے۔ محبت نہیں ہوتی، صرف یہ لگتا ضرور ہے کہ محبت ہوگئی ہے اور ایک بار نہیں بار بار ایسا لگتا ہے، لگتا رہے گا۔ جب تک عمر کا یہ دور باقی ہے اور جب تک ایسے حسین چہرے گمراہ رہیں گے، ایسا لگتا رہے گا۔ مجھے اب عادی ہو جانا چاہئے، ہو سکتا ہے کل کی اور چہرے کو دیکھ کر میرا دل ایک ہیٹ مس کرے۔ کسی اور کی زلفوں کو دیکھ کر میرے اندر انہیں جھونے کی خواہش جاگے اور سب سے پہلے اپنی کے بارے میں بھی میں اس غلط فہمی کا شکار ہوا تھا۔"

عرسے سے جوا بھنسن ڈسٹرپ کر رہی تھی "یقیناً" اور "شاہد" والی، وہ ختم ہوگئی۔

"ہاں واقعی، مجھے ہائیڈرو زادہ سے محبت نہیں تھی۔"

مجھے نے پورے دھوقے سے دہرایا، میرا دل ہلکا چھلکا ہو گیا۔ جب مجھے اس سے محبت ہی نہیں تھی، تو میں نا کاکی کا بوجھ دل پہ لئے کیوں اداس بھرتا، میری اداسی بھی ختم ہوگئی۔ اس

کے لئے جتنے گلے شکوے تھے، سب خود ہی فنا ہو گئے۔ پاپا ٹھیک کہتے تھے ایک وقت آئے گا جب مجھے ان باتوں پہ پستی آئے گی۔ شرمندگی ہوگی۔

لیکن ہوا یہ کہ مگر کے بیسویں سال ہی یقین بھی لڑکھڑا گیا۔ شاید قدرت سے میرا سکون اور ظہر اُڑ دیکھا نہیں گیا۔ میرے پاس ماما کا فون آیا تھا۔ وہ مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ میں کب پاکستان آ سکتا ہوں تاکہ اس کے مطابق ہانی کی شادی کی تاریخ مقرر کی جائے۔

”ہانی کی شادی.....“

”ہاں، شہر ہے اس فرض کی ادائیگی کا موقع ملا، اب تو خاندان کے لوگ باتیں بنانے لگے تھے۔ کسی کی اولاد کی ذمہ داری قبول کرنا بہت مشکل کام ہے، خاص طور پہ بیٹی کی، شہر ہے اللہ کا کہ اس ذمہ داری کو ہم لوگوں نے پوری ایمانداری سے نبھایا۔“

وہ ماما، جن کے پاس مجھ سے رکھی بات کرنے کا وقت بھی مشکل سے ہوا کرتا تھا، اب ایسے ہی فون پہ ایسی لمبی باتیں کیا کرتیں۔

”خدا خدا کر کے ہانی راضی ہوئی ہے اس رشتے پہ، ورنہ میں تو چار پانچ سو تھی اس لڑکی کے ہاتھوں، تمہارے پاپا بھی پہلے پہل بھی کرتے رہے کہ کہہ دو جو اس کا منی چاہتا ہے لیکن تمہارے جانے کے بعد وہ بھی ہانی سے اصرار کرنے لگے کہ وہ ان رشتوں میں سے کسی ایک کو پسند کر لے، جو اس کے لئے آتے رہتے تھے۔ مگر چاہیں اس کا کیا معیار تھا؟ کبھی پہلی وکیل ٹون فمیلیئر کے لئے سسر وکرتی رہی، ایک تو تمہارے پاپا کے برٹس سرکل کے سی فرینڈ نوہ ہدائی کے بیٹے کا رشتہ آیا تھا جو اپنے فیملی برٹس کا اکلوتا وارث تھا، دوسرا ایک نوجوان ایم این اے تھا اور تمہارے ہوتے ہوئے بھی تو کیسے اچھے اور پھر پولڈ آئے تھے لیکن اس لڑکی نے ہانی بھی بھری تو ایک معمولی سے انجینئر کے لئے، جو عام سے ملل کلاس گھرانے سے ہے، اس کا کوئی گھ گھ ہے، ویسے تو باضابطہ طور پہ رشتہ لائے ہیں اس کے گھر والے مگر ہانی کا بغیر کسی چول چرا کے ہاں کر دینا ظاہر کر رہا تھا کہ یہ دھڑنڈ پندہ بیگی ہوگی۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ.....“ مجھے یہ بات بھسم نہ ہو رہی تھی کہ ہانی بھی کسی سے محبت کر سکتی ہے۔

”ہاں تو اور کیا مطلب ہے اس کا لیکن بذات خود لڑکا چونکہ ٹھیک ٹھاک ہے اس لئے رضوان نے زیادہ اعتراض نہیں کیا۔ ویسے بھی ان کے اعزاز سے لگ رہا تھا جیسے انہیں صرف ہانی کو رخصت کرنے سے دلچسپی ہے ورنہ مجھے تو اس کا فیملی بیک گراؤ نظر نہ آ رہا تھا۔“

اور پاپا کو اسے رخصت کرنے کی زیادہ جلدی کس لئے تھی، یہ صرف میں جانتا تھا۔ ظاہر

ہے کہ اس حرکت پہ وہ کہتے ہی سچ پاکیں نہ ہوتے ہوں۔ اس جدائی سے بے چین بھی ہوتے ہوں گے، اپنے ہاتھوں دی گئی اس جلاوطنی کا خاتمہ کرنے کا بس بھی مل انہیں سوچنا ہوگا۔

”تم نے نہیں بتایا نہیں، کب آ سکتے ہو؟ یہ تمہارا لاسٹ سسٹر ہے؟“

”جی، لیکن اس کے بعد میں نے کچھ کوسر کرنے کا پلان کر رکھا ہے اپنے فریڈنز کے ساتھ، اس لئے ان چیزوں میں تو نہیں آ سکتا۔“

”اس سے پہلے کون سی چھٹیاں تھیں، جن میں تم آئے۔“ انہوں نے غفلت سے جتایا۔

”مجھے تو لگتا ہے تمہیں وہاں کی آب و ہوا زیادہ ہی راس آگئی ہے۔ شاید تم اب بھی بھی

واپس آنا پسند نہ کرو۔“ ان کے لیے میں خوف تھا، اے بیٹے تھے اور کچھ شکوے بھی۔

”ایسی بات نہیں ماما، ویسے بھی یہاں آئے کا فیصلہ میرا نہیں، پاپا کا تھا اور شاید آپ کی مرضی بھی اس میں شامل تھی۔ اب اگر میں آ گیا ہوں تو جس مقصد کے لئے آیا ہوں اسے دل کا کر پورا تو کرنے دیں۔ ہانی کی شادی ایسا کون سا بڑا مسئلہ ہے جو میرے بغیر حل نہیں ہو سکتا۔ کون سا اس کی شادی.....“

میں کہتے کہتے رک گیا کہ کون سا اس کی شادی مجھ سے ہو رہی ہے جو میرا آنا ضروری ہے۔ غمناک سے دل کی اس ضدی شکایت پہ میں خود ہی ہنس پڑا۔

”کہاں تو تمہاری محبت کا یہ عالم تھا کہ اس کی شادی کے ذکر سے تم گھبرا کے الجھنا شروع کر دیتے تھے اور کہاں اس کی شادی میں شرکت تک کرنے کے لئے تمہارے پاس وقت نہیں ہے۔“ صبح کہا ہے کسی نے، آنکھ اوچھل پھاڑ اوچھل مگر بیٹا! یہ تمہارے اپنے گھر کی تقریب ہے، بلکہ پہلا پہلا موقع ہے تم نہیں ہو گے تو سب کچھ کتنا احمورہ لگے گا۔ خود ہانی بھی کتنا بڑا احموس کرے گی۔ ایک ہی تو بھائی ہو تم اس کے اور اگر تم ہی.....“

”پلیز ماما.....!“ پہلے کی طرح آج بھی یہ بات مجھے اتنی ہی بُری لگی کہ میری گرفت ریسپور پہ اور بھی سخت ہو گئی۔

”میں کو شش کروں گا۔“ میں نے خود ہی خدا حافظ کہتے ہوئے ریسپور رکھ دیا۔ انہیں تو میں نے صاف ٹالا تھا مگر جب پاپا نے ایک ہی کال کے ذریعے پھر وہ تاریخ تک پہنچنے کا حکم دیا تو میں کوئی بہانہ تک نہ گھڑ سکا۔

جھپٹنی کی شادی کی خبر پہ دل کا گھبرا جانا، اس کو کسی اور کا ہوتے دیکھنے کا تصور کرتے ہی اندر آگ کا جل جانا، چپکے چپکے کی طرح اس شادی کے رک جانے کی دعائیں مانگنا اور سب

سے بڑھ کے یہ انکشاف کہ اس شادی میں ہانی کی مرضی اور پسند بھی شامل ہے، اس انکشاف نے تو مجھے لاوا بانے کے کھدیا تھا۔ ایک طرف اس شخص سے اتنی نفرت اور حسد محسوس کرتا کہ ڈر تھا اس کے سامنے آتے ہی میں کچھ کر نہ بیٹھوں اور دوسری جانب اسے دیکھنے کی خواہش بھی شدید تھی کہ آفراس میں ایسا ہے کیا جو ہانی کو بھایا۔ کیا میں اب بھی اس سے محبت کرتا ہوں، اب بھی؟ یعنی پہلے کرتا تھا.....؟ ہاں..... شاید.....

یہ "شاید" بکھر سے مجھے ابھی بھی ہنسی ہوتی تھی۔

سارے رستے خود کو یقین دلاتا تھا، میں پاکستان پہنچ گیا۔ پاپائے چندرہ تک پہنچنے کا کہا تھا، میں نے مصروفیت کا عذر تراشا اور جان بوجھ کر پائیس تاریخ تک پہنچا۔ اگلے ہی دن اس کی شادی تھی۔

وہ بھی مجھ سے خاصے نادرل اعزاز میں ملی، ان سالوں میں اس نے مجھ سے کوئی رابطہ نہ رکھا تھا لیکن اب وہ مجھ سے ایسے لڑ رہی تھی جیسے ہمارے درمیان کبھی کسی بھی یاد دہانی کا گزیر ہی نہ ہوا ہو۔

"تم تو پورے امریکن بن کے لوٹے ہو۔ رنگ بھی گھبر گیا ہے، لگتا ہے وہاں جانا کڑھنا چھوڑ دیا تھا اور یہ تم تازہ کیسے لے کیوں ہوتے جا رہے ہو۔"

"بس قدی ہی قد اذنت سا نکال لیا ہے۔ کزور تو اس قدر ہو گیا ہے میرا بیٹا اور رنگ تو یہاں بہ زیادہ صاف تھا۔ اب تو کچھ پیلا پیلا لگ رہا ہے۔" مانا نے خالص ماڈن والی آنکھ سے مجھے دیکھا جب کہ حقیقت وہی تھی جو ہانی نے بیان کی تھی۔ میری صحت قابل رشک ہو چکی تھی۔ پچیس پچیس سال کا بھر پور جوان نظر آتا تھا۔ میں نے چور نظروں سے مہمان خواہن کے ساتھ باتیں کرتی ہانی کا جائزہ لیا۔

مائیوں کے زرد لباس اور زرد پکٹے دیکتے دوپٹے میں وہ زیادہ بدلی ہوئی نہیں لگ رہی تھی، ویسی ہی تھی جیسی میں چھوڑ کے گیا تھا۔ اس کے نقوش بہت زیادہ غیر معمولی حسین بھی نہ تھے مگر اس کی صورت اور سراپے میں یہ خاصیت تھی کہ عمر اس کی گئی تھی، وہ اب ستائیس سال کی عمر میں بھی ابھی میں سے زیادہ کی نہ گئی۔ چہرے کے نقوش میں آج بھی وہی نرمی اور ملاہٹ تھی جو اسے کم عمری کی مخصوص مصمصیت عطا کرتی تھی، حالانکہ دادی کہتی تھیں کہ ملازمت کرنے والی لڑکیوں کے چہرے کڑھ جاتا کرتے ہیں۔ وہ دیکھی ہی دھان پان تھی مگر زراکت کے باوجود صحت مند کی چمک اس کی شفاف جلد، چہرے کے گلابی پن اور سرخی آنکھوں کی چکا چوند سے واضح ہوتی تھی۔ اس کا چہرہ اس قدر سنہری تھا کہ زرد روپے کے

ہالے سے چھوٹی کر نہیں بھی اسے زردی نہ اڑھا سکیں۔ اچانک اس نے میری طرف دیکھا مجھے دزدیدہ لگا ہوں سے اپنی جانب جھٹکتے پا کر اس کی سکرابٹ ڈرا سی بھیجی پڑی۔ میں نے فوراً نظریں پھیر لیں۔

ای رات جب مہندی کا نقشہ اس اپنے تمام تر ہنگامے سینے اب اہتمام کو تھا۔ لوگ ڈر سے لطف اندوز ہو رہے تھے، مجھے گھر کی پرانی ملازمہ جیراں نے ہانی کا پیٹام دیا۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتی تھی، اپنے کمرے میں، میں نے ایک نظر وسیع عریض لان پر ڈالی، اسی جگہ کچھ دیر قبل وہ سر جھکا کر بیٹھی مہندی کی رسم کی خاص مہمان بنی ہوئی تھی۔ اس کی دلی دلی پی شخصوں مکان میں شریک سی سرست تھی۔ اس کے چہرے کے سنہری پن میں سات رنگوں کی شعاعیں شامل ہو گئی تھیں۔

اس کا کمرہ بھی دیسے کا دیا تھا..... بالکل اسی کی طرح..... جیسا میں چھوڑ کر گیا تھا۔ مجھے انداز آتے ہی لگا جیسے میں دو سال پہلے کے وقت میں داخل ہو گیا ہوں۔ اس کمرے لانگنگ والے کراپٹ پہ بیٹھ کے ہمو لڈو اور اسکرینل کھلا کرتے تھے، بیٹھے بیٹھے میں ان ہی فلور کٹھن میں ایک کوٹھنڈت کر لیٹ جایا کرتا تھا۔ یہی وہ بلیک اور سلور وال کلاک تھا جس کی سونہیوں کو دیکھتے ہی وہ مجھے فوراً کمرے سے بھاگنا کرتی تھی کہ اب اس کے پڑھنے پڑھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ یہی وہ سادہ سی ساخت کا انٹروفٹ کی لکڑی کا سٹنل بیڈ تھا جس پر بیٹھی وہ کوئی ملکہ لگا کرتی تھی۔ یہی وہ گروے اور وائٹ ڈیزائن والا کبل تھا جو.....

"بیٹھو سادہ....." اس کی آواز پہ میں چونکا اور سر جھٹک کر ان خیالات سے جان چھڑاتا چاہی۔

"تم بہت بدل گئے ہو سعد....."

"کوئی نئی بات کرو۔ یہ تو تم نے جب بھی کہا تھا جب میں یہاں تھا۔" میرے فخر سے پہ اس کے چہرے کی رنگت کا شہنشاہ ہو جانا ظاہر کر رہا تھا کہ میرے کوئی حوالہ دینے بغیر بھی وہ بخوبی سمجھ گئی تھی کہ میں نے یہ بات کیوں کی۔

"تم اسنے ناراض ناراض سے کیوں رہنے لگے ہو؟"

"کیونکہ کوئی مجھے "راضی" رکھتا ہی نہیں۔"

"بولتے تو پہلے بھی بہت تھے اور بہت خوب بولتے تھے، اب حاضر جوابی پہلے کے مقابلے میں دگنی ہو گئی ہے۔"

"اور بھی بہت کچھ ہے جو پہلے کے مقابلے میں دگنا ہو گیا ہے۔"





مگر شادی والے دن اور عین نکاح کے وقت میری اتنی طویل غیر حاضری انہیں تشویش میں مبتلا کر سکتی تھی، اسی لئے میں حمزہ کی طرف چلا آیا۔ حمزہ نے فون پہ پاپا سے وہی کہہ دیا، جو میں نے کہا تھا، مگر پاپا کی تسلی نہ ہوئی۔ وہ اسی وقت قریب چھوڑ کر آتا چاہتے تھے۔ اس کے بعد میں نے بھی فون پہ پاپا سے کہہ دیا کہ میں بالکل خیریت سے ہوں، وہ آرام سے ہانی کو رخصت کرنے کے بعد مجھے لینے آجائیں، شاید میری آواز سے ان کی تسلی ہوگئی تھی، کیونکہ اس کے بعد انہوں نے مزید اصرار نہ کیا۔

☆=====☆

ویلہ ایک دن کے وقفے سے تھا، مگر میرے حادثے کی اطلاع ملنے ہی شادی کے اگلے روز بلال احمد بمعہ اپنی بیوی نوبیہ دہن کے میری عمارت کو آیا۔ بلال احمد وہ شخص تھا جو آج کل میری بے انتہا نفرت کا نشانہ بنا ہوا تھا، یعنی اپنی کا شوہر، میں ایسے بھی کہہ سکتا تھا کہ ہانی اپنے شوہر کے ساتھ آئی، لیکن یہ غلط ہوتا تھا، اس کا شوہر ہی اس حادثے کی وجہ سے دنیا داری اور جنس داری کے تقاضے پورے کرتے ہوئے اسے لایا تھا، اس کے بس میں ہوتا تو وہ کبھی میرے سامنے نہ آتی۔

بلال احمد خاصا باتونی شخص لگ رہا تھا، جلد بے تکلف ہو جانے والا مجھے لگا، جیسے ہانی کو اس کا مجھ سے محل مل گیا تھا، میں کہتا رہا نہیں آ رہا۔ شاید وہ خوفزدہ ہو کر میں اس کے سامنے یہ کہہ لیا نہ اگلے دنوں جس سے وہ مشکوک ہو جائے اور میرا ایسا کوئی ارادہ تو نہ تھا۔ مگر عادات سے مجبور، صرف اس کو چرانے کی خاطر..... میں..... جو بلال سے اکھڑے لہجے میں بات کر رہا تھا اس کی تمام تر گرم جوشی کے باوجود..... اب اچانک ہی اسے اطلاع ہو گیا۔

”مسٹر بلال! اتنا تو میں بھانپ چکا ہوں کہ یہ اریخ میرج کمر او لو میرج زیادہ ہے، چاہے بتی کچھ بتائے یا نہ بتائے۔“ میں نے ”بتی“ کہتے ہوئے ضرورت سے زیادہ ہی شہد کھول لیا اپنے لہجے میں۔

”لیکن تفصیل آپ سے سننا چاہوں گا، مسٹر بلال۔“

”پہلے تو تم یہ بتاؤ کہ یہ مسٹر بلال کیا ہوتا ہے، کبھی رشتہ ہے ہم دونوں کے درمیان، سالے بہنوئی کا ہم تجھے بھائی جان، دولہا بھائی وغیرہ کچھ بھی کہہ سکتے ہو، بلکہ اگر زیادہ قلمی انداز میں پکارا ہو تو بیجا بھی کہہ سکتے ہو۔“

وہ چوتھا شخص تھا جو زبردستی ہانی کو مجھ سے ایسے رشتے میں جوڑ رہا تھا۔ جس کا تصور بھی میں نہ کرنا چاہتا تھا۔

”آپ سے کس نے کہا کہ آپ میرے بہنوئی تگتے ہیں۔ میری کوئی بہن نہیں۔“ میرے لہجے کی خشکی پہ غور کے بغیر وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

”ہاں آئی نے بتایا ہے تم دونوں کی دوستی کے بارے میں کہ بہت کم عمری سے تم ہانی سے منچ ہو گئے تھے۔“

”ہاں، بہت کم عمری سے، لیکن لوگ کہتے ہیں کہ کم عمری کے جذبات سطحی اور ناپائیدار ہوتے ہیں بلکہ ”کم عمر“ ہی ہوتے ہیں۔“

”نہیں میرا تو خیال ہے کہ کم عمری میں پیدا ہونے والی وابستگیاں زیادہ دیر پا اور شدت پسند ہوتی ہیں۔“ میں نے عجیب جتنے والی نظروں سے ہانی کو دیکھا جس کی پیشانی ٹھنڈا آلود تھی اور وہ بے چینی سے اپنی اٹھلائی مسل رعبی تھی۔

”ابنی دے، بتی کا دوست ہونے کے ناطے تو تم مجھ سے زیادہ بے تکلف ہونے کا حق رکھتے ہو، اگر تمہیں میرا سالانہ بننے پر اعتراض ہے تو تم یار بن جاؤ، اسے بھی تم نام سے پکارتے ہو، مجھے بھی صرف بلال کہہ لیا کرو۔“

”لیکن بتی میرے لئے صرف دوست نہیں، وہ تو اس سے بھی.....“ میں اس کی گھبراہٹ کا بھرپور لطف لے رہا تھا جو اچانک میری بات کا کٹھ گھڑی ہوئی تھی۔

”بلال! میرا خیال ہے کہ اب ہمیں واپس چلنا چاہیے۔“

☆=====☆

”کیا.....؟ مگر کب؟ اب کہاں ہے وہ؟“

میں حیران پریشان فون پہ بات کر رہا تھا۔ خبری کچھ اسی تھی۔

اس کی شادی کو چھ روز گزر چکے تھے، بلال احمد سے اس کی پہلی ملاقات کے بعد بھی میں دو تین بار ملائین اس میں نے خود پہ قابو پا لیا تھا، ہانی کو خوفزدہ کرنے کے لئے وہ بے پروا گفتگو کرنے والی حرکت مجھے جھجکا نہ محسوس ہو رہی تھی۔

میری واپسی کی سیٹ کسٹرم ہو چکی تھی اور میں یہ چار دن صرف اور صرف اپنے پرانے فریئرز کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔ اس وقت بھی میں حمزہ، راجیل اور دوسرے سکول ٹیپوز کے ساتھ ریسٹوران میں بیٹھا تھا جب موبائل پہ پاپا کی اطلاع نے میرے ہوش اڑا کے رکھ دیئے۔

”بلال احمد کا ایک میریس روڈ ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ اسے ایک پرائیویٹ ہاسپتال شفٹ کر دیا گیا ہے اور اب سے کچھ دیر بعد اس کا آپریشن ہونے والا ہے۔“ پاپا کے احوال

سے صاف لگ رہا تھا کہ اس کی کنڈیشن نازک ہے۔ ہانی سے گہری ناراضی اور بلال احمد سے شدید نفرت کے باوجود میں اپنے دل کو روک نہیں پایا۔ وہاں سے شادمان تک، اس ہاسٹل میں جاتے ہوئے کتنی ہی بار ہانی کا چہرہ میری نظروں کے سامنے آیا۔

جب وہ مایوں کے زور لباس میں بھی آئے والے دنوں کی بے پایاں سرت کے خیال سے گھایا چمکاکاری تھی۔

اور مہندی لگواتے ہوئے اس کی وہ پراستھانی مسکراہٹ۔

شادی کے بعد اس کے ہر انداز سے چمکلی آسودگی۔

کیا ہوگا اگر بلال احمد نہ رہا تو؟ میں نے تصور میں ہانی کو سفید لباس میں چوڑیاں توڑتے اور تین کرتے ہوئے دیکھا۔ میرے قدم ایک دم بریک نہ جار کے اور میرا دل پوری رفتار سے دھڑکنے لگا۔

”ایک تو فلمی اثرات پہنچ نہیں کب میرے ذہن سے دور ہوں گے۔“ میں نے خود کو اس فلمی سین کے سونپے پر طعن لگی۔

دشمن سے روم نمبر وغیرہ معلوم کر کے میں وہاں گیا تو خالی بیڈ اور سنان کرہ مجھے عجیب سے دہم میں ڈال گیا۔ میں نے نزدیک سے گزرتی ٹرس سے دریافت کیا تو پتہ چلا کہ مریض اس وقت آپریشن ٹیبلر میں ہے۔

کوئی دور میں بہت سے انجانے چروں میں پایا، ماما اور ہانی کا شکر چہرہ دور سے نمایاں تھا۔

مجھ پہ نظر پڑتے ہی وہ تڑپ کے اٹھی اور تیری طرح میری طرف لپکی، میں ہلکا گیا۔ اسے تقریباً جھانکنے ہوئے اپنی جانب آتے دیکھ کر میں نہ جانے کیا سمجھا کہ اپنے بازو دا کر دیتے۔

اس وقت میں سب کچھ بھول گیا تھا۔

بھری سڑک پہ بڑے والا وہ تھمڑ بھی۔

پاپا کے ہاتھوں ہوئی یہ غزنی بھی۔

گھر سے دور کی زبردستی کے طوق کی طرح ڈالے وہ دو سال بھی۔

اپنے اور اس کے درمیان پیدا ہوئے اس سرد طویل سے قاصد کو بھی۔

یاد رہا تو صرف یہ کہ وہ ہانی ہے۔ ہانی۔ میری بیٹی۔ وہی بیٹی جسے پہلی بار میں نے دیکھا تھا تو تب بھی وہ ایسے ہی رو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک عزیز بہتی کوکو

دینے کے دکھ کے ساتھ ساتھ اپنے مستقبل کے بارے میں ایسی ہی خوف نمایاں تھا اور مجھے اس دن کی منور آنکھوں کو دیکھ کر مجھے لگا تھا کہ جیسے ان سے زیادہ اداس آنکھیں میں نے کہیں اور۔ کبھی اور۔ نہ دیکھی ہوں ویسا ہی احساس آج بھی ہوا تھا۔ اس کا بیچلا چہرہ دیکھ کر جب بھی مجھے لگا تھا قیاس میرے اپنے گال بھیگ گئے ہوں، آج بھی مجھے وہی غمی محسوس ہو رہی تھی۔ اس دن کی طرح اب پھر مجھے اپنے حلق میں پھنسے اکتے محسوس ہوئے۔ میری آنکھیں جلنے لگیں، مجھے لگا، میں پھر سے رو دوں گا۔

میں نے بڑی مشکل سے آنسوؤں کو نکلنے سے روکا۔ آج میں ایسا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس لئے کہ تب جب میری لپکی بندھی گئی تھی۔ ایسے ہی بلا وجہ۔ تب اس نے مجھے اپنے بازوؤں میں سین لٹایا، مجھے چپ کر پایا تھا۔ آج میں یہ قرض ادا کرنا چاہتا تھا۔ اس کے آنسو خشک کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کے قریب آتے ہی اپنے بازو پھیلا دیئے۔ وہ میرے قریب آئی، بہت قریب۔ مگر میرے شانے پہ سر رکھ کے رونے کے لئے نہیں، بلکہ میرا گریبان پکڑ کے سمجھوڑنے کے لئے۔

”کیوں کیا تم نے ایسا؟ صرف یہ ثابت کرنے کے لئے کہ تم سچے ہو۔۔۔ اور۔۔۔ اور میں غلط۔۔۔ جو ہمیشہ تمہاری بدتمیزیوں کو تمہارا بچپنا اور نادانی سمجھ کے نظر انداز کرتی رہی۔“

وہ میرے کار کو اتنے زور سے جھٹکے کہ وہی غمی۔۔۔ میرا وجود زلزلوں کی زد میں آیا ہوا تھا۔ اس کے باوجود میں اپنے ہیروں پہ کھڑا تھا، کیا یہ حیرت کی بات نہیں تھی؟

اور سب کے لئے بھی یہ خطر حیرت انگیز تھا۔ اور ہانی کے الفاظ بھی۔ سوائے پایا کے۔ انہیں اعزاز ہو گیا تھا کہ میرے وہ چھ بات صرف لگم کے ذریعے کاغذ پہ نہیں پھیلے تھے، بلکہ زہر بن کے ہانی کے اندر بھی دوڑ رہے تھے۔ وہ تانسف سے مجھے دیکھنے لگے۔ ماما کے چہرے پہ الیتہ اُجھمن کے ساتھ ساتھ ناگوار بھی تھی۔

”تم کہتے تھو جنہیں مجھ سے محبت ہے، کسی محبت ہے یہ سدا محبت کرنے سے پہلے تو یہ کیوں لینے کہ محبت کرتے کیسے ہیں۔“

وہ ہلک ہلک کر روتے ہوئے اب نیچے کی طرف جبک رہی تھی۔ شاید اس کے اندر اب اپنے وجود کو سہارنے کی ہمت نہ رہی تھی۔ میرا گریبان اب بھی اس کی ٹھٹھوں میں دبا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ مجبوراً مجھے بھی جھکنا پڑا۔ وہ اب کھنکھوں کے تل فرش پہ بیٹھی ہتھکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔

”بہت قصہ آتا ہے نا جنہیں، جب میں جنہیں چھو نا کہتی ہوں لیکن اب تم خود اپنی نظروں

میں کہتے چھوٹے ہو گئے ہوا اس کا احساس ہے کہ جیسے؟“ میری آنکھوں سے بہتے آنسوؤں سے نہ جانے وہ کیا بھی۔ شاید یہ کہاتے لوگوں میں تماشا بننے کی ذلت مجھے رلا رہی ہے۔ حالانکہ میرے آنسوؤں کا اس کے آنسوؤں سے بڑا گہرا اثر تھا۔

”کیوں کیا تم نے ایسا؟“ شبت سے اس کی آواز پھٹ سی گئی۔

”کیوں مارا تم نے بلال احمد کو؟ میں تو تم سے ناراض ہونے کے باوجود تمہارے لئے دعائیں ہی مانگتی رہی اور تم..... تم نے میری زندگی کی واحد خوشی بھی مجھ سے چھین لی۔“ حیرت کا حملہ اتنا شدید تھا کہ میں تردید تک کرنا بھول گیا۔ پایا آگے بڑھے اور اسے شانوں سے قہار کر اٹھانے لگے۔

”کیا ہو گیا تمہیں ہانی ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو۔ کچھ بھی نہیں ہوا بلال کو، دعا کرو اس کا آپریشن خیریت کے ساتھ ہو جائے۔“ پایا نے اس سے اتنا کچھ کہا..... مگر نہ کہا تو بس یہ..... سعد نے میرے بیٹے کو کچھ نہیں کیا وہ ایسا کچھ نہیں کر سکتا، میں نے مدد طلب نظروں سے ماما کی جانب دیکھا، وہ تڑپ کے آگے بڑھیں۔

”کیا کہہ رہی ہے یہ لڑکی؟“

اس وقت ان کے لہجے میں اس قدر اجنبیت تھی کہ دکھ اور غصے سے حواس کھوئی ہانی بھی حیرت سے اپنا صدمہ بھول کر انہیں دیکھنے لگی۔

”کیا صدمے نے اس کے دماغ پر اثر کر دیا ہے۔“ وہ پایا کی معنی خیز خاموشی سے بھی الجھ رہی تھیں۔

”کیا مقصد ہے اس بے سرو پا گفتگو کا۔ اتنے لوگوں میں تماشا بنانے کی آخر کیا نیکی ہے بھلا۔ اسے اتنا احساس نہیں کہ یہاں اس کے ذرا سے کو اس کے پیچھا رسال والے بھی دلچسپی سے حراسے لے لے کر گردید رہے ہیں۔“

وہ آواز دبا کے مکرخت ترین لہجے میں بات کرتے ہوئے باری باری پایا اور ہانی کو غوراً غور نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی باتوں سے اتنا ضرور ہوا کہ یواگ کی حد کو چھوٹی ہانی کم مسمی ہو کے ارد گرد کھڑے لوگوں کو دیکھنے لگی تھی۔ اس نے ابھٹکی سے میرا اگر بیان چھوڑا اور ہارے ہوئے انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

”پاپا! جانے سے پہلے میں صرف ایک وضاحت کر دوں کہ..... پایا میں نے..... میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں نے واقعی کچھ نہیں کیا۔ بلال احمد کو پیش آنے والے حادثے میں میرا کوئی ہاتھ نہیں، میں ایسا کری نہیں سکتا۔ میں تو اپنے فریضہ کے ساتھ.....“

”مجھے پتا ہے۔“ پاپا نے میری بات کاٹ دی اور میرے شانے پہ ہاتھ رکھ کے مجھے خود سے قریب کیا۔

”میں جانتا ہوں، بلکہ سب ہی جانتے ہیں بلال احمد اپنی تیز رفتاری کی وجہ سے ایک بس سے کارنگرا بیٹھا۔ تمہاری طرف دھیان جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم میں سے کسی نے اس کی بات کو تنبیہ کی سے نہیں لیا تھا، البتہ اس وقت اس کی ذہنی حالت کے پیش نظر اس کے بے حس و معنی وہم کی فوری تردید بھی اس کے سامنے نہ کر سکے۔ ویسے بھی اب تو سب کچھ ٹھیک ہو چکا ہے۔ بلال کا آپریشن کامیاب رہا ہے۔ دو ایک روز میں وہ گھر آجائے گا۔“

”یعنی آپ اب مجھ سے ناراض نہیں ہیں۔“

”میں تم سے کبھی بھی ناراض نہیں تھا۔“ انہوں نے مجھے گلے سے لگایا۔

ماما کے بہت کہنے کے باوجود میں نے اپنی داہنی کی تاریخ آگے نہیں کروائی، میں اب اور دوبارہ نہیں کہنا چاہتا تھا، ہانی کا دوبارہ سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا، مجھے عمر بھر شرمندہ کرتے رہنے کے لئے ہانی کی بس اس دن کی باتیں ہی کافی تھیں۔

بلال احمد کا بلڈ گروپ مجھ سے کچھ کرتا تھا، میں نے ڈاکٹرز سے کہہ دیا کہ انہیں جتنا بھی خون چاہئے وہ میری رگوں سے کچھ لیجیں اور اس شخص کے جسم میں داخل کر دیں جس سے پہلی نظر میں ہی میں نے انتہائی شدید غرت کا رشتہ باندھ لیا تھا، اس غرت کے باوجود میں نے دو راتیں اس کے کمرے میں کسی خادم کی طرح جاگ کر گزار دیں۔ اس نے ہوش میں آنے کے بعد سب سے پہلے میرا چہرہ دیکھا، ہانی تو ڈاکٹر کی ہدایت کے پیش نظر کمرہ چلی۔ وہ لولہ پذیر بشر کی پھٹت تھی اور اب اس وقت اس کا بانی کی خطرناک حد تک لوٹا اس کے علاوہ اس حادثے نے اس کا نروس سسٹم بھی متاثر کیا تھا۔ بلال کی ہر طرح کی دیکھ بھال اور دواؤں اور تین دنوں میں، میں نے ہی کی۔ وہ اکھلا نا، سوپ، پلانا، چلنا کالٹ کے دن اس کا مزہ صاف کرنا، یہ سب میں صرف یہ ثابت کرنے کے لئے کرتا تھا کہ سعد رضوان بڑا ذراہ کو بھی محبت کرتا آتی ہے اور یہ مجھے کسی اور پہ نہیں خود پہ ثابت کرنا تھا۔ ہانی کے اس الزام کو بھوننے کے لئے..... کہ.....

”سعد رضوان! محبت کرنے سے پہلے یہ سیکھ لو لینے کہ محبت کرتے کیسے ہیں۔“

اور میں..... اب سینے کے مرطلے سے گزر رہا تھا۔

آٹھ سال کی عمر میں، میں نے محبت کی۔

چھوڑا سال عمر میں محبت کا احساس ہوا۔

پندرہ سال کی عمر میں، میں نے محبت کا اظہار کیا۔

مولہ سال کی عمر میں، میں نے محبت کا دکھ اٹھایا۔  
اور اب..... بیسویں سال میں، یعنی اس سے ملنے کے بارہ سال بعد میں نے محبت کو  
سیکھنا شروع کیا۔  
یہ پڑھائی میرے دل کے بوجھ کو رنڈہ رنڈہ کرتی جا رہی تھی۔  
☆=====☆  
میں شاید تم کو بیکر بھولنے والا ہوں۔

شاید.....

جان جاں شاید.....

کتاب تم مجھ کو پہلے سے زیادہ یاد آتی ہو۔

ابھی تو میں نے اس بوجھ سے آزادی حاصل کرنے کی جانب پہلا قدم بڑھایا تھا کہ  
ہائی کا خط میری رفتار کو دھما کرنے آ گیا۔ مجھے آئے دو ہفتے ہوئے تھے جب ایک خوبصورت  
معدرتی کاڈر کے ہمراہ اس کا تحریر کردہ مختصر سا خط موصول ہوا۔  
”سدر رضوان!“

مجھ میں نہیں آتا کہ اس خط میں کیا لکھوں، جنہیں مخاطب کروں تو کس انداز  
میں؟ تم سے معذرت کروں تو کس الفاظ میں؟ تم سے معافی مانگوں تو کیسے؟ صرف  
اتنا لکھوں گی کہ جب کسی کو اپنے ہاتھ سے کسی ایسے ہاتھ کے چھوئے گا اندیشہ لاحق  
ہو جائے جس کے بغیر وہ اک ہل چبے گا تصور بھی نہ کر سکتا ہو تو شاید اس کے حواس  
ایسے ہی مختل ہو جائے ہوں گے جیسے میرے ہوئے۔

یہ بلال سے میری شدید محبت تھی جو میں تم سے اتنا سب کہہ بیٹھی۔ یہ میری  
تم سے نفرت نہیں تھی سدا پناہیں کیوں مجھے ایسا لگا کہ تم نے بلال کو..... حالاکہ تم  
میرے لئے غم نہیں ہو، جنہیں میں آج سے نہیں کسی سالوں سے جانتی ہوں، لیکن  
سعد! میرا اپنی ”پچان اور پکھ“ ہے اس اعتماد انواں ڈول کرنے والے بھی تو تم  
ہی ہو۔ اب میں نے کسی بھی شخص کو اندر تک جان لینے کا دعویٰ کرنے سے تو بے کرلی  
ہے، یہ دعویٰ کبھی مجھے تمہارے متعلق تھا اور اس دعوے کو تم ہی نے ایک بار اپنے  
بچپن میں چٹکوں میں آزاد یا تھا۔ غلطی یقیناً میری تھی جو میں تمہاری اس حرکت کو  
دل سے معاف نہ کر پائی۔

تم واپس لوٹے تو ایک بار پھر تمہاری زبان سے وہ سب سن کر میں نے فرض

کر لیا کہ تم اب میرے بچپن کے بھولے سے قلم دوست نہیں ہو۔ اسی لئے بلال  
کے ایک ڈیکٹ سے میرا دماغ آغ گیا اور میں بغیر سوچے سمجھے تمہیں الزام دینے لگی۔  
تمہارے جانے کے بعد انکل نے اور خود بلال احمد نے مجھے بتایا کہ تم میری اس  
قدر بکواس سننے کے باوجود بھی میری خاطر کیا کچھ کرتے رہے۔  
تمہارا بلال کو خون دینا، اس کا خیال رکھنا اس کے لئے رات رات بھر  
جاگنا.....

یہ سب میرے علم میں آ گیا اور میں ایک بار پھر سوچ میں پڑ گئی کہ کیا واقعی  
مجھے اتنی عمر گزار لینے کے بعد بھی کسی کو رکھنا نہیں آیا۔ آج سے پہلے جب بھی میں  
نے تمہارے ساتھ اپنے گزشتہ روئے کو یاد کیا میں نے خود کو قحط بجانب سمجھا۔ میرا  
خیال تھا کہ مجھے تم سے اس سے بھی زیادہ سختی سے پیش آنا چاہئے۔

لیکن آج سوچتی ہوں تو سوائے افسوس کے اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ یہ افسوس  
اس بات کا ہے کہ میں کچھ بھی کر لیتی، تمہارے لئے دل میں ایسی کوئی تمنا نہ پیدا  
نہیں کر سکتی تھی۔ یہ میرے لئے ممکن ہی نہیں تھا۔ نہ پہلے کبھی، نہ بعد میں، میں  
تمہاری محبت کا جواب محبت سے دینے کے لئے خود کو نااہل سمجھتی ہوں اور یہ نااہلی  
میری زندگی کا سب سے بڑا افسوس ہے۔“

وہ کیا کہنا جانتی تھی، میں سمجھ بھی رہا تھا اور ٹھیک طرح سے سمجھ بھی نہیں رہا تھا۔ صرف  
ایک احساس تھا جو اندر تک اترا جا رہا تھا اور وہ کہ..... میں اس ”شاید“ سے کبھی نہ بھل پاؤں گا۔  
پاکستان چھوڑنے کے ساتھ ہی میں نے اس جذبے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا جو  
میرے لئے ہمیشہ ایک معرہ بنا رہا۔ پتا نہیں یہ جذبہ ضد تھی، انا تھی، یا محبت، نفرت یا پھر  
کشتش..... یہ جو بھی تھا میں نے اسے بھول جانے کی قسم کھائی تھی کہ اس کا یہ خط اور سب سے  
بڑھ کے افسوس مجھے پھلے اس ”شاید“ کی دلدل میں دھسنے لگا۔

”اے مجھ سے محبت نہیں کر گیا یہ کم بختی بات ہے کہ اس نے میری محبت کو تسلیم کیا اور  
یہ بھی کہ مجھ سے محبت نہ کرنے پر اسے ہمیشہ افسوس رہے گا۔“

میں خوش فہم ہو گیا۔ حالانکہ یہ اتنی بڑی بات بھی نہ تھی کہ میں خوشی سے بے قابو ہوتا  
پھرتا۔ وہ ایک شخص کی بیوی تھی، اس سے قلم دوستی اور اس سے محبت بھی بے پناہ کرتی تھی۔ اس  
نے یہ خط میری یاد میں بے قرار ہو کے نہیں لکھا تھا، بلکہ اپنے اس رویے کی بدصورتی کی  
معذرت کرنے کے لئے لکھا تھا اور اسے ایسا کرنا بھی چاہئے تھا، یہ اس کا اخلاقی فرض تھا۔

احسان تو نہ کر رہی تھی وہ..... اور اس خط میں بھلا کیا لکھا تھا..... یہی تا کہ وہ چاہے بھی تو میرے متعلق ایسا بھی نہیں سوچ سکتی پھر میں اتنا خوش کیوں ہو رہا ہوں۔ کیا صرف اس لئے کہ جس محبت کے بارے میں مجھے خود شک سا تھا کہ شاید ہے، شاید نہیں۔ اسے ہنی نے پوری سچائی سے تسلیم کر لیا ہے۔

”اور شاید یہ بلال احمد درمیان میں نہ ہوتا تو وہ اپنی نااہلی پہ افسوس کا اظہار بھی نہ کر پاتی۔“

ایک اور شاید نے دل میں جگہ بنائی۔

تمہارے رنگ مجھ میں اور گہرے ہوتے جاتے ہیں

میں ڈرتا ہوں

میرے احساس کے اس خواب کا انجام کیا ہوگا

اے میرے اندرون ذات کے نارنج کر

جنبات کے ہیری وقت کی سازش نہ ہو کوئی

تمہارے اس طرح ہر لمحہ یاد آنے سے

دل سہا ہوا ہے

تو پھر تم کم ہی یاد آؤ۔

☆=====☆

اس بار میں پانچ سال کی طویل مدت کے بعد وطن واپس لوٹ رہا تھا۔

ان پانچ سالوں میں بہت کچھ نہیں بدلا تھا مگر جو تبدیلیاں آئی تھیں، وہ اتنی اہم تھیں

کہ زندگی کی ساری ڈگری مختلف ہو گئی تھی۔

ایک تبدیلی تو یہ آئی تھی کہ میں نے خود اذیتی کے چاک مار مار کے دل کو مستقل مزاجی

کی راہ میں لگایا تھا۔ میں نے ہنی کو بھلائے کی ہر شے کو بخش کرنے کا عہد کیا خود سے اور

یہ تہیہ بھی کر کے کہ میں اسے بھلائے بھی یاد تو کم اذکم اس کے بارے میں اب مزید کسی غلط فہمی یا

خوش فہمی کی محبت نہیں رکھتی۔ اس ایک خط کے بعد ہانی نے مجھ سے دوبارہ رابطہ قائم کرنے

کی کوشش نہیں کی۔ میں نے بھی اس خط کا کوئی ریسپنس ظاہر نہ کیا تھا۔ میں نے ناپا اور ماما سے

واسطہ الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ میں اب پاکستان آنے میں دلچسپی نہیں رکھتا، اسی لئے وہ خود ہی

سال ڈیڑھ سال بعد مجھ سے ملنے آیا کرتے۔

دوسری تبدیلی دو سال پہلے ہونے والی پاپا کی اچانک وفات تھی۔ وہ یہیں میرے پاس

امریکہ آئے ہوئے تھے۔ ماما بھی ساتھ تھیں۔ لوگ اس ملک میں کئی بیماریاں سمیٹ لاتے ہیں، علاج کی نیت سے..... پھر یہاں کے شہیدہ مگر ڈاکٹروں کی بدولت برسوں کی تکالیف کو جھٹک کر پھیلے پھیلے ہو کر واپس جاتے ہیں مگر میرے پاپا ٹھیک ٹھاک آئے اور آنے کے تیسرے دن ہی انہیں ہارٹ ایکٹ ہوا۔ ایبویسن سے ہا پائل لے جاتے ہوئے راستے میں ہی انہوں نے دم توڑ دیا۔

پاپا کا کوئی قریبی عزیز یعنی ماں، باپ، بہن، بھائی تو اب رہا نہیں تھا۔ کلونی بھیجتی یعنی ہانی بھی ان دنوں اپنے شوہر کے ساتھ عمرہ ادا کرنے گئی ہوئی تھی، اسی لئے ماما سے مشورہ کرنے کے بعد ان کی آخری رسومات یہیں ادا کر کے تدفین کر دی گئی۔

میں نے بعد میں ماما سے بھی بہت کہا کہ وہ یہیں رک جائیں، مگر انہیں اپنے وطن کی یاد ستا رہی تھی۔ ویسے بھی یہاں رہ کر وہ اپنی زندگی گزارنا تو بھول ہی گئی تھیں۔ میں نے بھی غور کیا تو پاکستان جانا ہی ماما کے لئے بہتر سمجھا۔ وہاں جا کر وہ اپنے انسٹی ٹیوٹ کی مصروفیات میں مگن ہو کر زیادہ جلدی خود کو پاپا کی اچانک وفات کے صدمے سے نکال پائیں گی۔ یہاں انہیں ماحول میں بغیر کسی روٹین اور مصروفیت کے وہ قوطیت اور یاسیت کا شکار ہو رہی تھیں۔ البتہ میں نے ان سے یہ وعدہ ضرور لے لیا کہ وہ ایک دو سالوں تک پاپا کا پرنس وائٹز آپ کر کے اور اپنا انسٹی ٹیوٹ ختم کر کے یہیں لوٹیں گی اور یہ مائٹل میک آپ کر کے آئیں گی کہ اب انہیں یہیں رہنا ہے۔ وہ میری بات سن کر چپ ہو گئیں پھر ایک شرط پر یہ وعدہ منظور کیا۔

”اگر رضوان یہاں نہ ہوتا تو شاید میں کبھی اس طرح تمہاری یہ شرط نہ باقی لیکن پھر بھی ایک وعدہ کرنا ہوگا۔ اپنی انجکشن سپلیٹ ہوتے ہی تم پاکستان آؤ گے۔ خدا اپنے پاپا کی ساری پراپرٹی کا فیصلہ کرے کہ اس کا کیا کرنا ہے۔ اس کے بعد تم پاکستان میں ہی کسی انجکشن فیلٹی کی لڑکی سے شادی کر لو گے، چاہے وہ تمہاری اپنی پسند ہو یا پھر میری پسند۔ پھر اگر تم امریکہ اپنی فیلٹی کے ساتھ سیٹل ہوتا جاؤ تو مجھے بھی تمہارے ساتھ آنے میں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“

اور میں جو بھی وہاں نہ جانے کی قسم کھائے بیٹھا تھا، میں اس پہ قائم نہ رہ سکا۔ اس کے بعد میرے ڈیڑھ سال بعد میری طرف مگر رہے۔

انگریزوں سے فراغت ملنے ہی ماما نے مجھے اپنا وعدہ یاد دلایا۔ میں نے خود کو ڈنڈا کہیں کسی دہم، کسی انجکشن، کسی چھوٹے کا گزر نہ تھا، کسی بیٹے کی ناخوشگوار آہٹ نہ تھی۔ عرصے بعد میں نے خود کو ہلکا جھکا محسوس کیا اور دل و دماغ کی تمام تر آمادگی کے ساتھ پاکستان جانے کی تیاری کرنے لگا۔

وہاں پہنچتے ہی مجھے جو چہرہ سب سے پہلے نظر آیا وہ ہانی کا تھا۔

میں حیران رہ گیا۔ وہ ویسی کی ویسی تھی۔ حالانکہ پانچ سال کا عرصہ کم نہیں ہوتا۔ وہی اس کے مخصوص سادہ طرز کے بندھے ہوئے سیدھے سنگی ہال..... وہی اس کی دھل دھل شفاف سرخی آنکھیں جن میں دکھ ٹھہر سا گیا تھا، اداسی منجمد ہوئی تھی۔ میں ایک بار پھر دوہرائے بغیر نہ رہ سکا۔

”واقعی، اس سے زیادہ اداس آنکھیں میں نے زندگی میں کبھی اور کبھی بھی نہیں دیکھیں۔“

یقیناً مانا نے اسے میرے بارے میں بتایا ہوگا، اسی لئے وہ پہلے سے یہاں موجود تھی۔ پچھلی بار جب میں آیا تھا تو وہ جس نازل انداز میں مجھ سے ملی تھی، اب بھی اسی طرح ملی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہمارے درمیان کبھی کچھ ہو ہی نہ ہو..... نہ تنگ..... نہ گھٹتہ..... اچانک دھیان آنے پر میں نے ہلال احمد کے بارے میں دریافت کیا۔ وہ چپ ہو گئی اور سر جھکا کے اپنی پچھلی مسئلے لگی۔ وہی اس کی پرانی عادت۔ میں نے مانا کی طرف دیکھا ان کے چہرے پر ناگواری واضح تھی۔ میں نے فی الحال اس مسئلے کو چھوڑنا مناسب نہ جانا۔ بعد میں اس کے اپنے کمرے میں جانے کے بعد مانا نے خود بتایا۔

”خود ہی پسند کر کے شادی رکھائی۔ اب خود ہی بے زار بیٹھی ہے۔ پہلے دیکھنا تھا کہ اس وقتا نویں ماحول میں پرورش پانے والے ٹل کلاس ذہنیت کے شخص سے گزارہ ہو سکتا ہے یا نہیں۔ کیا پہلے اسے نہیں چتا تھا کہ اس کی ماں اندرون شہر کی پچھلے گاہم گھوج کرنے والی اور بھوک چوٹی اکھاڑنے والی عورت ہے۔ پہلے نہیں چتا تھا کہ.....“

”مانا! ہوا کیا ہے؟“ میں مانا کی شکایتیں سننے کے بجائے اصل بات جاننا چاہتا تھا۔

”ہوتا کیا ہے، وہی نکل نکل اور جیج جیج جیج کی بے جوش ڈاڈوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ٹھک آگئی ہوں میں تو۔ میں نے پہلے دن رضوان کو وارن کیا تھا کہ یہ پٹ پوچھنے ایسے ہی نہیں ہماری لڑکی پر لٹو ہوئے۔ سارا پیسے کا کھیل ہے اور میری بات جیج لگی۔ اب وہ ٹھک ہلال احمد جس نے اس وقت رضوان کی جانب سے ہماری فرم میں ایک اچھی پوسٹ لینے سے انکار کر دیا تھا اور جسے ہانی نے اس کی خودداری بتلایا تھا، وہی خود اور دشواریوں میں پڑا ہوا تھا رہا ہے کہ وہ اپنی ساری جائیداد اس کے نام کر دے اور یہ لڑکی جسے ہم بھر پیسے کی ذرہ برابر پر وہ نہیں رہی، اب چنانچہ اس طرح ضد پر لڑی ہے کہ وہ ایک دھیلا تک اسے نہ دے گی حالانکہ وہ

اس کا شوہر ہے، اگر اس کی جائیداد کی بدولت وہ کوئی اچھا کاروبار شروع کر لیتا ہے تو اسی کا بھلا ہے۔ بارہ ہزار کی جانب یہ کرتی ہے، پندرہ سولہ ہزار دہ کھاتا ہے ہر ماہ۔ آج کل کے دور میں کہاں گزارا ہوتا ہے اور اگر خدا نے دیا ہو اسے تو کیوں نہ فائدہ اٹھایا جائے۔ سلمان بھائی صاحب کی جائیداد کی اکیلی وارث ہانی ہی تو ہے اور رضوان نے بھی اس کے نام کی شیشز لے کر رکھے ہوئے ہیں پھر کیا ضرورت ہے اتنا پیسہ تن کے گزارہ کرنے کی، معمولی سی ملازمت میں سرکھپانے کی اور اپنی میر ڈلائف میں تنہا یا گھولنے کی۔“

”لیکن اس کا مطلب یہ بھی تو نہیں کہ وہ اپنا سب کچھ شوہر اور سرسرا والوں کے حوالے کر کے خود خالی ہاتھ ہو جائے۔ ایسے تو ان لوگوں کا لالچ بڑھتا جائے گا۔ میرا تو خیال ہے کہ ہانی جیسی متمتع مزاج اور خشنہ دماغ کی لڑکی اگر اس حد تک آتی ہے تو وہ یقیناً ان لوگوں کے ہی بے ڈھانچہ کارڈ پل ہے۔“

”اب جو بھی ہے، اگر جائیداد کے بدلے اس کا گھر اور گھر ہستی بچتی ہے تو کیا ہوا ہے۔ کوئی کم جائیداد تو نہیں کے پاس۔ بھائی صاحب کے ہوٹل کی رقم کا ہے۔ پچاس لاکھ کے شیشز تمہارے پاپائے اس کے نام کے تھے جب اس کی شادی ہوئی تھی۔ اپنے بیٹرس کا ایسٹ آباد والا بنگلہ تو اس کا ہے ہی۔ تمہارے پاپائے بھی اپنی زندگی میں اسلام آباد والا فلیٹ اس کے نام کیا ہے اور تمہاری وادی نے بھی لاکھوں کی مالیت کے خاندانی زیورات کا ایک بڑا حصہ.....“

”مانا پلیز، آپ اس حساب کتاب کے بجائے غیر جانب داری سے سوچئے۔ بات صرف روپے پیسے کی نہیں، اعتماد اور محبت کی ہے۔ ہانی نے ہلال احمد میں کیا دیکھا تھا۔ ذہانت، قابلیت، حیثیت، کس حیثیت سے وہ اس کا ہم پلہ تھا؟ شاید اسے ہلال احمد کی خوشامختی اور وقتی خودداری ہی نے متاثر کیا ہو اور جب یہ طبع آڑا ہوگا تو پالیسی میں وہ اتنا شدید رویہ اپنانے پر مجبور ہو گئی ہوگی۔“

”تو کسی نے مجبور کیا تھا اسے یہ شادی کرنے پر۔ اپنے کے فیصلے پر وہ اب بچھتا رہی ہے۔ اگر کہیں ہمارے پسند کے رشتے پر ہاں کر بیٹھتی تو نہ جانے کتنے دن برداشت کرتی۔ اگلے ہی مہینے وہاں آگئی ہوتی۔ تمہارا کیا خیال ہے، وہ صرف ناراضی ظاہر کرنے یہاں بیٹھی ہے؟ علیحدگی کا پکا ارادہ کر لیا ہے۔ صاحبزادی نے۔ طلع کا مقدمہ دائر کر دیا ہے۔ میں پوچھتی ہوں، ایسی بھی کیا ہوں دولت کی۔ کر ڈوڈوں کی اکیلی وارث ہو۔ دو چار کر ڈوڈو شوہر کو دے کر کوئی کاروبار جمادو اس کا۔ ساس ننڈیں لالچی ہیں تو دس لاکھ مت پر مارواں کے اور ہمیشہ

”ہاں، شاید میں غلط سمجھ رہی ہوں۔“ میرے شرمندہ شرمندہ سے چہرے کو اپنے دلوں ہاتھوں میں تمام کے ماما نے کہا۔

”میرا بیٹا! انہیں، وہ ایسا کر ہی نہیں سکتا۔ اگر اس وقت رضوان نے سب کچھ مجھ سے پوشیدہ رکھنے کے بجائے، مجھے آگاہ کیا ہوتا تو اس سب کی نوبت ہی نہ آتی۔ چند روزہ سائلہ کے کو بھلا اتنا شعور کیسے کہ وہ ایک لڑکی..... اور بھی اس جو اس سے عمر میں کئی سال بڑی ہو، اس کے لئے ایسے جذبات رکھے۔ یہ سب ہانی کا کیا دھرا ہے۔ اس نے تمہیں شدہ دی ہوگی، تمہیں بھڑکایا ہوگا۔ جان بوجھ کر ایسے حالات پیدا کئے ہوں گے کہ تم.....“

”فاقہ زد سب ماما“ میں چلا اٹھا۔ ”آپ کو کیا ہو گیا ہے، کس قسم کی سوچیں پال رکھی ہیں آپ نے۔ ہانی کے بارے میں ایسی بات آپ کیسے کر سکتی ہیں۔ کیا آپ اسے نہیں جانتیں؟“

”میں صرف تمہیں جانتی ہوں تم میرے اگلوتے بیٹے ہو، میرا واحد سہارا۔“

”وہ اتنے سالوں میں آپ کے سامنے ہے، آپ کو اب تک اندازہ نہیں ہو پایا کہ وہ کیسی ہے۔“

”تم ہمیشہ سے میرے سامنے ہو، پیدا کیا ہے میں نے تمہیں۔ کیا مجھے اندازہ نہیں کہ تم کیسے ہو۔“

”تمہیں سب آپ کو اندازہ۔“ ان کے مسلسل ایک ہی ٹکرا کر رہنے پر میں زنج ہو گیا اور پھٹ پڑا۔ ”آپ کو اندازہ ہو چکا کیسے، آپ صرف یہ کہہ سکتی ہیں کہ تم ہمیشہ سے میرے سامنے ہو، مگر بات نہیں کر سکتیں۔ اپنی عمر کے ابتدائی چھ سال میں نے آپ کی گود میں گزارے۔ سکول جانے کے بعد میری ذمہ داری ٹیچر اور ٹیچر نے اٹھائی۔ ہانی آئی، وادی آگئیں اور آپ بالکل ہی بے فکر ہو گئیں۔ میں کس سنجیدگی میں کمزور تھا، مجھے کھانے میں کیا پسند تھا، کیا لگاؤ دے کر مجھے ناشہ کرنے پر تیار کیا جاتا تھا، مجھے ذرا رنگ سے دلچسپی یا یاد یو گیمز سے، مجھے رات کو کس وقت نیند آتی تھی، میں اپنا فارغ وقت کیسے گزارا کرتا تھا..... یہ سب آپ نہیں جانتی تھیں، نہ ہی آپ نے بھی جانتا چاہا پھر آپ کس مل بوتے پر یہ دھوئی کر رہی ہیں۔ مجھے جانے کا دھوئی ہے تو پہلے یہ حقیقت سن لیجئے کہ آپ کے اس چھوہ چندہ سائلہ کے لئے جو کیا، مکمل ہوش و حواس میں سراسر اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق کیا۔ مجھے آپ کی طرف سے مکمل آزادی، بے توہمی اور مکمل چھوٹ دینے وقت سے بہت پہلے بگاڑ دیا تھا۔

یہاں میں اتنی وضاحت کر دوں کہ میں عبت کو ”بگاڑ“ نہیں کہہ رہا میرے ماحول اور تربیت کی کمی نے مجھ پر جو اثرات مرتب کئے، ان کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں نے عبت کو بڑے ہی غلط

کے لئے چپ کرادو۔ کم از کم اپنی گھر یعنی اور زندگی کو محفوظ کر دو۔“

”ایسی خریدی ہوئی عبت اور زندگی کا کیا فائدہ ماما! یہ تو آپ بھی جانتی ہیں کہ ہانی کو پیسہ کبھی بھی عزیز نہیں رہا۔ اس نے شاید کبھی یہ بتانک لگانے کی کوشش نہ کی ہوگی کہ اس کے نام کیا کچھ ہے اور کتنا ہے۔ وہ تو اتنی سادہ دل اور سادہ طبیعت ہے۔ سو دے بازیاں کر کے وہ کبھی بھی خوش نہیں رہ سکتی تھی۔“

”بس بھی کر سو! جب سے آئے ہو، ایک ہی رٹ لگا رہی ہے، ایک ہی فکر کے پیچھے بلکان ہو رہے ہو۔ ہانی، ہانی..... کیا وہ اتنا ہی اہم مسئلہ ہے تمہارے لئے؟ وہ جانے اور اس کی زندگی۔ چاہے سنوارے، چاہے بگاڑے۔“

”ماما پلیز۔“ میں حیرت زدہ رہ گیا۔ ان کی اس درجہ لاشعقی پر۔ ”ماما! مت بھولیں، وہ ہماری ذمہ داری ہے۔“

”کبھی ذمہ داری؟ ہم یہ ذمہ داری نہا چکے ہیں۔ رضوان نے اپنی اولاد کی طرح اس کی پرورش کی۔ اس کی امانت، اس کے والد کی جائیداد کی حفاظت کی۔ اسے اچھی تعلیم دی، مناسب پرورش کی اور تو اور اس کی خاطر اگلوتے بیٹے کو گھر سے دور کیا۔ اسی کی پسند سے اس کی شادی محرم دھام سے کی، جاتے جاتے بھی وہ اسے نہ بھولے اور بیٹے کے ساتھ ساتھ اسے بھی جائیداد میں سے حصہ دیا۔ اب وہ تمہارے تباہی کی جتنی نہیں رہی، اپنے گھر بار والی ایک شادی شدہ عورت ہے۔ پھر ذرا دھمکی سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ تمہیں بلکان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہاں، اگر ہمیں اس کے لئے کچھ کرنا چاہئے تو صرف اتنا کہ اسے اس استعداد فیصلے سے باز رکھیں۔ اسے مجبور کریں کہ وہ طبع کا مقدمہ واپس لے کر صلح صفائی کی کوشش کرے۔“ انہوں نے سفاکی سے کہا۔

”سوری ماما! کم از کم تم تو ایسا نہیں کر سکتا، مجھے اس کا یہ فیصلہ بالکل درست لگ رہا ہے۔“

”اسی بات کا..... اسی بات کا دھمکاؤ مجھے۔“ ماما یک دم صدمے میں آ گئیں۔

”اب بھی تمہارے سر پہ اس کا جادو چڑھا ہوا ہے۔ میں نے بہت بڑی غلطی کی تمہیں آنے سے نہ روک کر۔ جس دن یہ اپنا گھر چھوڑ کر یہاں آئی، مجھے اسی دن تمہیں فون کر کے یہاں آنے سے منع کر دینا چاہئے تھا۔“

”آپ غلط سمجھ..... میں ان کے اندازے پر فحش سا ہو گیا۔ اگرچہ اس وقت میرے وہم و گمان میں دور دور تک ایسی کوئی بات نہ تھی۔ میں نے پوری غیر جانب داری اور حقیقت پسندی سے اس سارے معاملے کا تجزیہ کیا تھا۔

معتوں میں لیا اور بڑے ہی غلط انداز میں اسے ہنسی تک پہنچایا۔

”اب سارا الزام میری تربیت پہ آئے گا۔ یہ نوبت بھی آئی تھی۔“ لمارو نے لگیں۔

”اس کی چالیں کوئی نہیں سمجھتا۔ میں تمہارے آئے سے پہلے وہ شوہر سے الگ ہونے کا تہیہ

کر کے یہاں آگئی۔ جانتی ہے کہ اب میں نے تمہاری شادی کا ارادہ کر لیا ہے اس لئے۔“

”فلٹر ملایا! آپ کو خدا کا واسطہ ہے کہ اس ناپک کو چھوڑ دیں۔“ ان کے آنسوؤں سے

گھبرا کے میں نے ان کے ہاتھ تھام لئے۔ کچھ دیر مگر یہی تھا کہ اما کی بدترنج بلند ہوتی آواز

ہنسی تک نہ پہنچ جائے۔

”پہلے تم یہ وعدہ کرو کہ اب تم اس کے جال میں نہ پھنسو گے۔“

”او گاڈ!“ میں نے سر تھام لیا۔

☆=====☆

”تم بہ جاب چھوڑ نہیں دیتیں۔“ لمارو مطمئن کرنے کے لئے میں دانستہ طور پر دو

چار روز تک ہائی سے ذرا کھینچا کھینچا سا رولہ دے دیے پھر پاپا کا پرنس وائٹز آپ کرنے کے سلسلے

میں میری مصروفیات مجھے گھر پہ نکلنے بھی نہ دیتی تھیں، لیکن اس روز ناشے کی ٹیبل پہ اسے

جلدی میں آدھا سلاٹس لگتے اور دے جانے کا پک پک کر نکلنے دیکھتا توں میں کے بغیر نہ رہ سکا۔

”چھوڑ چکی ہوں۔“ اس کا مختصر جواب مجھ سے زیادہ لمارو کو حیران کر گیا، اسی لئے اگلا

سوال ان کی جانب سے آیا۔

”تو پھر ہر روز اسے گھٹنوں کے لئے کہاں غائب ہو جاتی ہو؟“

”نوبت کی جگہیں ہیں اس شہر میں مجھ جیسی عورتوں کے لئے، جہاں وہ دھکے کھاتی رہتی

ہیں۔“ وہ ہنسی سے بولی۔ ”حقائق نسوان کے وقار، دیکھوں کے گوکہ دھندے، عدالتوں کی

خواری.....“

”تو کس نے کہا تمہارا تنوں کے چکر میں پڑو۔ تم نے تو ہمیں اپنا ہوا سمجھنے سے ہی انکار

کر دیا ہے۔ مجھ سے کہتیں، اس بلال احمد اور اس کی اجڑاں کے وہ لئے تھی کہ اسلگہ دن ہی

جسمیں آنکھوں پہ بٹھا کے لے جاتے، لیکن تم نے تو صاف کہہ دیا کہ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے اور

اسے میں اس طرح پیٹے سے پینڈل کروں گی اور یہ ہے تمہارا طریقہ؟“ صغالی کی ایک کوشش

تک نہ کرنے دی تم نے۔“

”اسنے سالوں سے میں بھی کوشش تو کر رہی تھی آئی! لیکن میری بھی کد ہوتی ہے،

میں اس کے ساتھ ہر حال میں گزارا کرنے کو تیار تھی۔ اس کی معمولی غمخوار میں بھی راضی و

مطمئن تھی۔ خود محنت کر کے اس کا بوجھ بابت رہی تھی۔ اگر وہ بھی میری خوشی میں خوش رہنے

پہ تیار ہوتا، مجھے وہ عزت اور اعتماد دیتا جس کی میں مستحق تھی تو کبھی یہ نوبت نہ آتی۔“

”مگر سوال یہ ہے کہ تم سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اتنی گزارے لائق زندگی کیوں بسر

کرتیں۔ ٹھیک تو کہتا ہے وہ بے چارہ۔ بیوی کے نام کروڑوں کی پرمانی ہو اور پورا گھرانہ

ٹھیک دتی کے خلاف جنگ لڑتا ہو۔ ارے اس کے نام کرنے کا حوصلہ نہ ہوتا ٹھیک ہے خود کو

تو کوئی فیض پہنچاؤ۔ خود ہی کوئی بڑنس شروع کرلو۔“

”دو سارے مایہ یک امانت ہے آئی!“ وہ آہستگی سے کہتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”دماغ خراب ہے اس کا۔ امانت..... ہونہ۔“ لمارو بڑبا رہیں۔

☆=====☆

”سدا یہ میرا بہت پرانا خواب ہے۔“ اتفاقاً پرانے ہی میری تھپی۔ میں نے بہت پہلے

سے سوچ رکھا تھا کہ میں لمارو پاپا اور دادی کے نام سے ایک ٹرسٹ یا سچل بنادوں گی۔ میرے

اس خواب سے کوئی واقف نہ تھا۔ نہ دادی، نہ دم۔ نہ انکل..... ہاں، میں نے بلال کو ضرور

بتایا تھا۔ اپنی شادی سے بھی پہلے اور اس لئے بتایا تھا کہ میں سمجھتی تھی، اس سے زیادہ مجھے کوئی

نہیں جانتا اور کسی کو کبھی یہ خواب بتایا تو وہ مجھے اس راہ میں آنے والی مشکلات سے آگاہ کر کے

خوف زدہ کرنے کی کوشش کرے گا اور بلال نے وہی کیا جس کی میں اس سے توقع رکھتی تھی۔

اس نے میرا ساتھ دینے کا وعدہ کیا اور اب وہی وعدہ خلافی کر رہا ہے۔ وہ پہلے سے جانتا تھا

کہ میں اس ساری پرمانی سے دھمکانے خود پہ خرچ کرنے کی روادار نہیں، کیا کہ اس کے نام

کروں اور اسی کے بھائیوں، بہنوئیں سمیت سارے خاندان کو مالی طور پہ منہمک کرنے کے

لئے کاروبار سنبھال کر کے دوں۔ وہ مجھ پہ ہر طرح سے دباؤ ڈال رہا ہے، جبر کر رہا ہے اور

جانتے ہوئے کہ جبر وہ ادا کر لے جس کے ذریعے محبت کی فوری موت ہوئی ہے۔“

”تو تم نے اب کیا فیصلہ کر لیا ہے طبع لینے کا۔“ اور کچھ گزرتے دن ہمیں اس عجیب سے

آئے کہ میں نے اس سے اس معاملے پہ تفصیلی گفتگو کرنے کی بہت کر لی۔

”صرف فیصلہ، عمل بدل در آمد بھی۔ مجھے امید ہے کہ لگی ایک دو ہفتیوں تک فیصلہ

میرے حق میں بنادیا جائے گا۔“

”تمہیں دکھ نہیں ہوا؟“ میں نے کر دیا ناچا۔

”دکھ مجھے اس بات کا ہے کہ میں نے یہ قدم اٹھانے میں چار سال کی دیر کیوں کی۔“

کہ بلال نے اپنے چہرے سے تھاب اٹھانے میں صرف ایک سال لگایا تھا۔“







حاصل کرنا چاہئے سعد! اس نے مجھے چڑانے کی کوشش کی۔

”ایک بات بتاؤں بنی! میں نے اسے وارننگ دی۔“ جب بھی تم ایسے بات کرتی ہو، میرے اندر کی خمد اور تو انا ہو جاتی ہے۔“ اور یہ حقیقت تھی۔

”تم مان گئے کہ یہ خمد ہے..... کیوں اپنی خمد کے ہاتھوں.....“

”یہ محبت ہے بنی! اور ایک دن میں تمہیں یہ تسلیم کروا کے رہوں گا۔“

”چلو میں نے تسلیم کیا، اب تم بھی مان جاؤ کہ یہ اگر محبت ہے بھی تو ہمارا ساتھ اس محبت کی موت ہوگا۔ تم جتنی ہے قراوی مجھے پانے کے لئے دکھا رہے ہو، اتنی ہی بے زاری مجھ سے چھکارا بنانے کے لئے ظاہر کرو گے اور ایسا کر بھی نہ سکو گے، کیونکہ اس میں تمہاری ہی جگہ بننا ہی ہوگی۔ تمہارے بلند و بالا جگہوں کے پودے ہونے کی حقیقت کھل جائے گی۔“

”بنی! میں نے ایک بار پہلے ہی تمہیں بتایا تھا، شاید تمہیں یاد ہو کہ میں نے صرف تمہارے وجود سے محبت نہیں کی۔ میں نے تمہاری خوشبو سے بھی پیار کیا ہے اور خوشبو کی کوئی عمر نہیں ہوتی۔ وہ تو سدا جوان رہتی ہے، اس لئے میری محبت بھی ہمیشہ جوان اور نچر پور رہے گی۔“

”تمہارا مجھ سے محبت کا ہو جانا ایک حیرت انگیز واقعہ ہے، میری زندگی کا بھی اور تمہاری زندگی کا بھی۔ میں نے بھی ایسا سوچا نہ تھا، تمہارے ساتھ کھیلنے ہوئے، تمہیں پڑھاتے ہوئے، تمہیں بھلاتے ہوئے..... مگر یہ کرشمہ ہو گیا اور اب اگر میں تم سے شادی کر لیتی تو ہوں یہ ایک اور تجربہ ہوگا۔ تو یہاں اتنے غیر متوقع واقعات ہو سکتے ہیں تو یہ کیوں نہیں ہو سکتا کہ تم بدل جاؤ۔ سعد رضوان! ایک چیز تسلیم کرنا میرے لئے ناممکن ہے کہ تم بعد ہو کہ میں اسے تسلیم کر لوں پھر جسے ماننے سے تم انکاری ہو، میں اس پر قائم کیوں نہ رہوں۔ یہ ہو کے رہے گا سعد! کم از کم اس صورت میں تو ضرور ہوگا کہ میں تم سے شادی کرنے پر تیار ہو جاؤں۔ اس کے بعد محبت کا یہ نشہ کتنی جلدی ہرن ہوتا ہے، یہ تم ضرور دیکھو گے لیکن صرف اپنی اس ایک پیش گوئی کو کچا ثابت کرنے کی خاطر میں اتنا بڑا ریسک نہیں لے سکتی۔“

”تم سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو بنی! اور مطمئن ہو جاؤ۔“ اس کی مسلسل خمد اور انکار بھی مجھے مایوس نہ کر رہا تھا، نہ ہی میں اپنے اصرار کو ”باقی بچھڑا“ کہتا تھا۔ میں آج ہی اس معاملے کا حتمی انجام چاہتا تھا اور وہ بھی سن چاہا۔

”میں تمہارے سارے واسطے دھو ڈالوں گا، تم میرے ساتھ بہت مطمئن اور خوش رہو گی۔“

”یہی بات بلال احمد نے بھی کہی تھی اور پورے وثوق سے کہی تھی۔“ وہ ہنس پڑی۔

”تم میرا عقاب لاس کے ساتھ مت کرو۔“

”ہاں، یہ موازنہ تو ہو بھی نہیں سکتا۔ اس کی بات میں نے اس لئے مان لی تھی کہ میں اس سے محبت کرتی تھی۔ محبت کرنے والوں کو سارے وعدے آفاقی لگتے ہیں لیکن تم سے تو میں محبت بھی نہیں کرتی۔ کیسے اعتبار کر سکتی ہوں۔“

وہ کمرے سے نکل گئی اور میرے در تک مخا پڑے رہے کا ارادہ ادھر ادھر بکھر گیا۔

☆=====☆

”تم پاگل تو نہیں ہو گئے سعد! ماما میرے اس طرح فیصلہ سنا دینے پہ ہکا بکا رہ گئیں۔“

”میں بہت سوچ کچھ ہے بات کر رہا ہوں۔“

”تمہاری سوچنے کچھ کی تو ساری صلاحیتیں اس نے خفا کر رکھی ہیں۔ تم کل تک کیسے بڑھ چڑھ کے میری ہر بات جھٹلا رہے تھے کہ وہ ایسی نہیں، اس کا کوئی کردار نہیں میری اس حرکت کے پیچھے۔ وہ راضی ہے جب ہی تم شادی تک کا سوچ رہے ہو۔“

”نہیں، وہ راضی نہیں ہے اور اسی ڈر سے راضی نہیں ہو رہی کہ وہ آپ کو دکھ نہیں پہنچانا چاہتی، اسی لئے میں آپ سے درخواست کرنے آیا ہوں کہ پلیز ماما! آپ اپنے دو بے میں کچک پیدا کریں۔ آپ کو کہیں نہ کہیں میری شادی تو کرنا ہی ہے تو پھر ہالی کیوں نہیں؟ اس میں کیا برائی ہے؟ اگر آپ دل سے تیار ہو جائیں گی اور میرے بجائے آپ خود ہی سے شادی کی بات کریں گی تو وہ ضرور مان جائے گی۔“

”لو..... ایک اور چال..... تم بھی نہ جان پاؤ گے اس کی چالاکیاں۔ مجھے راضی کرنے کے لئے اس نے ایک اور بازی کھلی ہے۔ اس طرح تمہیں آگے کر دی ہے لیکن یہ کان کھول کے نہ لو، میں کی قسم کی اسوشل بلک سیلنگ میں نہیں آؤں گی۔ تم ابھی نادان ہو، اس کی چلن بازی بھانپ نہیں سکتے، میری سب کچھ ہی ہوں اور کبھی اس کے منصوبے پورے نہ ہونے دوں گی۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے، میری کر ڈوں کی جائیداد کا اکلوتا وارث۔ غریب صورت، صحت مند، ذہین، تعلیم یافتہ، ہر قسم کے عیب سے پاک۔ کیا ضرورت ہے مجھے جو اس سے اتنے سال بڑی، عام سی شکل، صورت کی طلاق یافتہ عورت کو بھونا کے لے آؤں۔“

”آئی.....“ بلی سی دیکھ کے ساتھ ہی اندر داخل ہوئی تو ماما چپ ضرور ہو گئیں مگر اپنے چہرے کے تاثرات سے برہمی کو دور کرنے کی زحمت گوارا نہ کی۔

”آئی! میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔“

ہاں..... شاید..... اسی شاید نے ایک بار پھر مجھے بے سکون کر دیا ہے۔ حالانکہ اس بار یہ ”شاید“ میرے حوالے سے نہیں بلکہ مٹی کے ذریعے سے میری زندگی میں شامل ہوا ہے، لیکن اس نے اپنا مخصوص اثر ڈالنے کی پوری پوری کوشش کی ہے۔

اس دن باہنی نے اپنا مطلع کا عقدہ واپس لینے اور دروازہ بالال احمد کے کمرہ جانے کا فیصلہ  
 بنا کر مجھے اس تکلیف دہ حقیقت سے روشناس کرایا تھا کہ میں کچھ بھی کر لوں، چاہے مجھ پر جان بھی  
 دے کر اسے اپنی محبت کا یقین دلاؤں، وہ میرا اعتبار نہیں کرے گی۔ اگر کمرہ بھی لے گی تو میرا  
 ساتھ نہیں دے گی۔ میرا ساتھ اس کے لئے اس حد تک ناقابل قبول ہے کہ وہ اس سے بچنے  
 کی خاطر دروازہ اس جہنم میں جانے کو تیار ہے۔

انتا تو میں بھی جانتا تھا کہ میری فطرت غایت نرم و احسان اور صلح ہے۔ جلد بدگمان اور مایوس ہو جانے والی نہیں پھر اگر وہ طلاق لینے کی حد تک مجبور ہوئی ہے تو ضرور اس کے اور ہلال کے (تعلقات اس سے کہیں زیادہ خراب صورت اختیار کر چکے ہوں گے جتنے کہ وہ بتاتی ہے۔ کون جانے اس کو کس کس اذیت سے گزر کر شعل کا خیال آیا ہو گا اور کتنا تباہی و فساد کرنے کے بعد وہ ماما کی مخالفت کے باوجود اس پر مضبوطی سے قائم تھی۔ اب اگر وہ اس فیصلے میں ترمیم کر رہی تھی تو اس کی وجہ صرف اور صرف میں تھا۔

وہ صرف مجھ سے بچنے کی خاطر یہ کہنا گوارا کر رہی ہے۔ وہ میرے پیڑھے قدموں کے آگے بند پائے ہونے کے لئے یہ تدبیر کر رہی ہے۔ کیا میں اتنا جھکی نہیں سمجھ سکتا؟

کیا میں اپنی بات منانے کی وطن میں اس قدر اہم سمجھاؤں کہ مجھے بھی نظر نہیں آتا کہ صرف جبری دیوانگی سے گھبرا کر وہ بھڑے خود کو بلال جیسے خود غرض اور لاپرواہی شخص کے حوالے کر رہی ہے۔

اور وہ اس کا خواب..... وہ ٹرسٹ اسٹیل بنانے کا پرانا خواب، جس کو پورا کرنے کے لئے اس نے بال سے اپنی محبت کو قربان کر دیا۔ اپنی زندگی کو داؤ پہ لگا دیا۔ کیا اب وہ اس خواب سے بھی دست بردار کی اختیار کرے گی۔

صرف میری وجہ سے۔  
کیا میں ایک بار پھر اس کی مشکلات میں اضافہ کرنے جا رہا ہوں۔

”میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں بالال احمد سے غلط لینے کا ارادہ ترک کروں۔ میں اس وقت اپنے وکیل کے پاس ہی جا رہی ہوں، تاکہ مقدمہ واپس لینے کی کارروائی کا آغاز ہو سکے۔ آپ بھی تو جی جانتی ہیں نا! آئی! کہ میرا گھر سارا ہے، میں نے سوچا کہ بڑوں کی بات مان لینے ہی میں بھلائی سمجھی ہوتی ہے۔“

اس نے دزدیدہ نظروں سے مجھے دیکھ کر جتایا، جب کہ میں فی الحال کچھ کہنے یا کوئی بھی رد عمل ظاہر کرنے کی پوزیشن میں نہ تھا، وہ مجھے بخند کر گئی تھی۔

”آپ خوش ہیں نا؟“ اچھے دماغ اور دیکھنے کا کام میں نئے سرے سے اپنی شادی شدہ زندگی کا آواز کر سکوں اور اسے خوش سلوٹی سے جہاں سکوں۔  
وہ ماما کے قریب آئی تو حیران حیران ہی ماما کچھ کہہ بھی نہ سکیں۔ فقط اس کا شانہ جھپٹتا کے رو گئیں۔

☆=====☆=====☆

اس وقت میں سن رائزر ہائیڈو نے جو پارک سے گزر رہا ہوں۔ یہاں کے سب سے مجھے اور پرنس جیمس شاہجگ مال J.C-Penny سے اپنی بی بی کی رانیہ کو شاپنگ کروانے کے بعد اب میرا رخ بروک لین کی جانب ہے، جہاں میرا نانا پائرنشٹ ہے۔ اس سے پہلے میں رجسٹرڈ ہوں ایک فرینڈ کے ساتھ فلٹ شیپر کرتا تھا لیکن شادی کے بعد ظاہر ہے کہ میں اسے وہاں نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہیں پاکستان میں ہی میں نے ایسے انتظامات کر لئے تھے کہ جب میں رانیہ کو لے کر وہاں آؤں تو ایک فرزند پائرنشٹ میرا اختر ہو۔ میرے ایک امیر کن دوست نے عین میری پسند کے مطابق یہ پائرنشٹ تیار کر رکھا تھا، لیکن ظاہر ہے کہ اپنی ضروریات کے مطابق ابھی ہم نے اس میں کئی اضافے کرنے تھے۔

اس وقت میں اور رانیہ ایسی ہی شایگ کر کے آرہے تھے۔ کچھ ضروری کراکری اور ڈیکوریشن کی چیزیں وغیرہ۔ آج اس کے ساتھ شایگ کرتے ہوئے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اپنے رچ بیک گاؤں اور اعلیٰ تعلیمی ریکارڈز کے باوجود ایک گریجویٹ حراج کی شرفی لڑکی ہے۔ اپنے گھر کے بارے میں اس کا ذوق اور حقوق دونوں قابل دید تھے۔

میں نے یہ سب سوچا اور دل کڑا کر کے ایک فیصلہ کر لی لیا۔ اتنا تو بچہ چل چکا تھا کہ وہ میرے لئے کھانا پینا پیدا کرنے کی کوشش تک کرنے سے تیار نہیں تو اگر تارسانی مقدر میں ہے تو کیوں نہ ہائی کی زندگی کو ہی کچھ پہل بنادیا جائے۔ اس سے غم تو مجھے یوں بھی رہتا ہے تو کیوں نہ اسے یہ یقین دلا دوں کہ میں اس کی محبت سے دست بردار تو عمر بھر نہیں ہو سکتا مگر اسے پانے کی خواہش کرنا ضرور ترک کر رہا ہوں تاکہ اگر وہ میرے خوف سے ہلال احمد سے کھجوتا کرنے سے تیار ہوئی ہے تو اس مجبوری کی زندگی بسر کرنے سے بچ جائے۔

”بہنی! ایسا مت کرو، تم اس کے ساتھ کبھی خوش نہیں رہ پاؤ گی۔ تم خود ہی تو کہتی ہو کہ تمہاری اس سے محبت فنا ہو چکی ہے۔“

”کبھی کبھی بغیر محبت کے بھی کسی کے ساتھ زندگی بسر کی جاسکتی ہے۔“

”کیا واقعی؟ تو پھر میں کیوں نہیں ہنی؟“ اس کے آگے اپنی ہار کا اعلان کرنے کا فیصلہ کرنے کے باوجود میں پھر اس انہونی کی تمنا کر بیٹھا۔

”مگر عزت کے بغیر کسی کے ساتھ زندگی تو کیا ایک لمحہ بھی نہیں گزارا جاسکتا۔“ اس نے یہ تمنا بھی واپس لوٹادی۔

”تمہارے ساتھ میں مجھے اپنے لئے رسوائیاں ہی رسوائیاں اور کھٹنیاں ہی کھٹنیاں نظر آتی ہیں۔“

”اور یہ جو سزا تم اپنے لئے منتخب کر رہی ہو، کیا یہ کسی بہت خوشگوار زندگی کی علامت ہے؟ کیوں اپنے ہاتھوں اپنی زندگی میں زہر گھولنا جاتی ہو ہائی! وہ تمہارا خواب، وہ مقصد..... کیا وہ سب بھول گئیں۔ نہیں ہنی! انہیں نہ دیکھی مگر مجھے تمہاری پرواہ ہے۔ تم بس مجھے روکنا چاہتی ہو نا، مجھے باز رکھنا چاہتی ہو۔ لو..... میں باز آیا تمہاری چاہ کرنے سے۔“

میری آواز کپکپاتی گئی۔ چند روز سال پرانی محبت..... جو میری جڑوں تک میں اتر چکی تھی۔ اس سے تائب ہونے کا اعلان، چاہے وہ جھوٹا ہی کیوں نہ ہو، آسان نہ تھا۔

”اب تو تم اپنا فیصلہ واپس لے لو۔“

”میرے فیصلے تمہارے وعدوں کی طرح ناپائیدار نہیں ہوتے سدا! آج تم یہ کہہ رہے ہو کہ مجھ کی ہر کسی ہمارا سامنا ہوگا۔ تمہیں پھر سے اپنی بات کے روکنے جانے کا طائل ضدی بنا دے گا اور تم پھر سے.....“

”ایسا نہیں ہوگا ہنی! ہر ایمانیں کرو، خدا کے لئے۔ کبھی تو..... میری کسی بات پر تو یقین کرو۔“ بس اس کے پیروں پر کڑکڑ گونگانے کی سرہانی رہ گئی تھی۔

”میں اس صورت میں اپنا فیصلہ واپس لوں گی اگر تم آٹنی کی بات مان لو اور ان کی پسند کی ہوئی کسی اچھی سی لڑکی سے شادی کر لو اور یہ وعدہ کرو کہ تم اس نئے رشتے کو پوری دیانت داری سے نبھاؤ گے۔“

اس نے بالآخر مجھ سے یہ شرط منوالی۔

میں اس کی زندگی سنوارنے کے لئے کچھ بھی ماننے سے تیار تھا۔ جانتا تھا کہ اگر آج وہ ہلال کے آگے ہار مان گئی تو باقی ساری عمر گھٹ کے گزارے گی، لیکن اگر وہ آزاد ہو گئی تو کم از کم اپنا خواب تو پورا کر سکے گی۔ اس کے دل میں کسی چیز کی تکمیل کا اطمینان تو جاگے گا اور پھر اس صورت میں آئندہ اس کی زندگی میں کسی خوش آئند تبدیلی کا امکان بھی باقی رہے گا۔

میں محبت تو کر چکا تھا۔ تب..... جب مجھے یہ بھی نہیں پتا تھا کہ محبت ہونی کیا ہے۔

اب وقت آیا تھا کہ میں اس محبت کو کھاتا..... اب..... جب کہ میں جان چکا ہوں کہ محبت ہونی کیا ہے۔ محبت اور کیا ہے سوائے اس احساس کے..... کہ یہ شخص جس سے ہمیں محبت کا دعویٰ ہے، اس کے لئے اچھا سوچنا، اچھے کی تمنا کرنا اور اچھا چاہنا..... اور جس حد تک بس میں ہو، اچھا کرنا۔ میں اس کی شرط مان کر شادی پہ تیار ہوا تھا کہ میں اس کے لئے ”اچھا“ کرنا چاہتا تھا۔

رانیہ پتا نہیں کب سے ماما کی نظروں میں تھی۔ دولت، خاندان اور مرتبہ میں وہ ہمارے ہم پلہ لوگ تھے۔ رانیہ کی ہر لحاظ سے ایک مکمل شخصیت رکھتی تھی۔ خوبصورت تھی، شائستہ بھی..... خوش ذوق بھی اور خوش گفتار بھی۔ بڑے تقاضوں سے مکمل ہم آہنگی رکھنے والا اس کا رواجی رکھ کھاؤ والا پورا خاندان اعلیٰ تعلیم پالتا تھا۔ اس لحاظ سے وہ بھی شاندار انڈیکس رکھاؤ رکھتی تھی یعنی کڑ پانت اور قابلیت اس کی اضافی خوبی تھی۔

پھر بھی اس کا ساتھ مجھے مطمئن نہ کر سکا تھا۔ میں اس کی خوبیاں اور حسن کا معترف ضرور تھا مگر امیر نہ ہو سکا۔ وہ مجھے صرف ایک ”محل“ نظر آتی تھی۔ ایسا محل جیسے اماں اور مہی دونوں نے میری دیوانگی کے سید باب کے لئے مشعر کھدو پر تجرہ بڑکایا ہو۔

کبھی میں بھی ان چیزوں کو دیوانگی ہی سمجھا کرتا تھا..... ان پہ ایمان لانے میں بہت وقت لگا مجھے۔ اب یہ چاہتے ہیں میں پھر سے اپنے اندر کی آواز کو جھلانا شروع کر دوں اور خود کو باور کراؤں کہ وہ سب ایک وہم تھا، ایک فنی جذبہ..... یہ محبت نہیں تھی۔ ہاں، شاید میں اسے محبت سمجھنے لگا تھا۔ زندگی تو یہ ہے، حقیقت تو یہ ہے..... لیکن کیا کروں، میں چاہ کر بھی خود کو یہ دھوکا نہیں دے سکتا۔

میں جان گیا ہوں کہ میں نے زندگی میں کوئی کام اپنی شدت اور مستقل مزاجی سے نہیں

کیا جتنا کرہی سے محبت..... اور شادی کے بعد واپس امریکہ جاتے ہوئے میں اسے ایک بار پھر یہ جتنا نہیں بھولا تھا۔  
وہ خلع لے چکی تھی..... حسب وعدہ۔

”تم نے مجھے بڑی ہوشیاری سے ٹریپ کیا ہے ابھی! عمر بھر تم نے کبھی کسی کے جذبات سے کیلئے کی کوشش نہیں کی پھر میرے ساتھ یہ ایسا کیوں؟ تم جانتی تھیں کہ تمہیں بالال احمد سے ملنے والی اذیتوں سے بچانے کے لئے میں سب کچھ کرگزروں گا، اس لئے تم نے..... خبر جو ہوا..... سو ہوا..... شاید یہ سب اسی طرح ہوتا تھا، لیکن اب تم مطمئن رہو، میں ہمیشہ کے لئے یہاں سے جا رہا ہوں۔ میری سب تک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ تم نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کرو، اپنے سارے خواہش کی تکمیل کرنا اور اپنے لئے ایک نیا گھر بھی تشکیل دینا۔ شاید تمہاری تکمیل اور اطمینان مجھے بھی کچھ سکون بخش دے۔“

میں چلا آیا، دل میں ایک گہرا..... کبھی نہ مٹنے والا طال لے۔ جو اس بات کا نہیں کہ میں اسے حاصل نہ کر سکا کیونکہ اسے نہ پانے میں بھی ایک مہر و خدیجی تھی کہ میں کم از کم اس کے لئے کچھ تو کر سکا۔ میرا پیچھے ہٹنا اس کو اس کے ارادے سے باز تو رکھ پایا، جس کے نتیجے میں اس نے بس دکھ ہی دکھ کیلئے تھے۔

یہ طال اس بات کا بھی نہیں تھا کہ آنچنی کے بجائے رانیہ میری ہم سفر تھی جس کی مجھے نہ چاہی تھی، نہ طلب۔ بلکہ رانیہ کو پتا نہ تھا کہ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں نے اپنی کی کوئی خواہش پوری کی ہو۔ جنہیں ٹوٹ کر چاہا جائے، ان کے لبوں سے نکلے خواہش پوری کرنے میں بھی ایک الگ مزہ ہے۔

پھر کیا ہے جو مجھے ملول کئے رکھتا ہے..... صرف اور صرف یہ احساس کہ میں اپنی محبت پانی سے تسلیم نہ کر سکا۔ وہ بچلے میرا ساتھ قبول نہ کرتی، اتنا تو کھدوتی۔

”ہاں سہر رضوان پیر زادہ! میں ایمان لائی تمہاری محبت کی صداقت پہ..... میں نے مانا کہ تم سے زیادہ شدت سے کوئی مجھے چاہی نہیں سکتا۔“

لیکن اس کے لئے تو میں اس قدر اُن چاہتا تھا کہ صرف اور صرف مجھ سے بچنے کی خاطر اس نے بالال احمد کی رفاقت تک منظور کر لینا چاہی تھی۔ وہ مجھ سے اتنی خائف تھی، اسے لگتا تھا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں۔ اس کا خیال تمام میری محبت جھاگ کی مانند ہے، اسے ڈر تھا کہ میں اسے چھوڑ دوں گا، بدل جاؤں گا۔ اس کے یہ سارے اندیشے مجھے اپنی محبت کے نام پہ گالی کی طرح پڑے محسوس ہوتے تھے۔ ان گالیوں کی گونج نے مجھے عمر بھر ایسی ہی ملول رکھنا تھا۔

”جھیک گاؤ! مجھے تو لگ رہا تھا کہ جیسے نہ جانے کتنے عرصے سے میں سفر میں ہوں۔ اتنا بڑا شہر ہے نئی یارک، کہ ایک ایریا سے دوسرے ایریا تک جانے میں لگتا ہے جیسے لاہور سے بائی روڈ اسلام آباد تک کا سفر کرائے ہوں۔“

رانیہ کی آواز مجھے خیالوں سے جھنجھلائی۔ میں اب اپنے سب ہی معلومات اسی بے دھیانی کے ساتھ کرنے کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔ پتا بھی نہ لگا اور کب میں میکا کی انداز میں اپنے اپارٹمنٹ کے آگے رک گیا تھا۔ میں نے گہری سانس بھری اور خیالات کی اس یلغار سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرتے ہوئے خود کو حال میں کھینچا۔ رانیہ اندر جا چکی تھی۔ میں پچھلی سیٹ سے اورو کی میں سے شاہجہان بگڑنے لگا۔

”سعد! آپ کے لئے لیو آیا ہے پاکستان سے۔ شاید اما کا ہے۔“ میرے اندر جانے پر اس نے ایک لغزناٹا پلٹ کر دیکھتے ہوئے بتایا جس پر بیچے والے کا نام نہ لکھا تھا۔  
”اما؟ اگر ایسا ہے تو میرے نام اما کا پہلا خط ہوگا۔“

میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور اس کے ہاتھ سے لے کر جیسے ہی رائٹنگ کو پہچانا میری مسکراہٹ ختم ہوئی۔ وہ نہ ہانی کی تحریر تھی۔

”رانیہ! میں ریسٹ کرنا چاہتا ہوں۔ اسٹڈی میں ہوں۔ ایک کپ کافی بھجوا دینا اور کچھ دیر کے لئے مجھے باہر لا ڈرپ مت کرنا۔“

میرے اسٹڈی میں جا کر لائش وغیرہ اُن کرنے اور بیٹھنے تک رانیہ بھرتی سے میری من پسند کافی بنالائی۔ اس نے مسکرا کر کپ ٹیبل پر رکھا اور بتا مجھے قلمب کئے خاموشی سے باہر چلی گئی۔ میں اسے لا ڈرپ نہ کرنے کا کہا تھا اور وہ ٹیلیفون کی سوال سے صرف اس پر عمل کر رہی تھی۔ میں ایک بار پھر اما کا مسکروں ہوا، جنہوں نے میرے لئے رانیہ جیسی کچھ دار شریک حیات کا انتخاب کیا تھا۔

گرم کافی کے سبب لیپے ہوئے میں نے غصہ کھولا۔

”سہر رضوان!“

ایک بار پھر میں حیران ہوں کہ تمہیں کن الفاظ میں مخاطب کروں، تم سے کیا کہوں؟

تم ہمیشہ سے مجھے حیران ہی کرتے آئے ہو۔ کبھی خوش گوار انداز میں..... کبھی ناخوشگوار طریقے سے..... اور میں ہمیشہ تمہیں ماہوس کرتی آئی ہوں مگر کیا کروں، میں نے کبھی بھی جان بوجہ کر تمہاری دل کھنی نہیں کی۔

جب بہت پہلے تم نے اپنے دل کا حال مجھے سنا چاہا تب، میرا وہ رد عمل فطری تھا۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا، وہ یہی کرتا۔ میں نے ابھی تمہیں بڑا تصور بھی نہیں کیا تھا کہ تم نے اتنی بڑی بات کہہ دی۔

دوسری بار جب تم نے یہ بات کی، تب میں بلال احمد کی محبت میں سرشار تھی۔ میں تمہیں قبول کیسے کرتی، تمہارے جذبوں کی پذیرائی کیسے کر پاتی۔ الٹا تمہارے جارحانہ عمل نے مجھے بھی بھڑکا دیا اور میں تم سے سخت ترین رویہ اپنا بیٹھی۔

اور پانچ سال بعد تم جس ہانی سے ملے، وہ ایک ٹوٹی ہوئی، ہاری ہوئی عورت تھی جو خود پہ سے اعتماد کھو چکی تھی، کسی دوسرے پہ کیا کرتی۔

میں اپنی محبت کا سوگ منا رہی تھی۔ ایک اور محبت کا استقبال کیسے کرتی۔

ہاں، مجھے یہ اعتراف ضرور ہے کہ اس بار تم نے جو کہا، میں اسے ایک نو عمر کم سن لڑکے کی بات سمجھ کے نظر انداز نہ کر سکی۔ مجھے یقین آ گیا تھا کہ تم ٹھیک کہتے ہو۔

محبت کا کیا بھروسا، کبھی بھی، کسی سے بھی ہو سکتی ہے، لیکن سعد! جی یہی ہے کہ محبت کا کیا بھروسا، کبھی بھی..... کہیں بھی نظریں بدل سکتی ہیں۔ مجھے تمہارے جذبوں کی سچائی پہ شبہ نہیں مگر اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں تھی کہ یہ جذبے ہمیشہ برقرار رہتے۔ محبت تو میں نے بھی پوری سچائی اور شدت کے ساتھ کی تھی لیکن آج میرے دل میں بلال احمد کے لئے نفرت اور بے زاری کے سوا کچھ نہیں۔ میں اس وقت سے ڈرتی تھی جب تم بھی مجھے ٹھکرا دو گے۔ اب کم از کم یہ اطمینان تو ہے کہ دنیا میں کہیں ایک شخص ایسا ہے جس کے دل میں میری محبت ہمیشہ رہے گی۔

تم سوچو گے میں نے خود غرضی سے کام لیا ہے، بے معنی وہم پال کر تم پہ شک کیا ہے لیکن سوچو سعد! ایسا ہو بھی تو سکتا ہے۔ شاید تم مجھ سے جتنی محبت کرتے ہو، اتنی ہی نفرت کرنے لگتے۔

شاید تمہیں میری خوشبو تو کیا، سائے سے بھی الجھن محسوس ہونے لگتی۔

- شاید تم جلد ہی مجھ سے اکتا جاتے۔"